خطبات ومقالات

تحریکِ آزادی کے تناظر میں تحریر کیے جانے والے
سیاسی، اقتصادی، دستوری وتاریخی مقالات

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

ترتیب وتقدیم
مفتی عبد الخالق آزاد

تحریک آزادی کے تناظر میں تحریر کیے جانے والے
سیاسی، اقتصادی، دستوری و تاریخی مقالات

خطبات و مقالات

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

ترتیب و تقدیم
مفتی عبدالخالق آزاد

دار التحقیق و الاشاعت
فسٹ فلور کمرہ نمبر 13۔ کوئینز سینٹر شارع فاطمہ جناح لاہور۔

نام کتاب ......☆☆...... خطبات ومقالات، امام عبید اللہ سندھیؒ

ترتیب وتقدیم......☆☆...... مفتی عبدالخالق آزاد

اشاعت ......☆☆...... ستمبر 2002

ناشر ......☆☆...... دارالتحقیق والاشاعت فسٹ فلور کمرہ نمبر 13
کوئینز سینٹر شارع فاطمہ جناح، لاہور۔

اہتمام ......☆☆...... عبید اللہ راؤ (0320-4615631)

پرنٹرز ......☆☆...... حاجی حنیف اینڈ سنز لاہور۔

قیمت ......☆☆...... 240 روپے

انتساب

قطب الارشاد حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ

کے نام

جن کی بلند باطنی قوت و ہمت اور سیاسی شعور و آگہی نے

بڑے بلند ہمت رجال کار تیار کیے

اور

شریعت' طریقت اور سیاست کی جامعیت

کو اگلی نسل تک منتقل کیا

مرتب

عبدالخالق آزاد

فہرست مضامین

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی شخصیت کا خاکہ

درمیانہ قد' گول چہرہ' متوازن نقش ونگار' ذھانت کی آئینہ دار موٹی موٹی چمک دار آنکھیں' گورا رنگ' سفید داڑھی چہرے کے رنگ کے عین مطابق' ننگا سر بالوں سے بے نیاز' سفید کھدر کا لمبا کرتہ' سفید کھدر کی شلوار زیب تن' جاذب قلب ونظر شخصیت کے مالک اور بڑے متحرک' اسلوب کلام پر اعتماد اور شان جلالی ہر لفظ میں نمایاں''

(نقوش عظمت رفتہ)

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ
حالات زندگی ایک نظر میں

ولادت	10 مارچ 1872ء
اظہار اسلام	15 اگست 1887ء
حافظ محمد صدیق صاحب بھر چونڈی والوں سے بیعت	1887ء
دارالعلوم دیوبند میں داخلہ	اکتوبر 1888ء
مدرسہ کانپور اور مدرسہ عالیہ، رام پور میں	عرصہ سات ماہ
مولانا رشید احمد گنگوہیؒ صاحب اور مولانا شیخ الہندؒ صاحب سے تلمذ	1890ء
معاودت سندھ	فروری 1891ء
مولانا تاج محمود صاحبؒ امروٹ ضلع سکھر کی خدمت میں	آخر 1897ء
گوٹھ پیر جھنڈا (ضلع حیدرآباد) میں مدرسہ دارالرشاد کا قیام	1901ء
دیوبند میں واپسی اور جمعیت الانصار کی تاسیس	1909ء
نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کی بنیاد	جنوری 1913ء
ہجرت افغانستان	اگست 1915ء
کابل میں آمد	اکتوبر 1915ء
روس کو روانگی	22 اکتوبر 1922ء
ماسکو میں قیام	10 نومبر 1922ء تا 23 جولائی 1923
ترکی کو روانگی	انقرہ میں چار پانچ ماہ
استنبول میں قیام	اواخر 1923ء تا جون 1926ء
مکہ معظمہ میں آمد	اگست 1926ء
مراجعت ہندوستان	7 مارچ 1939ء
رحلت	22 اگست 1944ء

مقدمہ

از:۔ مفتی عبدالخالق آزاد

زندہ قوموں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنی قومی اور ملّی تاریخ کا درست تناظر میں تحلیل و تجزیہ کرتی ہیں۔ اور حقائق و واقعات کے ضمن میں تاریخی تسلسل کو سمجھتے ہوئے، اپنے فلسفہ تاریخ کا تعین کرتی ہیں۔ اور یوں انہیں صحیح نتائج تک پہنچ کر اپنے قومی اور ملّی تقاضوں کے جانچنے کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے قوموں کی زندگی میں تاریخی تسلسل اور کردار کی بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے، تاریخ کے درست اور جامع تجزیہ سے صحیح فیصلہ کرنے کا موقع ملتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم نے تاریخ کے ایک مخصوص دور میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔

اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ہماری ملی اور قومی تاریخ کا ایک اہم ترین دور گزشتہ دواڑھائی سو سال کا ہے، جس دور میں برصغیر پاک و ہند کے عظیم خطہ پر ایک غیر ملکی سامراجی حکومت کا غلبہ اور تسلط رہا ہے۔ اس عرصہ میں سے گزشتہ صدی کے نصف اوّل (ابتدائی پچاس سال) کا دور زیادہ ہنگامہ خیز گزرا ہے، کہ ہماری موجودہ صورت گری میں اس دور کا خاصہ عمل دخل رہا ہے۔ اس لئے اس دور کے سیاسی، اقتصادی اور فکری عوامل کا درست تناظر میں تجزیہ کرنا، اور صحیح نتائج تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ خاص طور پر برصغیر

کے موجودہ پریشان کن حالات اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ ہم ماضی قریب کی تاریخ کے تمام قومی وملی کرداروں کے فکر وعمل کا جائزہ لیں اور موجودہ سماجی ژولیدگی، سیاسی عدم استحکام اور اقتصادی افلاس کی جڑیں تلاش کریں۔اس لئے کہ معاشروں کے بناؤ اور بگاڑ میں ایسے قومی اور ملی فیصلے بنیادی کردار ادا کرتے ہیں جن پر کسی سماجی تشکیل کا مدار ہوتا ہے۔

ماضی قریب کے اس دور میں ہمارے قومی لیڈروں نے اپنے اپنے تعلیمی، نفسیاتی اور سیاسی پس منظر میں رہتے ہوئے اپنا کردار ادا کیا،اُن قومی اور ملی راہنماؤں میں حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن اسیرِ مالٹاؒ کا بڑا اُونچا مرتبہ اور اہم کردار ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ دراصل اس آزادی پسند جماعت کے سرخیل ہیں، جنہوں نے انگریز سامراج کی غلامی کو ایک دن کے لئے بھی قبول نہیں کیا ۔اور غیر ملکی تسلط کے خلاف ولی اللّٰھی علماء ربانیین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تحریک آزادی میں بڑا اہم کردار ادا کیا انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نظریہ ''فک کل نظام'' (تمام ظالمانہ نظاموں کو توڑ)' حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فتوی دار الحرب (کہ ہندوستان غلام ہو چکا، یہاں کے ہر انسان پر ظالم طاقت کے خلاف لڑائی فرض ہوگئی ہے) حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے معرکہ جہاد وحریت، اور ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت کے عظیم راہنماؤں سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے معرکہ جہادِ شاملی کے تاریخی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے جدوجہد آزادی کے نئے باب رقم کئے ہیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیرِ مالٹا اور قطب عالم حضرت اقدس شاہ عبدالرحیمؒ رائے پوری گزشتہ صدی کے ابتدائی عشروں کے وہ عظیم جامع صفات راہنمایان ملک وملت میں سے ہیں جنہوں نے پوری دلسوزی کے ساتھ ملک وقوم کو انگریز کے ظالمانہ

نظام سے نجات دلانے ، اور دین اسلام کی تعلیمات کو غالب کرنے کی انتھک جدوجہد کی ہے۔ ''جمعیتُ الانصار'' ہو یا ''تحریک ریشمی رومال'' ایسی عظیم جدوجہد ان کے پیچھے ان ہی حضرات کی قلبی، عقلی اور نفسی قوتوں کا عمل دخل رہا ہے۔ ان کے فعال اور جاندار قومی کردار نے جدوجہد آزادی کو ایک نیا رخ عطا کیا ہے۔

رولٹ ایکٹ کے نفاذ سے تحریک آزادی میں تیز رفتاری کا عنصر غالب ہوا ہے اور تحریک خلافت سے آزادی کی جدوجہد کو نئی مھمیز ملی ہے۔ ایکٹ کے نفاذ کے خلاف ہونے والے منظّم ردِّعمل نے آزادی کی منزل کو قریب کیا ہے۔ اور رولٹ ایکٹ کی تشکیل کے پس منظر میں ان حضرات کی جدوجہد صاف طور پر نظر آتی ہے کہ ''رولٹ کمیشن'' دراصل تحریک ریشمی رومال ایسی تحریکات کے منصۂ شہود پر آنے کے بعد ہی برطانوی حکمرانوں نے قائم کیا تھا۔

امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی ؒ اسی جماعت شیخ الہند کے ایک عظیم فرد ہیں جنہوں نے اس دور میں بڑا فعال کردار ادا کیا ہے۔ ۱۸۹۷ء سے لیکر اپنی وفات ۱۹۴۴ء تک آپ کی زندگی کا وہ اہم ترین پچاس سالہ دور ہے، جس میں اگر ایک طرف آپ نے سندھ کی سیاسی طاقتوں کو قومی نقطہ نگاہ سے منظم کیا، تو دوسری طرف دیوبند کے تیار کردہ بکھرے ہوئے موتیوں کو ''جمعیتُ الانصار'' کی شکل میں جہاد آزادی کے لئے تیار کیا۔ اسی طرح اگر آپ نے ایک جانب ''نظارۃُ المعارف القرآنیہ'' کے عنوان کے تحت مسلمانوں کے دو اہم مراکز دیوبند و علی گڑھ کے فضلاء کو منظم کیا، تو دوسرے مرحلہ میں کابل کے مرکز میں شیخ الہندؒ کے بکھرے ہوئے کارکنوں کی سیاسی شیرازہ بندی کرتے ہوئے ۱۹۲۰ء میں انگریز سامراج سے افغانستان کی آزادی تسلیم کروائی ، اور مستقبل میں ہندوستان کی آزادی کا برطانیہ سے وعدہ لیا۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ ، جماعت شیخ الہندؒ کے ان عظیم راہنماؤں میں سے ایک ہیں، جنہوں نے گزشتہ صدی کے دو عشروں میں حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت عالی رائے پوری کی زیرِ نگرانی بڑی جانفشانی اور جرات و ہمت سے کام کیا، اور جہاں آزادی کی منزل کو قریب کرنے میں مجاھدانہ کردار ادا کیا، وہاں اپنے نابغۂ روزگار قلب و عقل سے کام لے کر ہندوستان کے واقعی اور حقیقی سیاسی، اقتصادی اور فکری مسائل کا تعین کیا، اور ان کی پیچیدگی اور ژولیدگی کے اسباب و علل کا کھوج لگایا، اور اس کے حل کے لئے دینی نقطۂ نگاہ سے سیاسی، اقتصادی اور سماجی تشکیل جدید کا جامع نظریۂ فکر و عمل پیش کیا۔

اس سارے غور و فکر اور تدبر و بصیرت کے پیچھے جن بنیادی عناصر نے حضرت سندھیؒ کی کاوشوں کو ایک مربوط رخ دیا، وہ بقول ان کے تین ہیں:۔

(1)۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دھلوی کا فکر و فلسفہ:۔

حضرت شاہ ولی اللہ دھلوی کا فکر و فلسفہ وہ جامع نظریہ ہے کہ جس میں طبیعات کے ابتدائی عناصر سے لے کر انسانی سماج کی تشکیل اور اس کے چار ارتفاقاتی دائروں کی صورت گری تک، اور پھر انسان کی نفسی قوتوں اور ان کے چار بنیادی اخلاق سے لے کر ماوراء طبیعات کے مقدس مقامات تک کائنات میں موجود تمام اشیاء کے حقائق، خواص، افعال اور احکام کو ایک مربوط نظام فکر و فلسفہ میں مرتب کر دیا گیا ہے۔ اور پھر یہ سب کچھ قرآن حکیم کے گہرے مطالعہ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت صحیحہ کے جامع اسرار و رموز، اور جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کامل اسوۂ حسنہ کا بہترین نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد تک آنے والے تمام مجددین، مجتھدین اُمت، علمائے ربانیین، اور عادل سلاطین کے طرز فکر و عمل کا لب لباب ہے۔ مولانا سندھیؒ نے اسے اپنی

فکر و عقل کا مرکزہ بنایا۔

(2) دارالعلوم دیوبند کی تعلیم و تربیت:

درالعلوم دیوبند کی تعلیم و تربیت ایک ایسے دینی فکر کا تسلسل ہے کہ جو حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے جانشین راھنمایان قوم کے فکر و عمل کا جوھر اور خلاصہ ہے۔ اور جس میں دین اسلام کا قانونی نظام یعنی (شریعت)' انسانی نفس' قلب' اور عقل و روح کی تہذیب و تربیت باطنی یعنی (طریقت) اور دین اسلام کے غلبہ کے لیے ظلم کی سیاست و معیشت کو ختم کرنے اور عادلانہ سیاسی اور معاشی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا سندھیؒ نے اسے اپنی قلبی قوتوں کا منبع بنایا۔

(3) یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ کا گہرا مطالعہ:

ایک ایسے دور کا مطالعہ جس میں یورپ نے ڈارک ایج سے گزر کر اب تک جو سیاسی' اقتصادی اور فکری منزل حاصل کی ہے۔ مذہب کو رد کر کے یورپ نے فلسفہ و فکر کے میدان میں کس ژولیدہ فکری کا مظاہرہ کیا؟ اور لبرل ازم سے شروع ہونے والا سیاسی سفر جمہوریت کے کن دائروں تک پہنچا؟ نیز مکینکل ازم سے شروع ہونے والا اقتصادی سفر کیپٹل ازم سے گزرتے ہوئے سوشلزم کے نام سے سماجی فلاح کے کن دائروں تک آیا؟ مولانا سندھیؒ نے اس کا بھرپور تجزیہ کیا اور اس تحلیل نفسی کا گہرا مطالعہ کیا۔

مولانا سندھیؒ نے یورپ کے اس سیاسی' اقتصادی اور فکری سفر کا تجزیہ کر کے اس بات کا تعین کیا کہ اس سارے سفر میں اس نے کہاں اور کن مراحل میں ٹھوکر کھائی ہے۔ اور ژولیدگی کا شکار ہوا ہے۔ اور اس جدوجہد کے دوران کونسے مفید اجزاء انسانیت کی خدمت کے حوالے سے سامنے آئے ہیں۔ سیاسی اور اقتصادی حوالے سے جو مفید اجزاء ہیں' اور

انسانی سماج کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں' وہ انتہائی ضروری اور انسانیت کی مشترک میراث ہیں' ان سے استفادہ کیا جانا چاہیئے ۔اور اس سفر کے دوران جن مراحل اور مقامات میں یورپ نے انسانیت پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے ہیں' سرمایہ پرستی کی لعنت نے جس طرح انسانیت کا وجود فناء کیا ہے۔اور فکر و فلسفہ کے میدان میں قطعاً غلط راہوں پر چل کر انسانیت کے لیے رجعت قہقری کا باعث بنا ہے۔اسے رد کیا جانا ضروری ہے۔اور نہیں تو اس خطہ کی اقوام کو اس لعنت سے بچانے کی جدوجہد کرنا اور اس کی جگہ اس دھرتی پر موجود دین اسلام کی ایک ہزار سالہ تاریخ سیاست و معیشت اور فلسفہ و فکر کے شارح اور جامع حضرت الامام شاہ ولی اللہ دھلوی کے فکری تسلسل کو قائم رکھنا' اس دور کا اہم ترین تقاضہ ہے۔

اس لیے کہ ہر خطہ' علاقہ اور دھرتی سے پھوٹنے والے فکر و عمل' سیاسی تسلسل انصاف پر مبنی روایات' اور سچے مذہب کی اساس پر ہی کسی خطہ کی سیاسی' اقتصادی اور فکری تشکیل ہوا کرتی ہے۔ یہ اس خطہ کے عوام کا بنیادی حق ہوتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے انسانوں کا حق ہے کہ وہ اپنی دھرتی سے پھوٹنے والے فلسفہ ولی اللھی کو اساس بنا کر اپنی تشکیل جدید کریں۔ کیونکہ دین اسلام کے سچے فکر و عمل کے زیر سایہ ہندوستان نے اپنی ترقی کے تقریباً ہزار سال مکمل کیئے ہیں۔اور شاہ ولی اللہ کا فکر و عمل اس ہزار سالہ دور کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

اس خطہ کے لوگ اپنے بنیادی فکری ورثہ یعنی دین اسلام کی تعلیمات کو مضبوطی سے تھام کر آگے بڑھیں اور پوری جرات و ہمت سے کام لے کر یورپ کے مفید علوم' درست تجربات اور سائنس و ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے اس میں مہارت حاصل کریں۔اور اس خطہ کی تعمیر نو' اور سماجی تشکیل جدید کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔

لیکن یہ سب کچھ تبھی ممکن ہے کہ جب تعلیمی صلاحیت' سیاسی شعور اور اقتصادی

مسائل کی صحیح آ گہی کو مسلسل محنت وجدوجہد سے حاصل کیا جائے۔اور عدم تشدد کے اصول پر کام کرتے ہوئے مسلسل صبر، جرات وہمت اور محنت سے اپنے اہداف کے حصول کی کوشش کی جائے۔

گویا برصغیر پاک وہند میں انگریز سامراج کے قائم کردہ ظالمانہ نظام کے خلاف انقلابی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے جدوجہد کی جائے۔اور اپنے اندر سے غلامی کے جمود کو توڑتے ہوئے تحریک انقلاب کی آبیاری کی جائے، یہی وہ پیغام انقلاب ہے، جو مولانا سندھیؒ کی تعلیمات کا بنیادی جوہر ہے۔

مولانا سندھیؒ نے اپنی زندگی کے تقریباً تمام مراحل میں حاصل کردہ تجربات اور غوروفکر کے نتائج کو کسی نہ کسی صورت تحریر کیا ہے۔ چنانچہ کہیں آپ برصغیر کی قوموں کی تعمیر نو کے ابتدائی مرحلہ میں دستوری اور آئینی دفعات کی صورت میں اپنے نتائج فکر کو مرتب کر دیتے ہیں، تو کہیں سیاسی جماعتوں اور کانفرنسوں میں خطبات صدارت کی صورت میں اپنے مربوط خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح کبھی تاریخی تحقیق وتجزیہ پر مشتمل مقالات کی صورت میں خطہ کا فلسفہ تاریخ متعین کرتے ہیں، تو کبھی معرکۃ الآراء خطاب کی صورت میں اپنا پیغام انقلاب دیتے نظر آتے ہیں۔

زیرنظر کتاب حضرت سندھیؒ کی انہی تحریرات کا مجموعہ ہے۔ جس میں اب تک دستیاب ہونے والے آپ کے خطبات بھی شامل ہیں، اور مقالات بھی، معرکۃ الآراء خطاب بھی اور آئینی دفعات پر مشتمل دستوری خاکے بھی، اور جماعتوں کے اغراض ومقاصد بھی، اس مجموعہ کا حصہ ہیں۔

غرض کہ یہ کتاب حضرت سندھیؒ اور جماعت شیخ الہندؒ کے افکار وخیالات کا ایک بہترین مرقع ہے۔ یہ کل (۲۴) مقالات ہیں، جنہیں ہم نے سالوں کی ترتیب سے مرتب

کیا ہے۔ گویا دستیاب تحریرات میں سے جو تحریر پہلے لکھی گئی' اسے پہلے رکھا گیا ہے۔ اور جو بعد کی ہے۔ اسے بعد میں جگہ دی گئی ہے۔ اس سے ایک تو آپ کے افکار کا تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا کہ آپ کے افکار کی تشکیل میں ولی اللّٰھی نظریہ ابتداء سے ہی جلوہ گر رہا ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ نشو ونما کرتا' اور ترقی کے مراحل طے کرتا جاتا ہے۔ دوسرے ہر ایک مفکر اور سوچنے والے راہنماء کی طرح آپ کے افکار و خیالات میں ترقی کے ساتھ ساتھ جامعیت' پختگی اور نکھار سامنے آتا جاتا ہے نیز فروعات میں تنوع' اور اصول میں جامعیت کا اظہار سامنے آتا ہے۔

اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو مولانا سندھیؒ کی زندگی ایک ایسی کھلی کتاب ہے' جس میں اس دور کی قومی' ملی تاریخ کے اہم ترین ورق شامل ہیں۔ آپ نے نہ صرف عملاً اس دور کی سیاست میں حصہ لیا' بلکہ عمر کے آخری حصہ میں اپنے افکار اور اعمال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ بھی کیا۔ اور جو چیز نوشتۂ دیوار کی طرح ایک حقیقت ثابتہ رکھتی تھی' اسے ملک وقوم کے سامنے کھلے طور پر پیش بھی کیا۔ عملی طور پر سیاسی زندگی گزارنے والے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے اور ملکی اور قومی مفاد میں درست فیصلوں تک پہنچنے کا موقع ملتا ہے۔

مولانا سندھیؒ ان عظیم سیاسی مفکرین میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے سماجی تہذیب وتشکیل کے لیے مربوط فلسفہ سیاست و معیشت پیش کیا ہے۔ ایسا فلسفہ جس کی اساس انسانیت کی خدمت پر ہے۔ انسانیت کے بنیادی تقاضوں کی تکمیل آپ کے فلسفہ سیاست و معیشت کی بنیادی کلید ہے۔

برصغیر پاک وہند کے متنوع معروضی حقائق کو سامنے رکھ کر سیاست اور معیشت کے عملی تقاضوں کی تکمیل کرنا' اور اس کے لیے ایک مربوط فلاسفی کا تعین کرنا' ایک ایسی ضرورت ہے' جسے اس خطہ کا کوئی مفکر اور سیاستدان نظرانداز نہیں کرسکتا ہے' اور مولانا سندھیؒ نے یہ ضرورت بڑی خوبصورتی سے پوری کی ہے اس حوالے سے آپ نے محض تمناؤں' آرزؤں اور خواہشات کی بنیاد پر اپنا فلسفہء فکروعمل مرتب نہیں کیا' بلکہ ٹھوس زمینی حقائق کو سامنے رکھا اور اس خطے میں پیدا ہونے والی سماجی مشکلات' جن سے یہاں کی عملی سیاست کو قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے' کا حل پیش کرتے ہوئے ایک مربوط نظام فکروعمل مرتب کیا ہے۔

حضرت مولانا سندھیؒ کی یہ تحریرات قومی وملی تاریخ کا ایک اہم ترین حصہ ہیں۔انھیں قلمبند ہوئے تقریباً پچاس ساٹھ سال کا عرصہ ہو چکا ہے' اس کے باوجود تاریخی حقائق کا یہ صاف وشفاف آئینہ ہمیں ہماری سماجی تشکیل کا اصلی روپ دکھارہا ہے۔اس میں ہمیں اپنا آپ کیسا نظر آرہا ہے۔ہمیں اس آئینہ میں ضرور جھانک کر دیکھ لینا چاہیے۔

گزشتہ پچاس پچپن سالوں سے غالباً ہمیں تاریخ کے یکطرفہ مطالعہ کی عادت ہوگئی ہے۔اور ہم نے قریباً پچاس سال پہلے جو فیصلے کیے تھے۔انہیں خواہی نخواہی درست کہنے کا وطیرہ اپنا لیا ہے۔اس طویل سفر کے بعد بھی اگر ہم منزل پر نہیں پہنچے' اور ابھی تک نظریاتی' سیاسی' اقتصادی طور پر سرگرداں اور پریشان حالت میں پھر رہے ہیں تو شرمندگی چھپانے کی' بجائے' جرات وہمت سے کام سے لے کر ہمیں ماضی قریب کی اس تاریخ کا جائزہ لینا چاہیے۔اور یہ جاننے کی کوشش کرنا چاہیئے کہ ساٹھ ستر سال پہلے قومی تعمیر وتشکیل کے لیے جو ایک مربوط نظام فکروعمل پیش کیا گیا تھا اس کی سچائی ظاہر ہونے کا وقت کہیں

قریب تو نہیں آ گیا ہے۔شاید اسی طرح ہمیں سچے مجاہدین آزادی کی جدوجہد اور قربانیوں کو سمجھنے کا موقع ملے۔اور ان کے فکر وعمل سے ہم کوئی راہنمائی لے سکیں، کم از کم آئندہ غلطیوں کو دہرانے سے باز رہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں مولانا سندھیؒ کی ان تحریرات کو درست تناظر میں سمجھنے کی توفیق نصیب فرمائے۔اور آئندہ قومی سطح کی غلطیوں سے محفوظ فرمائے۔آمین۔

عبدالخالق آزاد۔لاہور

۱۱ستمبر ۲۰۰۲ء

قطب الارشاد حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کی نظر میں

امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی شخصیت

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوریؒ نے قطب الارشاد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کے ارشادات وملفوظات قلمبند فرمائے ہیں، جنہیں مولانا عبداللہ صاحب آف بھکر نے ''ارشادات'' حضرت رائے پوری کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس میں حضرت سندھیؒ کے بارے میں حضرت رائے پوریؒ نے انتہائی وقیع رائے گرامی کا اظہار فرمایا ہے۔

چنانچہ ۷ رمضان المبارک 1365ھ/5 اگست 1946ء رائے پور میں ایک مجلس میں ارشاد فرمایا:۔

''میں نے حضرت شیخ الھندؒ کی زبانی خود سنا ہے، وہ ہمارے حضرت (شاہ عبدالرحیم رائے پوری) کے سامنے بیان فرمارہے تھے کہ ''حضرت! مولانا انور شاہ صاحب اور مولانا عبید اللہ (سندھی) صاحب دونوں کی بڑی استعداد ہے، حضرت! مولوی عبید اللہ دھلی جارہے ہیں۔ میں نے ان کو کہہ دیا ہے کہ وہاں کوئی ایسی (گہری) بات نہ کرنا، جس کو عام طور پر لوگ نہ سمجھ سکیں اور شور ہو، کیونکہ تمہاری باتوں کو میں ہی سمجھتا ہوں اور کوئی یہاں نہیں سمجھتا اور مولوی کفایت اللہ صاحب بھی مستعد ہیں''

(ارشادات حضرت رائے پوری صفحہ نمبر (26)

10 رمضان المبارک 1365ھ/8/اگست 1946ء رائے پور میں ایک مجلس میں حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا:۔

"میں نے حضرت شیخ الھند ؒ سے مولانا عبید اللہ سندھی ؒ کی تعریف سُنی ہے۔ کہ وہ بہت مستعد ہیں، اور ان کی بہت ہی تعریف فرماتے تھے، تو اب میرے خیال میں یہ ہے کہ مولانا سندھی ؒ کی بات سمجھنی دشوار ضرور تھی، مگر بات صحیح کہتے تھے، البتہ زبان ایسی بولتے تھے، جس سے لوگ بدکتے تھے۔

حضرت شیخ الھند ؒ بھی فرماتے تھے کہ میں نے مولوی عبید اللہ کو کہا ہے کہ تمہاری بات سمجھنے والا ہندوستان بھر میں مَیں ہی ہوں اس لئے لوگوں سے کوئی ایسی بات نہ کرنا کہ جس سے وہ غلط فہمی میں پڑیں۔

حضرت شیخ الھند ؒ جس کی تعریف کریں، میں تو ان کے متعلق نیک گمان ہی رکھتا ہوں، (کیونکہ) حضرت شیخ الھند ؒ کی سمجھ اور علم، بہت گہرا تھا، حضرت مدنی ؒ بے شک بہت بڑے بزرگ ہیں، مگر جو بات حضرت شیخ الھند ؒ میں تھی، وہ بہت گہری تھی، لہٰذا مولانا عبید اللہ سندھی ؒ کے متعلق، حضرت شیخ الھند ؒ کے اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے، میں تو مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کو ایسا نہیں سمجھتا، جیسا کہ عام نقطہ چین یا بعض حضرات فرماتے ہیں۔

مولانا سندھی ؒ کا اپنا علم بھی بڑا وسیع تھا، سیاست سے لگاؤ اس درجہ تھا کہ حضرت شیخ الھند ؒ نے اپنے تمام شاگردوں میں سے کابل جانے کے لئے مولانا سندھی ؒ کو ہی بھیجنا مناسب سمجھا، اگر حضرت شیخ الھند ؒ سے تعلیمی اور تربیتی تعلق نہ ہوتا تو شاید مولانا مسلمان بھی نہ رہتے، کیونکہ وہ محض کسی کی تقلید میں بات ماننے کے عادی نہ تھے۔ مکہ معظّمہ میں بڑے بڑے نجدی عالم ان کے علم کے قائل ہوگئے، اور ان سے بعض نے پڑھا بھی، مگر ان کے سامنے اپنے آپ کو حنفی کہتے تھے۔

جب مکہ شریف جانا ہوا تو میں نے مولانا سندھیؒ کو بہت تلاش کیا، نہ ملے، پھر رات کو خود آ کر ملے اور فرمایا:۔

”میں حج کے موقع پر چھپا چھپا رہتا ہوں، ہر طرح کے لوگ (برطانوی حکومت کے جاسوس وغیرہ) اس موقع پر آئے ہوتے ہیں دانستہ میں لوگوں سے ملتا نہیں۔

میں نے (مولانا سندھیؒ سے) عرض کیا کہ آپ پڑھانا شروع کر دیں۔تو فرمایا”میں اب اپنے خیال سے لوٹنے والا نہیں، میرے لیے لوٹنا ناممکن ہے۔یعنی سیاسی مشاغل سے یکسو نہیں ہونا چاہتا، اگر مولانا سندھیؒ پڑھاتے تو نجدی۔جن میں قومیت کا اثر کم ہے۔آپ کی بڑی قدر کیا کرتے تھے، اور آپ سے پڑھنا چاہتے تھے، اور باوجود (مولانا سندھیؒ) کے حنفی ہونے کے وہ ان سے استفادہ کرنے کو آمادہ بلکہ خواہش مند تھے۔

۔۔۔ھاں! مجھے یہ بیان کرنا ہے کہ جب مولانا عبید اللہ سندھیؒ صاحب سے مکہ معظّمہ میں ملنا ہوا تو میں نے (ان سے) یہ بھی دریافت کیا کہ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت شیخ الھندؒ پر آپ کا (بڑا) اثر تھا، یہ کیا بات تھی؟ اس (سوال) پر مولانا صاحب مرحوم رو پڑے اور فرمایا”کہ میرا اثر کیا ہوتا، خدا کی قسم! اگر مجھے اب بھی یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت شیخ الھندؒ میرے کام سے ناراض ہیں یا خوش نہیں تو باوجود اس پختگی کے۔جو میں نے بیان کی۔میں فوراً اس کام سے رک جاؤں (مجھے معلوم ہے کہ حضرت شیخ الھندؒ میرے کام سے خوش ہیں) اس لئے میں اسے چھوڑ کر اور کسی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔(ارشادات حضرت رائے پوری صفحہ نمبر 34 تا 37)

4 ذالحجہ 1365ھ/ 30/ اکتوبر 1946 رائے پور میں ایک مجلس میں حضرت رائے پوری نے سب کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:۔

”مولوی حبیب الرحمٰن (رائے پوری) نے ایک بات پوچھی تھی۔اس پر دا، میں کچھ

بیان کرنے کی امنگ ہوئی، اور یہ مضمون کچھ میرا (اپنا) بھی نہیں، (بلکہ) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصانیف کے بعض فقروں سے مستنبط (کیا ہوا) ہے، مولانا عبید اللہ سندھیؒ شاہ صاحب کے کوئی خوامخواہ کے معتقد نہ تھے، (بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ) شاہ صاحب متاخرین میں زبردست علوم کے حامل ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر معاملے میں بڑے بڑے علوم عطا فرمائے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ کو کسی زمانہ میں کوئی رنگ پھیلانا ہوتا ہے، تو ویسے ہی لوگوں کو پیدا فرما دیتے ہیں، اور ان کے جذبہ کی وجہ سے عام نفوس ادھر کو ہی کھنچ جاتے ہیں''

میں نے اس سے یہی سمجھا کہ ایک تو سلوک ہے، یعنی چلنا، اور ایک جذبہ ہے یعنی کھنچ جانا، تو جب اللہ تعالیٰ کو دنیا میں کچھ کرنا منظور ہوتا ہے تو کسی ایسے قلب کے انسان کو دنیا میں بھیج دیتے ہیں، جس میں جذبہ ہو اور پھر اور لوگ بھی ایسے پیدا ہو جاتے ہیں، جن کو ان سے مناسبت ہو اس طرح وہ شخص ان کا مرکز بن جاتا ہے۔ اور وہ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، اور پھر ان کے اثرات سے زمانہ پر وہی رنگ چھا جاتا ہے۔ (ارشادات حضرت رائے پوری صفحہ نمبر 94,94)

30 ربیع الاول 1969ھ/ 18 /فروری 1950ء دھلی میں عصر کی نماز کے بعد ایک مجلس میں حضرت اقدس رائے پوری نے (حضرت سندھیؒ کے شاگرد) خواجہ عبدالحی صاحب پروفیسر دینیات جامع ملیہ دھلی سے فرمایا:۔

''کیا جناب نے مولانا سندھیؒ سے آیت انا عرضنا الامانة کے متعلق کوئی تفسیر سنی ہے، یا کبھی ان سے دریافت فرمایا (ہو تو بیان کیجئے) یا آپ بھی شیخ التفسیر ہیں۔ خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ ''حضرت! نہ کبھی اس کے متعلق میں نے حضرت مولانا مرحوم سے کچھ

دریافت کیا، اور نہ ان کا کوئی بیان اس سلسلہ میں سنا ہو مجھے یاد ہے۔(ارشادات ۲۶۸)

ان ملفوظات سے دونوں بزرگوں کے باھمی تعلق اور ان کے باہمی اعتماد کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری اور حضرت سندھیؒ کے افکار عالیہ میں یکسانیت

حضرت سندھیؒ نے جدید دور میں سماج کی تشکیل کے لئے عوامی جمہوریت' مزدوروں اور کسانوں اور پسے ہوئے طبقات کے حق میں انقلاب کی اہمیت اپنے خطبات ومقالات میں بڑی وضاحت سے بیان کی ہے۔ جیسا کہ قارئین پر اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوگا۔

اپنے وقت کے قطب، برصغیر کی عظیم خانقاہ رائے پور کے دوسرے مسند نشین حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ نے بھی اپنے ''ارشادات'' میں اس قسم کا بنیادی پیغام انقلاب دیا ہے، آپ کے چند ملفوظات درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

(1)۔13 رمضان المبارک 1365ھ/11 اگست/1946ء کو رائے پور میں ایک مجلس میں ارشاد فرمایا:۔

''......لوگوں کو چاہئے کہ کوشش کر کے ریاستوں میں کونسلیں وغیرہ بنالیں۔ جس طرح ولایت (برطانیہ) میں پارلیمنٹ ہے، اور ضلعوں میں لوگوں کے نمائندوں سے ڈسٹرکٹ

بورڈ بنتا ہے۔

مہمانوں میں مولانا عبدالوہاب خان رام پوریؒ نے عرض کیا:۔

''حضرت!۔۔۔لوگوں کا مطالبہ تو اب یہی ہے اور میں بھی اس کوشش میں ہوں، چنانچہ میں اس کام میں بدنام بھی ہوں، اور ڈرتا ہوں، حضرت سے عرض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ حضرت کہیں ناراض نہ ہوں'' حضرت رائے پوری نے فرمایا:۔ کہ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے، یہ تو بہت اچھا کام ہے، میں اس کام کی وجہ سے ناراض نہیں بلکہ خوش ہوں، لوگوں کو دلیری کرنی چاہیے۔۔۔۔۔لوگوں کو ہر جگہ اصلاحات کی کوشش کر کے انتظام کونسلوں کے ذریعے اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب رام پوری نے عرض کیا کہ حضرت! میں ریاست میں کہیں مدرسہ کے کام یا اور کسی کام سے بھی جاتا ہوں، تو جہاں بھی، جس کے ہاں ٹھہرتا ہوں، ریاست والوں کو بھی کھٹکنے لگتا ہے، یہ بڑی مشکل ہے۔

حضرت والا رائے پوری نے فرمایا:۔ ہمت سے کام کئے جاؤ، مگر خدا کی (رضا) کے واسطے کرو، اور لوگوں کو بھی دلیری سے کام لینا چاہیے۔

(ارشادات حضرت رائے پوری 44,42)

(2)۔29 ذی قعدہ 1365ھ/25/اکتوبر 1946ء رائے پور میں شام کی ایک مجلس میں ارشاد فرمایا:۔

''لوگوں کو مذہبی لڑائی کے بجائے اب زمیندار، کاشتکار اور مزدور، سرمایہ دار وغیرہ سوالات پر لڑنا چاہیے اس سے مذہب کو بدنام کرنے کا قصہ تو ختم ہو جائے گا، ورنہ یہ خیال ہے کہ مذہب بدنام تو اب بھی ہے، (مذہبی لڑائی پیدا کی گئی تو) اور بھی زیادہ بدنام ہو جائے گا''

(ارشادات حضرت رائے پوری صفحہ نمبر 75)

اسی مجلس میں ارشاد فرمایا:۔

''آج زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا، مولوی نے (مذہبی حوالے سے) بہت کچھ انقلابی داؤ کیے، مگر سیاست کے سامنے مذہب مات کھا گیا، پورا تو پتہ نہیں مگر خیال ہے کہ ہندوستان کی اگلی نسلیں یہ دیکھ کر'' کہ مذہب آپس میں نفاق کا موجب ہے'' مذہب کو ہی خیراباد کہہ دیں گیں حالانکہ (سچا) مذہب نفاق نہیں سکھاتا، یہ تو کچھ اور ہی چیز ہے، جو نفاق سکھا رہی ہے۔ مگر آنے والی ہندو مسلم نسلیں پھر بھی مذہب کو مطعون کریں گی، اور مولوی بیچارہ پٹتا رہے گا۔ یہ خیال ہے، کوئی الھام نہیں'' (ص 77)

اسی مجلس میں ارشاد فرمایا:۔

''انگریز نے ہندوستان کو بہلا رکھا ہے، ورنہ ہندوستان کی ذرا سی کروٹ اس وقت انگریز کو تباہ کر سکتی ہے۔ مگر اس کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں آپس میں اختلاف ہے، اگر اس وقت لیگ، کانگریس سمجھوتہ ہو جائے تو انگریز فوراً ہندوستان سے باہر ہو جائے گا'' (ص 78,77)

(3)۔ 6/ ذلحجہ 1365ھ/ یکم نومبر 1946ء رائے پور میں عشاء کے بعد ایک مجلس میں ارشاد فرمایا:۔

ہمارے تمام مجمع میں سے حضرت (شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ) رحمت اللہ علیہ نے صرف مجھے یہ فرمایا تھا کہ حضرت شیخ الھندؒ ضرور انشاء اللہ ہندوستان تشریف لائیں گے۔ میرے بعد جب وہ آجائیں تو ان کی خدمت میں ضرور آمدورفت رکھنا، اب (1946ء) میں اسی مسلک پر حضرت مدنی مدظلہ العالی ہیں۔ (ص 102)

حضرت والا (رائے پوری) نے مزید فرمایا:۔

''خواہ کوئی راضی رہے یا ناراض رہے، ہم تو اپنے بزرگوں کو راضی کرنا چاہتے ہیں اور یہ اپنا پرانا قاعدہ ہے'' (ص 101)

اسی مجلس میں ارشاد فرمایا:۔

’’آج کل شخصی حکومتیں ہرگز نہیں چل سکتیں، آج کل تو جمہوری اور شورائی حکومتیں ہی چل سکتی ہیں، جن میں کچھ لوگوں کا مخالف رہنا عین اصولی بات ہے‘‘

(ارشادات حضرت رائے پوری صفحہ 102)

(4)۔2، نومبر 1946ء کی ایک مجلس میں ارشاد فرمایا:۔

’’منافرت کی پالیسی ہندوستان میں نہایت ہی ناعاقبت اندیشی اور بے وقوفی کی پالیسی ہے۔جس سے مسلمانوں کا ہی زیادہ نقصان اور ہندوؤں کا فائدہ ہے۔ایسے منافرت کے ماحول سے متاثر ہوکر آریہ سماجی تحریک ہندوؤں میں زیادہ قابل قبول ہوجاتی ہے، اور ارتداد کے لئے زیادہ تدابیر اختیار کرنے کا امکان پیدا ہوجاتے ہیں، اور مسلمان بولتے، شور مچاتے زیادہ اور کام کم کرتے ہیں۔(ص114)

(5)۔2/نومبر 1946ء کو ایک مجلس میں ارشاد فرمایا:۔

’’کوئی سلطنت موجودہ دور میں اپنی بقاء کے لئے جدید علوم وفنون سے ایک لمحہ صرف نظر نہیں کرسکتی، اور وہ علوم وفنون اغیار سے سیکھنے ہوں گے۔اور ان میں مہارت حاصل کرنے لئے آجکل پوری قوم کو لگانا پڑتا ہے تاکہ اس سے معتدبہ حصہ ماہرین کا، اور باقی دوسرے مدارج کو پورے کرنے کیلئے کافی تعداد میں نکل آئیں‘ (ارشادات ص116,115)

..............................o..............................

امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی شخصیت

ازمؤرخ کبیر علامہ سید عبدالحی الحسنی

سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنو

(والد مولانا ابوالحسن علی ندوی مجاز حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری)

”وکان الشیخ عبیدالله من نوادرالرجال فی قوۃالاراده وشهامة النفس،واقتحام المخاطر،والبعدفی التخیل،والاعتماد علی النفس، والعزوف عن الشهوات،وکان مفرط الزکاء،قوی المناسبه فی العلوم،جیدالنظر فی طبقات العلماء،وتاریخ العلوم وتدوین الحدیث، وکان مفرط الحب والانتصار لشیخ الاسلام ولی الله بن عبد الرحیم الدهلوی،عظیم الشغف بکتبه وعلومه و تحقیقاته،لایکا د یعدل به احدامن حکماء الاسلام والعلماء الاعلام، جعل کتاب”حجةالله البالغه“وتحقیقاته فی کتبه اساس فکره وجهد ه ویطبقها علی العصر الجدید و نظمه۔

وکان له مذهب فی تفسیر القرآن،مستنبط منه دقائق السیاسیه العصریه.والمذهب الاقتصادیه،ویتوسع فی الاعتبار والتاویل۔(نزهة الخواطر صفحه328)/جلد8

ترجمہ:حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نادر روزگار شخصیات میں سے تھے۔ان کی

قوت ارادی بلند تھی، نفس میں بزرگی اور عظمت تھی، انہیں اپنے اوپر مکمل اعتماد تھا، مشکل حالات کا چیلنج قبول کرنے کی صلاحیت بہت اونچی تھی، ان کا تخیل بہت بلند تھا، اور خواہشات ولذات سے کنارہ کش تھے، انتہائی ذہین اور ذکی تھے، علوم سے بہت اونچی مناسبت رکھتے تھے، علوم کی تاریخ، علماء کے طبقات اور تدوین حدیث پر آپ کی گہری نظر تھی۔

آپ کو شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ بن عبد الرحیم دہلوی سے بہت زیادہ محبت تھی، ان کے فکر کو پھیلانے کا جذبہ بہت زیادہ تھا، ان کی کتابوں، علوم اور تحقیقات سے آپ کو بہت شغف تھا، ان کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور ان کی دیگر کتابوں میں بیان کردہ تحقیقات کو انہوں نے اپنے فکر و عمل کی بنیاد قرار دیا ہوا تھا اور دور جدید کے مسائل کا حل اس سے اخذ کیا کرتے تھے۔

تفسیر قرآن حکیم میں آپکا ایک خاص اسلوب تھا، اس میں آپ نے قرآن حکیم سے دور جدید کے سیاسی واقتصادی مسائل کا حل پیش کیا ہے۔ اور اعتبار اور تاویل میں توسع سے کام لیا ہے۔

(نزھۃ الخواطر صفحہ ۳۲۷ ج ۸)

ترتیب وترجمہ

عبدالخالق آزاد

کوئنز روڈ لاہور۔

امام انقلاب

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

زندگی اور شخصیت

تحریر

از

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

سابق استاذ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سابق ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی

دار العلوم دیوبند۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ

زندگی اور شخصیت

از

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی سابق استاذ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سابق ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند۔

دنیا میں جو لوگ کسی عقیدہ پر ایمان رکھتے یا کسی مذہب کو سچا مانتے ہیں وہ ہمیشہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک قسم تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے عقیدہ پر محض اس لیے ایمان رکھتے ہیں کہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے انہوں نے اس عقیدہ پر ایمان رکھنے والے گھرانے میں جنم لیا ہے۔ اس عقیدہ کو سچا ماننے والے لوگوں کی گودوں میں پرورش پائی ہے۔ اور ایک ایسی سوسائٹی اور ایسے ماحول میں ذہنی تربیت و تعلیم کے مختلف مدارج طے کیے ہیں جو اس عقیدہ کا یقین رکھتے ہیں اس قسم کے لوگوں کا ایمان ''ایمان کامل'' سہی' لیکن اگر وہ صرف اسی پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں تو ان میں اس بات کی صلاحیت کم ہوتی ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کی سچائی اس کے مخالفوں اور دشمنوں سے بھی منوا سکیں۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس عقیدہ کا بلند نظری' وسعت فکر اور تعمق خیال سے خود اپنے یا اپنے زمانہ کے طرز فکر کے ماتحت پوری طرح جائزہ

لیتے ہیں، عقل وفراست کی کسوٹی پر اس کو خوب اچھی طرح پرکھتے اور اس کا کھرا کھوٹا معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جب ان کے دل ودماغ اپنی تمام بیداریوں کے ساتھ اس عقیدہ کی صحت کا متفقہ اور قطعی فیصلہ صادر کردیتے ہیں تو اب وہ اس کو قبول کر لیتے ہیں اور خوش قسمتی سے قوت نظری کے ساتھ ان کی قوت عملی بھی تندرست اور پرجوش وسرگرم ہوتی ہے، اب یہ لوگ عقیدہ اور عمل کی پختگی کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ کرتے ہیں کہ پہلی قسم کے لوگوں سے بمراحل آگے نکل جاتے ہیں اور صداقت پرستی کے درجات ومراتب میں ان کا مرتبہ سب سے اونچا اور بلند ہوتا ہے۔

نبوت کی زبان حقیقت ترجمان نے

''خِيَارُ كُمْ فِي الْجَاهِلِيَةِ خِيَارُ كُمْ فِي الْاِسْلَامِ''

جو تم میں جاہلیت میں سب سے بہتر ہے وہ اسلام میں بھی سب سے بہتر ہے۔

فرما کر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی ''فاروقیت'' کا راز بھی اسی ایک نکتہ میں پنہاں ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلام جس کو رَبُّ السمٰواتِ وَالاَرضِ کی بارگاہِ اقدس سے ''رَضِیتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا'' کا طغرائے امتیاز وافتخار حاصل ہے۔ عقائد واعمال کا ایک ایسا دلنواز وروح پرور مجموعۂ خوبی ہے کہ اس کو جس جہت سے دیکھئے حُسن ہی حُسن نظر آتا ہے' اور اگر دیکھنے والا آئینہ ضمیر سے دیکھے تو ناممکن ہے کہ اس کی نظر تجسس اس کی جلوہ پاشیوں میں گم ہو کر نہ رہ جائے۔

زفرق تا بقدم ہرکجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

یہی وجہ ہے کہ عرب کے سادہ طبیعت مشرکین واہل کتاب اسلام کی سادہ تعلیمات سے متاثر ہوئے اور حلقہ بگوش کلمۂ توحید بنے ۔ عجمیوں کو ان تعلیمات کے اخلاقی اور عملی اثرات ونتائج نے رام کیا اور وہ اس کے صیدِ زبوں ہوئے' فلاسفہ کو اسلام نے کھینچا۔ بہادروں کے سخت دلوں کو عمر و خالد (رضی اللہ عنھما) کی جانبازیوں نے موم بنایا۔ سلاطین وامراء ۔ اسلام کے سکندر دماغ فقیروں اور درویشوں کی شان بے نیازی واستغنا کو دیکھ کر اس کے آستانۂ عقیدت وارادت پر بے ساختہ جھک پڑے اور دنیا کے مظلوم ومجبور اور بے کس ومقہور انسان جن کے جسموں پر قیصریت وکسرویت کے دیو جان شکار نے اپنے دندان حرص وآز جمار کھے تھے ۔ انہوں نے اسلام کی زبان سے انسانی حقوق کے احترام اور مساوات وبرابری کا نعرہ سنا تو وہ سب اس کے جھنڈے نیچے جمع ہو گئے اور انہوں نے دعوت ربانی کو لبیک کہتے ہی اپنے سوکھے ہوئے بازوؤں اور لاغر ونحیف جسموں میں ایک ایسی طاقت محسوس کی کہ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے قیصریت وکسرویت کے ناپاک جامہ ظلم وستم کی فضائے آسمانی میں دھجیاں اُڑا دیں، غرض یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر جماعت نے اسلام کی صداقت کو اپنے اپنے نقطۂ فکر اور رجحان ذہنی کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے' اور اس کی سچائی پر ایمان لائی ہے۔ راہیں گو مختلف ہوں ۔ منزل بہرحال ایک ہی ہے ۔ عنوانات فہم وتعبیر میں رنگارنگی وگوناگونی ہے لیکن معنوں میں یکسانیت ہے۔

عبارا تنا شتی وحسنک واحد

تاریخ اسلام کے ہر دور میں یہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوگا ۔ تاریخ انسانی سے طبعی ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان کا طریق فکر اور اس کا انداز فہم وتدبر بھی ترقی پذیر ہوتا ہے ،اور وہ اپنے اسی طریق فکر کی روشنی میں ہر حقیقت کا جائزہ لیتا ہے ۔ اسلام چونکہ عالمگیر اور آخری دین حق ہے اس لیے اس کو کوئی انسانی جماعت خواہ کسی طریق فکر سے جانچے ۔ بہرحال اگر

فطرت میں سلامتی ہے تو وہ ضرور اس کی صداقت کا اعتراف کرے گی۔ اسی بنا پر متکلمین کے نام سے علماء اسلام میں جو جماعت، ہر دور میں رہی ہے اس نے اسی بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اسلام کا پیغام اپنے زمانہ کے لوگوں تک ان کی استعداد فہم وفراست اور طریق فکر وتدبر کے مطابق ہی پہنچائیں۔

آجکل اسلامی قدامت پرستوں کا ایک عجیب وغریب شعار یہ بھی ہو گیا ہے کہ اب متکلمین اسلام کی ان مخلصانہ کوششوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، اور ان کے کارناموں کی وقعت کو کم کرنے کے لیے سرے سے عقلیت ہی کی مخالفت شروع کر دی گئی ہے۔ حالانکہ اگر واقعہ ایسا ہی ہوتا تو امام شافعی اور دوسرے علماء ایک مرتبہ علم کلام کی تحصیل کے متعلق عدم جواز کا فتویٰ دینے کے بعد پھر اس کے وجوب کا حکم نہ دیتے۔

ظاہر ہے کشتی میں جیتنے نہ جیتنے سے کسی مذہب کی صداقت کا کیا تعلق ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود ''رُکانہ'' نامی ایک عرب پہلوان نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی لڑنے کی فرمائش کی اور اس میں جیت جانے کو اس نے دلیل صداقت قرار دیا تو آپؐ اس پر بھی رضامند ہو گئے اور رُکانہ کو پچھاڑ کر اسی سے اپنی نبوت کا اقرار کرایا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ قبیلہ تمیم کے ایک وفد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مفاخرت یعنی فخر میں مقابلہ کرنے کی دعوت دی تو آپ اس پر رضامند ہو گئے، اور آپ نے وفد کے خطیب کے مقابلہ میں اپنے خطیب ثابت بن قیس کو اور ان کے شاعر کے مقابلہ میں اپنے شاعر حسان بن ثابت کو اشعار پڑھنے کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرداران تمیم نے خطبہ اور اشعار سن کر کہا۔ بیشک آپ نبی اور موید من اللہ ہیں، اور پھر سب مسلمان ہو گئے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی صداقت کو ثابت کر دکھانے کے لیے ایک مبلغ کو اپنے زمانہ کے تمام آلات اور ساز وسامان سے مسلح ہونا چاہیئے، اور اگر وہ ایسا کرتا

ہے تو اس کا یہ فعل سراسر اسلامی ہے۔ نہ کہ ''تجدد۔''

ہمارے زمانہ میں مولانا عبیداللہ سندھی اسی نوع کے متکلم اسلام تھے۔ مزید برآں آپ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ متکلم ہونے کے ساتھ عملاً عظیم و جلیل مجاہد بھی تھے۔

ہونا تو یہی چاہئے۔ لیکن بدنصیبی سے ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو اسلام کی عالمگیر حیثیت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ناآشنا ہونے کے باعث دینِ قیم کی نسبت اجارہ دارانہ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے' جاگیر دارانہ ذہنیت رکھتا ہے۔ اس طبقہ کو نئے عنوان و تعبیر کا اختلاف بھی ناقابل برداشت ہے۔ اور یہ کسی ایسی چیز کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا جو ان کے اپنے محدود نقطۂ فکر سے ذرا بھی منحرف ہو۔ چنانچہ ان حضرات سے مولانا عبید اللہ سندھی کا اجتہادی فکر گوارا نہ ہو سکا اور انھوں نے مولانا مرحوم کی زندگی میں ہی تحریروں اور تقریروں میں اس کا اعلانیہ اظہار شروع کر دیا تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ساتھ ان حضرات کا یہ معاملہ تاریخ اسلام کا کوئی انوکھا اور نادر واقعہ نہیں ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔

غور کیجئے امام احمد بن حنبل کو ''اَلْقرآنُ کَلَامُ اللهِ غَیْرُ مَخْلُوْقٍ'' کہنے کے جرم میں کن لوگوں نے دُرّے لگوائے تھے۔ امام مالک بن انس کو **طلاق المکرہ لیس بواقع** کا اعلان کرنے کی پاداش میں کن حضرات نے ذلیل و رسوا کرایا۔ پھر ابنِ رشد پر جو تباہی آئی وہ کن کے فتاوی کا صدقہ تھا' امام ابن تیمیہؒ کو قید و حبس کی جو تکالیف برداشت کرنی پڑیں ان کے لیے سندِ جواز کا سامان کن حضرات کی تکفیر نے مہیا کیا۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی نسبت جہانگیر ایسے عادل بادشاہ کے اپنے تزک میں حد درجہ ناشائستہ الفاظ اور ان کو گوالیار کے زندان میں محبوس کرنا کس ذہنیت کا پتہ دے رہے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ''بدعت ترجمہ قرآن'' پر علماء کرام کے ایک طبقہ نے

کیوں ہنگامہ برپا کیا تھا۔ یہاں تک کہ مسجد فتحپوری میں ان کے قتل تک کا پروگرام بنالیا گیا تھا۔

غرض یہ ہے کہ اصحاب عقل ونقل اور ارباب اجتہاد وتقلید میں ہمیشہ کشمکش رہی ہے۔ اور سب آپس میں ایک دوسرے سے نبرد آزمار ہے ہیں۔ اس بنا پر اگر آج بھی ایسا ہو تو اس میں نہ کوئی برا ماننے کی بات ہے اور نہ جائے حیرت واستعجاب ہے۔

چونکہ ہر کلام کے سمجھنے میں متکلم کی شخصیت کو سمجھ لینے سے بڑی مدد ملتی ہے، اس لیے مناسب ہے کہ مولانا سندھی کے افکار وآرا پر گفتگو کرنے سے پہلے موصوف کی شخصیت کا ایک اجمالی جائزہ لے لیا جائے۔

مولانا کے افکار پڑھتے وقت بنیادی طور پر اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ یہ افکار ایک ایسے شخص کے ہیں جو پیدائشی مسلمان نہیں تھا۔ ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوا۔ دنیوی اعتبار سے اچھی خاصی آرام کی زندگی بسر کرنے کے باوجود اس نے مذہبی صداقت کی جستجو شروع کی اور جب اسلام کی صداقت اس پر روشن ہوگئی تو اب اس کے قبول کرنے اور اس کے اظہار واعلان میں اس نے کسی کی ذرہ بھر پروانہ کی، اسلام اس کو اتنا عزیز تھا کہ اس کی خاطر اس نے بوڑھی ماں کو چھوڑا۔ بہن اور ماموں سے منہ موڑا۔ کنبہ۔ قبیلہ کو الوداع کہا۔ یہاں تک کہ اپنا وطن بھی ترک کر دیا۔ پھر اس نے صرف مسلمان ہونے پر قناعت نہیں کی بلکہ اسلام کی اصل روح۔ اس کی تعلیمات اور اس کے اصول وفروع میں بصیرت پیدا کرنے کے لیے اس نے علوم دین کی تحصیل شروع کی، اور اسی سلسلہ میں وہ دیوبند آیا۔ یہاں اس نے علوم عقلیہ ونقلیہ میں کمال درک پیدا کیا۔ ذہن بیدار تھا، اور ذوق جستجو صادق' استاد حضرت شیخ الہندؒ جیسا ملا جو پیتل کو سونا' اور خاک سیاہ کو ہیرا بنادے۔ پھر کمی کس چیز کی تھی اس نومسلم نوجوان نے وہ آب وتاب پیدا کی کہ اپنے ساتھیوں سے گویا سبقت لے گیا۔ اس کے علم وعمل' اخلاص ودیانت اور فہم وفراست کے ثبوت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اہم کاموں

میں اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کا معتمد ترین دست و باز و بنا جو اپنے عہد کے صرف ایک نامور محدث نہیں تھے بلکہ عالم اسلام کے بلند پایہ مفکر بھی تھے، اور جن کا دل و دماغ اسلام کو دنیا کی عظیم ترین طاقت بنانے اور ہندوستان میں ایک اسلامی انقلاب برپا کرنے کی فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں رہتا تھا۔ اسی غایت [1] اعتماد کا نتیجہ تھا کہ استاد نے اپنے اس نوجوان شاگرد کو اپنے سینہ کے راز ہائے سربستہ کا محرم و امین بنا کر کابل بھیج دیا۔ کابل میں چند سالہ قیام کے بعد آپ ماسکو آئے۔ یہاں اپنی آنکھ سے زار کی حکومت کے کھنڈروں پر سوویت روس کی جدید عمارت کو کھڑے ہوتے دیکھا۔ یہاں ایک سال قیام کرنے کے بعد آپ ترکی آئے۔ پھر حجاز پہنچے اور بارہ تیرہ سال یہاں کی خاک پاک میں بسر کرنے کے بعد ہندوستان آئے اور پانچ سال بعد بالآخر یہیں جان، جاں آفریں کے سپرد کر کے راہی عالم بقا ہو گئے۔ رحمتہ اللہ رحمتہ واسعتہ۔

؎ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

یہ ظاہر ہے کہ مولانا ہندوستان سے کابل حضرت شیخ الہندؒ کے بھیجے ہوئے تھے، اور ان کے ایک خاص مشن کے سفیر و مبلغ بن کر۔ پھر وہاں کیا حالات پیش آئے کہ مولانا کو آخر کار افغانستان کی اقامت بھی ترک کرنی پڑی؟ اس سلسلہ میں ایک بات بالکل ظاہر ہے اور خود مولانا نے بھی اپنی تقریروں میں اس کا بارہا ذکر کیا ہے، کہ ان کو قیام افغانستان کی طویل مدت میں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس پین اسلامزم کی بنیاد پر اسلام کی نشاۃ کی عمارت قائم کرنا چاہتے تھے وہ اب حالات زمانہ کی وجہ سے خواب و خیال،، ہو کر رہ گیا ہے اور جن سے توقع تھی کہ وہ مسلمانان ہند کی خستگی اور جراحت دل کی داد دیں گے۔ وہ غریب

---

[1] ہماری جماعت میں حضرت شیخ الہندؒ کے نامور تلامذہ کی نسبت یہ مشہور ہے کہ مولانا سندھیؒ حضرت شیخ الہندؒ کے دماغ تھے۔ مولانا حسین احمد اور مولانا عزیز گل وغیرہ ہما آپ کے دست و پا تھے۔

خود ہندوستان کے بدنصیب مسلمانوں سے بھی زیادہ ''خستہ تیغ ستم'' ہیں اور سب کے سب اپنے اپنے ملکی وطنی معاملات ومشکلات کے حل کرنے میں اس درجہ سرگرداں و پریشان ہیں کہ انہیں اپنے کسی دوسرے ملک کے برادران ملت کے معاملات پر غور کرنے اور ان سے دلچسپی لینے کی فرصت ہی نہیں ہے' مولانا نے ترکی کے عزل خلافت سے پہلے ہی اس حقیقت کو روز روشن کی طرح محسوس کرلیا تھا۔لیکن بعد کے تجربات نے خود ہندوستان کے بھولے بھالے مسلمان کو بھی آخر کار اس حقیقت کا یقین دلایا۔انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نہایت درد وکرب سے محسوس کیا کہ انہوں نے ترکوں کی محبت میں اپنا سب کچھ کس طرح بے دریغ لٹایا اور خرچ کیا۔لیکن ترکی کے نوجوان نے اس کا کیا جواب دیا۔یہاں تک کہ ان فیاضیوں' قربانیوں اور ایثار وفدا کاری کے جواب میں ان غریبوں نے خود غلامی کے طعنے سنے اور ان کو بصد حسرت وافسوس کہنا پڑا۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ ونام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

مسلمانان ہند کے اس تلخ احساس کو ایک مرتبہ مولانا محمد علی مرحوم نے مصر میں تقریر کرتے ہوئے ایک نہایت بلیغ فقرہ میں ظاہر کیا تھا۔مولانا نے فرمایا' اے مصر وادی نیل کے مسلمانو! خوب یاد رکھو۔تمہاری سرزمین کو فرعون سے بھی '' نسبت ہے اور حضرت موسیٰ سے بھی۔پس اگر تم کو حضرت موسیٰ پر ناز وفخر ہے تو تم ہمارے بھائی ہو۔لیکن اگر تم فرعون کو اپنے لیے سرمایہء افتخار سمجھتے ہو تو ہم کو تم سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی جس ذہن بیدار' دماغ روشن اور ہمت بلند کے مالک تھے اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ ان مایوسیوں میں ولولہ وعزم کار کے شعلوں کو سرد کر کے بیٹھ جاتے اور دل کو تسلی دینے کے لیے کسی خانقاہ میں بیٹھ کر تسبیح گردانی پر قناعت کر لیتے۔

ایک سپاہی کا کام یہ ہے کہ وہ ایک مورچہ پر شکست کھاتا ہے تو اپنے لیے دوسرا مورچہ پسند کر لیتا ہے۔اس کا اگر ایک ہتھیار کند اور ناکارہ ہو جاتا ہے تو وہ جھٹ دوسرے ہتھیار سے کام لینا شروع کر دیتا ہے۔اسے یقین ہوتا ہے کہ زندگی جدوجہد مسلسل کا ہی نام ہے اور موت سکون کے سوا اور کچھ نہیں۔

مولانا سندھی ؒ کو قدرت نے جو دیدۂ بینا اور چشم حقیقت نگر عطا فرمائی تھی اس کا مطالبہ یہ تھا کہ دریا میں طغیان وسیلاب کا تموج دیکھ کر لب ساحل آنکھیں بند کیے بیٹھے رہنا اور پسر نوح کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پر بھروسا کرنا قرین دانشمندی اور شیوۂ مصلحت شناسی نہیں ہے' مولانا نے محسوس کیا کہ جنگ عظیم نے دنیا کی تہذیب وتمدن کے نقشے بدل دیئے ہیں۔ایشیا پر یورپ کے سیاسی اقتدار کا پنجہ مضبوطی سے جم گیا ہے۔نظامات کہن کی قبا پارہ پارہ ہوگئی ہے۔پرانا فلسفہ پرانی روایات اور پرانا انداز تخیل سب انقلاب کی طوفانی موجوں میں خس وخاشاک کی طرح بہتے چلے جارہا ہے۔

مولانا کی زندگی کا مشن صرف اعلاء کلمۃ اللہ اور دین حق کی سربلندی وسرفرازی تھا اور اسی مقصد کو لے کر وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے تھے۔لیکن یہ مقصد حاصل ہو تو کس طرح ؟اس کا جواب آسان نہیں تھا۔البتہ ایک بات بالکل صاف طور پر واضح ہوگئی تھی کہ اگر مادیت کے اس بے پناہ فروغ کے وقت مسلمانوں نے پرانا مورچہ بدل کر کوئی نیا مورچہ نہیں بنایا تو ان کی موت یقینی ہے۔قدرت کا اٹل فیصلہ ہے۔''اِنَ اللّٰہ لا یغیرِ مَابقومٍ حتی یغیرّ و اما بانفسھم ۔''یعنی ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

قدرت کا یہ فیصلہ سب کے لیے ہے'اور ہمیشہ کے لیے۔اس میں مسلمان' یہودی

عیسائی اور پارسی کسی کی تخصیص نہیں ہے۔

پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارکہ وحسنہ بھی آپ کے سامنے تھا کہ کس طرح آنحضرت نے تیرہ سال مکہ میں گزارے۔ پھر مدینہ کی طرف ہجرت کر کے اور وہاں مقیم ہو کر وہاں کے بااثر قبیلوں سے معاہدہ کر کے اسلام کی مخالف طاقتوں سے جنگ کی، اور اس طرح مسلمانوں کو اس بات کا سبق دیا کہ کوئی عقیدہ خواہ کتنا ہی اچھا ہو' اور اس پر ایمان رکھنے والے کتنے ہی مخلص اور فداکار ہوں بہرحال اس کو دنیا میں زندہ رکھنے اور طاقتور بنانےکے لیے پہلی شرط حسن تدبیر ہے۔ اگر کام حسن تدبیر کے ساتھ کیا گیا ہے تو پھر بدر وحنین کے معرکوں میں فرشتے بھی آئے ہیں۔ اور جماعت حقہ کی مدد کرتے ہیں۔ اور اگر تدبیر میں فروگذاشت ہو جائے تو غزوۂ احد کی طرح اس کا خمیازہ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس بنا پر مولانا نے اس بات کا تو فیصلہ قطعی طور پر کر لیا کہ اب پرانے مورچوں پر جما رہنا عقل ومصلحت اور خود اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے لامحالہ دوسرا مورچہ بنانا ہے۔ اور اس پر کھڑے ہو کر اسلام کی تمام مخالف طاقتوں کو دعوت مبارزت دینا ہے۔

لیکن یہ دوسرا مورچہ کیا ہو؟ اور اس کی تشکیل کس طرح پر کی جائے؟ اس کے لیے ضرورت تھی کہ پہلے اسلام کی مخالف طاقتوں کا پوری حاضر حواسی کے ساتھ جائزہ لیا جائے، اور ان تمام عوامل وموثرات کا دیدہ وری کے ساتھ مشاہدہ ومطالعہ کیا جائے جنہوں نے ان مخالف طاقتوں کے میگزین میں جادو کی سی تاثیر پیدا کر دی ہے، اور جن کی وجہ سے وہ تمام دنیا پر چھائی جارہی ہیں۔ اور ان کے بالمقابل عراق وہمدان' کا مسلمان غریب ''نوائے سوختہ درگلو'' اور پریدہ رنگ ورمیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔

مولانا نے ان چیزوں سے واقفیت کے لیے آج کل کے ہمارے عام مفکرین ومتکلمین اسلام کی طرح صرف اخبارات اور کتابوں کے پڑھ لینے کو کافی نہیں خیال کیا' اور نہ ان

کی ہمت مردانہ کبھی اس کو گوارا کرسکتی تھی۔ آپ نے ضرورت محسوس کی کہ خود ان ملکوں میں جا کر جہاں نئے مادی فکر کے اسلحہ ڈھل رہے تھے، قریب سے ان کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ ان مادی افکار ونظریات کی ساخت میں کتنے اجزائے صالحہ ہیں جن کو خود ہمیں اختیار کرنا چاہئے۔ اور کتنے اجزائے فاسدہ ہیں جن کو کاٹ کر ہم اپنے لیے امن وحفاظت کا سامان مہیا کر سکتے ہیں، مسلمانوں نے تاریخ کے گزشتہ ادوار میں یہی کیا ہے، اور اسی طرح وہ اپنی ہستی کو مختلف احوال وشئون میں برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ حقیقتوں سے آنکھ بند کر لینا اور اپنے خیالات کی تنگ اور محدود کوٹھڑی کو ہی کائنات کی وسیع فضا سمجھ لینا زندگی نہیں بلکہ موت کا پیغام ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

لیکن یہ وہ نکتہ ہے جو اسلام کی نسبت جاگیر دارانہ ذہنیت رکھنے والوں اور سبحہ وسجادہ کو ہی عین اسلام سمجھنے والوں کے دماغ کی رسائی سے بہت بلند ہے۔

مسلمانوں نے پہلے بھی ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' پر عمل کیا ہے اور اب بھی اگر وہ اپنی ہستی قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس پر عمل کرنے سے مفر نہیں ہے۔

غرض یہ ہے کہ یہ جذبہ تھا جس نے مولانا کو ترک افغانستان پر مجبور کیا۔ اور آپ یہاں سے روانہ ہو کر ماسکو آئے۔ ترکی پہنچے اور دوسرے یورپین ملکوں میں کچھ دن رہے۔ ماسکو میں اس وقت انقلاب کے ہاتھوں سے ایک نئے نظام فکر وتمدن کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ یہاں رہ کر ایک دیدہ ور مفکر اسلام کو غور کرنا تھا کہ وہ کیا کیا خرابیاں اور کمزوریاں تھیں جو زار کی شہنشاہیت کو گرد وغبار بنا کر لے اڑیں؟ اور وہ کیا اسباب وعوامل ہیں جن کی وجہ سے انقلاب کامیاب ہوا۔؟ نیز یہ کہ اس انقلاب کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ اور دنیا کے مختلف گوشوں پر اس کے اثرات

کیا ہوں گے؟اس کے محاسن کیا ہیں اور معائب کیا؟

پھر اس مفکر نے اس پر بھی غور کیا کہ اس طرح کا اگر کوئی اسلامی انقلاب کسی ملک میں پیدا کیا جائے تو اس کی صورت حال کیا ہونی چاہیے۔اور بنیادی طور پر اس کا خاکہ کیا ہوگا؟اس مقصد کے لیے مولانا نے ماسکو کا قیام ایک سال تک کے لیے وسیع کر دیا' اور اس مدت میں وہاں کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا۔جو لوگ اس انقلاب کے امام تھے ان سے ملاقاتیں کیں۔ان کے افکار وخیالات سے واقف ہو کر اس انقلاب کے پس منظر کا علم حاصل کیا۔ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔اس کا کھرا کھوٹا معلوم کیا۔عصری رجحان ذہنی کا بکمال دانشمندی جائزہ لیا۔اور سب سے آخر میں اس کا کھوج لگایا کہ انقلاب کی اس عمارت میں کہاں کہاں رخنے ہیں۔جن کو بند کر کے اس کو اپنایا جا سکتا ہے۔اور اسلام کی حفاظت کے لئے اس کو ایک مضبوط ومحفوظ قلعہ کی حیثیت سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ترکی جو مسلمانوں کی امیدوں کا ایک آخری سہارا تھا۔مولانا نے اس کو بھی اسی نقطہ نظر سے دیکھا اور پھر ان سب تجربات اور افکار کو لیے ہوئے اسلام کے حرم محترم (حجاز) میں آکر مقیم ہو گئے۔تاکہ جو کچھ بھی انہوں نے ان ملکوں میں دیکھا اور محسوس کیا تھا ان سب کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کی بحالی اور اسلام کی سر بلندی کے لیے ایک مکمل خاکہ اور نظام فکر وعمل تجویز کریں جو نہ صرف کسی ایک ملک کے مسلمانوں کی حالت کو بدل دے۔بلکہ اسلام کو دنیا کی عظیم الشان طاقت بنا دے۔

اگر کوئی اور جلد باز اور سریع الانفعال (جلدی اثر قبول کرنے والا) شخص ہوتا تو وہ ان حالات میں اعتدال کی راہ پر مشکل سے ہی قائم رہ سکتا تھا۔یورپ کی مادیت کا فروغ' ترکی کا جدید انقلاب' روس میں اشتراکیت کی شاندار فتح' یہ سب چیزیں ایک ایسے شخص کو مرعوب متاثر اور خیرہ کرنے کے لیے کافی تھیں جو نہ کسی عربی مدرسہ کا مدرس تھا' نہ کسی خانقاہ کا پیر

طریقت تھا۔ نہ کسی اسلامی جماعت کا امیر تھا اور نہ اس کے پیچھے مریدانِ باصفا کا ایک انبوہ کثیر تھا۔ وہ ان تمام دینی اور مذہبی حیثیتوں سے بالکل الگ اور دور تھا۔ خود آزاد تھا اور اپنے دوش پر کسی کی مسؤلیت کا بار نہ رکھا تھا۔ اس بناء پر بہت ممکن کیا' بلکہ اغلب تھا کہ وہ عصر حاضر کے ان جھوٹے نگینوں کی آب وتاب سے مرعوب ہو کر کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھتا جو سراسر غیر اسلامی ہوتا۔

جو شخص اپنے خاندانی مذہب کو تمام عوائق وموانع کے باوجود تبدیل کر دینے کی جرأت کر سکتا ہے وہ یہ بھی کر سکتا تھا کہ نئے اختیار کردہ مذہب کا طوق غلامی بھی اپنی گردن سے اتار پھینک دیتا علی الخصوص جب کہ دنیا بھر کی خاک چھاننے کے بعد اس پر یہ حقیقت بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ اس' مذہب کے پیچھے کوئی سیاسی طاقت بالکل نہیں ہے اور اب یہ صرف مسجد وخانقاہ کا مذہب بن کر رہ گیا ہے۔ جس کی بنا پر شاعر ملت اقبال کو کہنا پڑا تھا۔

بہ بند صوفی وملا اسیری حیات از حکمت قرآں نگیری
زآیاتش ترا کاری جزیں نیست کہ از کیں او آساں بمیری

مولانا عبیداللہ سندھی کی سلامت فطرت۔ صحت ذوق اور استقامت علی الاسلام کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ وہ ان تمام حالات ومشاہدات سے بنفس نفیس براہ راست دوچار ہوتے ہیں اور پھر جو جو چیز قیام دیوبند کے زمانہ میں ان کے فکر کا مرکز تھی۔ یعنی قرآن وسنت اور حجۃ اللہ البالغہ وہی اب بھی مرکز فکر ہے۔ اس میں سرمو انحرف نہیں آیا ہے۔ چنانچہ وہ جس طرح حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے عقیدۃً وعملاً مسلمان تھے اسی طرح اب بھی مسلمان تھے نماز روزہ کی پابندی اور روزانہ قرآن مجید کی تلاوت وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اپنی ظاہری شکل وصورت اور عالمانہ وضع قطع میں بھی فرق نہیں آنے دیا۔

مولانا کے افکار وآراء کا مطالعہ کیجئے ان کی تحریروں اور تقریروں کو پڑھئے' جلوت و خلوت میں ان کی گفتگو سنئے' آپ دیکھیں گے کہ ہیگل اور مارکس کا کہیں ذکر نہیں

ہے۔لینن۔ٹائسٹائی اور میکسم گورکی کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔اگر تذکرہ ہے تو قرآن وسنت کا ہی ذکرو بیان ہے تو حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شیخ الہندؒ ہی کا۔وہی ایک مرکز ہے جس کے اردگرد مولانا کے افکار گردش کرتے رہتے ہیں۔وہی ایک سرچشمہ ہے جہاں سے ان تمام افکار کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔آپ مولانا کے استدلال واستخراج سے اختلاف کرسکتے ہیں۔ان کے نتائج غوروفکر کو غلط قرار دے سکتے ہیں۔لیکن یہ بہرحال ماننا ہی ہوگا کہ مولانا نے اپنے افکار کی بنیاد غلط یا صحیح مغرب کے کسی فلسفی کے اقوال وآراپر نہیں رکھی ہے بلکہ ان کا اصل منبع وہی ہے جو ایک مسلمان کا ہونا چاہیے۔

مولانا نے یورپ کے جدید ذہنی رجحانات نئے انقلابی جذبات کا جو مطالعہ کیا ہے وہ ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے کیا ہے' اور مولانا یورپ کے جن ملکوں میں رہے ہیں اور وہاں مادی ترقیات کا مشاہدہ کیا ہے تو اس جاسوس کی طرح کیا ہے جو دشمن کے ملک میں اس کے انتظامات اور قلعہ بندیوں کا سراغ لینے آتا ہے' تاکہ وہ اپنے ملک والوں کو ان سے آگاہ کرکے ان کے خلاف اپنے آپ کو مضبوط اور محفوظ بنانے پر آمادہ کردے۔

مولانا نے حضرت شیخ الہندؒ کی معیت وصحبت میں حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب ''حجتہ اللہ البالغہ'' اور دوسری کتابوں کو بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا اور بعض جگہ ان کا درس بھی دیا تھا۔اس لیے مولانا کو ان پر عبورتام حاصل تھا۔اوران کتابوں سے خاص انس اور دلچسپی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا عہد مسلمانوں کے انحطاط کا عہد تھا۔برائے نام مسلمانوں کی حکومت ضرور تھی۔ورنہ دراصل شہنشاہیت اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ اس وقت بھی قائم تھی اور مسلمانوں میں وہ تمام اعتقادی اور عملی کمزوریاں پائی جاتی تھیں جو آج ان میں موجود ہیں۔اس بناپر ضروری تھا کہ شاہ صاحبؒ ایسے مجدد امت کی تصنیفات میں خرابیوں کی اصلاح اوران کو دور کرنے کی تدبیروں کا تذکرہ ہوتا' چنانچہ مولانا نے حضرت شاہ صاحب

کی تصنیفات میں ان چیزوں کو پالیا اور ان پر برابر غور کرتے رہے۔

اب ماسکو، ترکی اور دوسرے یورپین ممالک میں تجربات حاصل کرنے کے بعد قرآن کے مہبط اول (مکہ) میں آ بیٹھے تو آپ نے قرآن اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ کی ہی رہنمائی میں موجودہ بین الاقوامی حالات میں اسلام کی مشکلات کا جو حل سوچا تھا اس کو عملی اعتبار سے مرتب کرنا شروع کر دیا۔ ان افکار کا تعلق چونکہ اولاً ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا اس لیے جب آپ کو موقع ملا۔ آپ ان کو لیے ہوئے ۱۹۳۹ء میں ہندوستان آ گئے اور یہاں ان کی تبلیغ و اشاعت تادم آخر کرتے رہے۔

بات ذرا طویل ہوگئی لیکن مولانا کے افکار و آرا پر بحث کرنے سے قبل مولانا کی شخصیت کو اجاگر کرنا ضروری تھا کہ قارئین کرام کو ان افکار کا پس منظر معلوم کرنے کے بعد خود افکار کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

مولانا کی شخصیت پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا مختلف ملکوں میں پھرتے رہے اور وہاں کے حالات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے سے مولانا کے افکار میں جو اسلام کے احیاء سے متعلق تھے وقتاً فوقتاً تبدیلی ضرور پیدا ہوتی رہی لیکن ان کا بنیادی نقطہ فکر جس کی اساس قرآن مجید اور ائمہ اسلام کے افکار تھے کسی حالت میں نہیں بدلا۔ وہ عمر بھر اسلام کے لیے ہی زندہ رہے۔ اسی کے لیے مجاہدانہ وار دنیا بھر کے مصائب برداشت کیے اس پر ان کی وفات ہوگئی۔

یہاں اس واقعہ کا ذکر بھی بے محل نہیں ہوگا کہ یہاں دہلی میں جامع مسجد کے قریب مولانا مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی (سابق صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان) کا بڑا مکان ہے۔ جہاں جمعہ کی نماز کے بعد تقریباً وہ تمام ابنائے دارالعلوم دیوبند جو دہلی میں قیام پزیر ہیں جمع ہوتے ہیں اور مختلف مسائل و امور پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ مولانا عبیداللہ

سندھی بھی قیام دہلی کے زمانہ میں ہر جمعہ کو اس مجلس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اور ہم لوگوں کو جستہ جستہ مقامات سے حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے تھے۔ مولانا کی عادت یہ تھی کہ وہ اصل مسئلہ کے متعلق خود پہلے ایک تقریر کر دیتے تھے اور پھر ہم لوگ نہایت آزادی اور بیباکی سے اپنے شکوک وشبہات یا اعتراضات بیان کرتے تھے تو مولانا ان کے جوابات کی تقریر کرتے تھے۔

مولانا کی پابندی وضع کا یہ عالم تھا کہ محض اس مجلس میں شرکت کے لیے جامعہ نگر او کھلے سے جو دہلی سے سات میل کی مسافت پر ہے' نماز جمعہ سے قبل تشریف لاتے تھے اور نماز عصر کے بعد یہاں سے فارغ ہو کر واپس جاتے تھے۔ نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ متعدد بار ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا کے پاس موٹر بس کا کرایہ ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہوئے' وہ گرمی کے دنوں میں جامعہ نگر سے پیدل چل کر دہلی پہنچے ہیں اور پھر پا پیادہ ہی واپس گئے۔ لیکن کیا مجال کہ چہرہ کی بشاشت اور زور تقریر پر اثر محسوس ہونے دیا ہو یا کسی سے اس کا ذکر کیا ہو۔ کیا آج بھی کوئی عالم دین متین ہے جو اس طرح کی مجاہدانہ زندگی بسر کرنے کا خوگر ہو۔ آہ! اب آنکھیں اس پیکر عزم کو ترستی ہیں۔ الی اللہ اشکو لا الی الناس انتی اذی 'الارض تبقی والا خلاء تذھب۔

("مضمون ماخذ از کتاب مولانا سندھی اور ان کے ناقد")

مقدمہ (طبع اوّل)

مولانا عبید اللہ سندھی کا پیغامِ انقلاب

(ایک تجزیہ)

گزشتہ جنگ عظیم میں برطانیہ نے ترکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کیا تو اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیلی۔ اس موقع پر مولانا عبید اللہ سندھی کسی نہ کسی طرح سے ہندوستان سے کابل پہنچے یہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔ اس کے پورے چوبیس برس بعد ۱۹۳۹ء میں مولانا واپس وطن لوٹے اور آ کر اپنے اہل وطن کو بتایا[1]

> میں انقلاب کے دینی فلسفہ کا پیغام دینے کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ انقلاب کا میرا یہ پیغام تمہیں لا دینی انقلاب کے مضرت رساں اثرات سے محفوظ رکھ سکے گا۔ محنت کش طبقوں کے ہاتھ میں قوت اور اقتدار کا آنا یقینی ہے۔ تم نے اگر محنت کشوں کے اس انقلاب کو دینی نہ بنایا تو پھر یہ انقلاب حتمی طور پر لا دینی فلسفہ کے ذریعہ ہوگا۔

الغرض چوبیس برس کی جلاوطنی کے بعد مولانا واپس لوٹے تو اس انقلاب کے

---

[1] یہاں پر مقدمہ نگار نے حضرت سندھیؒ کا وہ تاریخی اور معرکۃ الآراء خطاب پورا نقل کیا ہے، جو آپ نے کراچی کے ساحل پر اترنے کے بعد فرمایا تھا۔ چونکہ یہ خطاب اس کتاب میں اپنی جگہ من وعن شائع کیا جا رہا ہے اس لیے اس جگہ حذف کر کے اس کا صرف آخری پیرا یہاں باقی رہنے دیا گیا ہے۔ جو خطاب کا خلاصہ ہے۔ آزاد۔

نقیب اور داعی بن کے لوٹے۔ انقلاب کے اس دینی فلسفہ پر انہیں یقین حاصل ہو چکا تھا کہ یہ لا دینی فلسفۂ انقلاب سے انسانیت کے حق میں زیادہ مفید اور زیادہ پائیدار ہے۔

مولانا نے لا دینی انقلاب کے عملی مظاہر اور اس کے نتائج کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ایک مخالف نہیں بلکہ ایک ہمدرد اور دوست کی نظر سے دیکھا تھا۔ اس لا دینی فلسفہ کے ذریعہ دنیا میں ایک بہت بڑا انقلاب کرنے والوں سے ان کا ربط ضبط بھی رہ چکا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے ان کے دل اور دماغ نے انقلاب کے اس لا دینی فلسفہ کو ہر حیثیت سے بے نقص اور مکمل ماننے سے سختی سے انکار کر دیا۔ بے شک وہ اس لا دینی انقلاب کو دیکھ کر خود اپنے ملک کے لئے اس قسم کے ایک ہمہ گیر کلی اور اپنی پوری وسعتوں کو لئے ہوئے انقلاب کے دل و جان سے حامی تو ہو گئے اور انہوں نے اسی دن سے اس انقلاب کو بروئے کار لانے کے لئے تدبیریں سوچنی شروع کر دیں۔ لیکن وہ کسی طرح بھی اس انقلاب کے لا دینی فلسفہ کے قائل نہ ہو سکے۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ مولانا کا یہ سارا انقلاب کہیں سفرِ روس کے تاثرات کا تو ردِ عمل نہیں۔ اس شبہ کے بارے میں ہم صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ مولانا کی طبیعت، ان کا مزاج، اور جن طبعی عناصر سے ان کے وجود کی ترکیب عمل میں آئی۔ پھر ان کا بچپن کا ماحول اور بعد میں جن بزرگوں سے انہوں نے تعلیم پائی۔ دیوبند چھوڑنے کے بعد سندھ میں جن جن حالات سے ان کو سابقہ پڑا۔ سندھ سے واپس دیوبند آ کر "جمعیت الانصار" کے کاموں کے سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ دیکھا، اور آخر میں افغانستان میں بادشاہی درباروں، امراء اور وزراء کی مجلسوں اور بڑے بڑوں کی زندگیوں سے جو تلخ سبق انہوں نے سیکھا تھا۔ ان کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ روس میں داخل ہونے سے قبل ہی ان تجربات اور مشاہدات نے انہیں شاہ ولی اللہ صاحب کے مشہور تاریخی

خواب کے اس جملے 'فک کل نظام'، 'یعنی اس وقت ہر پرانے نظام کو توڑ دو' کا قائل کر دیا تھا۔ اور وہ ان اثرات کی بناء پر پورے انقلابی بن چکے تھے۔ بے شک وہ روس کے انقلاب سے بھی متاثر ہوئے ہونگے۔ لیکن صرف اس حد تک کہ اس کی مدد سے انہوں نے اپنے انقلابی فکر کو موجودہ حالات کے مطابق ایک منطقی ترتیب دی۔ اور اُسے عمل میں لانے کے لیے راہیں اور طریقے سوچے۔

انقلاب کا یہ پیغام جس کے اب مولانا نقیب بنے، مختصر الفاظ میں ان کی اپنی انقلابی طبیعت، ان کے انقلابی ماحول، اور ان کی انقلابی تعلیم اور برسوں کے تجربات کا لازمی نتیجہ تھا۔ خدانخواستہ مولانا کی یہ دعوتِ انقلاب محض روس کے انقلاب کی صدائے بازگشت نہیں۔ انقلاب کی یہ تڑپ مولانا کے اپنے دل کی گہرائیوں سے اٹھی تھی۔ اور انقلاب کا یہ فکر خود اُن کے اپنے ذہن کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے اس انقلابی فکر کو اپنے علم اور مطالعہ کی بھٹی میں برسوں تک تپایا۔ اپنے تجربات کی روشنی میں اس فکر کے ان پہلوؤں کو جن کی زندگی میں ابدی حیثیت ہے، ہنگامی اثرات سے جدا کیا۔

جب انہیں اپنے اوپر پورا وثوق ہو گیا تو اپنے اہل وطن کے پاس اس انقلاب کا پیغام لے کر آئے اور انہیں بتایا کہ تمہارے محنت کش طبقے لادینی انقلاب کے ذریعے اٹھے تو اس سے تمہارے دین کا جو حشر ہوگا، وہ تو معلوم ہی ہے۔ لیکن اس کا اثر تمہارے قومی وجود کے لیے بھی زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ اس لادینی انقلاب کا مرکز تمہارے ملک سے باہر ہے۔ اگر اس مرکز کے لادینی انقلاب کی رو میں تم بہہ گئے تو اگرچہ یہ مان بھی لیا جائے کہ تم سیاسی طور پر آزاد و خود مختار ہو گے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تم ذہنی طور پر اوروں کے مقلد ہو جاؤ گے۔ تم دوسروں کے الاپے ہوئے راگ گا کر خوش ہو گے۔ زبانیں تو بے شک تمہاری ہوں گی۔ لیکن تم باتیں دوسروں کی کیا کرو گے۔ ان کے حُسن کو حُسن سمجھو گے اور جس

چیز کو کسی وجہ سے انہوں نے بُرا کہا ہے اس کو بے سوچے سمجھے بُرا کہنے لگو گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری اپنی شخصیت تکمیل پذیر نہیں ہو سکے گی۔ اور تمہارا قومی وجود فکر اور عمل کی بھرپور زندگی سے محروم رہے گا۔ اس کی وجہ سے تمہیں اپنے اوپر پورا اعتماد نہ ہوگا۔ تم خود اپنی نظروں میں بے وقر (عزت) ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری تاریخ، تمہاری قومی روایات اور تمہارا علمی و فکری اثاثہ تمہارے لیے دوسرے درجہ کی چیز ہو کر رہ جائے گا۔ اس سے تم دوسری قوموں کے مقابلہ میں سبک سر ہو جاؤ گے۔

آنے والے انقلاب کے ان نتائج بد سے بچنا چاہتے ہو تو خود اپنے قومی ضمیر سے انقلاب کا فکر پیدا کرو۔ اور اس انقلابی فکر کا اپنی تاریخ سے ڈھانچہ بناؤ۔ اس سے یہ ہوگا کہ ایک تو تم دوسروں کی دیکھا دیکھی تقلیداً انقلابی نہیں بنو گے۔ اور دوسرے تمہارا انقلاب تمہارے عام اہلِ وطن کے لیے ایک عجوبہ بن کر نہیں رہ جائے گا۔ بلکہ انقلاب خود تمہارے باطن سے پھوٹے گا۔ وہ تمہارے اپنے طبعی تقاضوں کا نتیجہ ہوگا۔ اس کی شکل اور ھیئت ملک کے حالات اور اسکی روایات کے مطابق ہوگی۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ خود اپنی تاریخ سے انقلاب کی روح اخذ کرو۔ انقلاب کا فکر اور عمل کسی خاص ملک کسی خاص قوم اور کسی خاص مذہب کا اجارہ نہیں۔ انقلاب اتنا ہی ہمہ گیر ہے جتنی کہ خود زندگی ہے۔ تم زندگی کی فعال قوتوں سے انقلاب کا سبق سیکھو۔ اور اپنی تاریخ کے انقلابی ادوار کو اپنا مطمحِ نظر بناؤ۔ جو اس میں غیر انقلابی زمانے دیکھتے ہو انہیں چلتے ہوئے کارواں کی گردِ راہ سمجھو۔

مولانا کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح سے تمہارے ملک میں جو انقلاب آئے گا، مجھے پورا یقین ہے کہ وہ روس کی طرح کا لادینی انقلاب نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ انقلاب نام نہاد مذہب کی مخالفت کرے۔ اور شاید بعض مذہبی طبقے اسے بھی بزعم خود لادینی انقلاب ہی کا نام دیں۔ لیکن یہ انقلاب صحیح معنوں میں مذہب کے اصل مقصد کا ترجمان ہوگا۔ یہ دین

حق کا انکار نہیں کریگا۔ البتہ جو لوگ دین کے نام سے خلق خدا کو لوٹنے کھسوٹنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اُن کے حق میں یہ انقلاب لادینی انقلاب سے کچھ کم سخت گیر نہیں ہوگا۔

مولانا کے نزدیک اس دینی انقلاب کا سب سے بڑا چشمہ قرآن کریم ہے۔ جو تمام الہامی کتابوں کی انقلابی تعلیمات کے اساسی اصولوں کا محافظ اور جامع ہے۔

قرآن کریم کے اس فلسفۂ انقلاب کو معین کرنے میں مولانا کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ دلیلِ راہ بنے۔ شاہ صاحب کی تعلیمات' ان کی حکمت' اور ان کے طریقہ کار کی روشنی میں موصوف نے قرآن کو کُل نوعِ انسانیت کے لیے انقلاب کا ایک پیغام اور سُنت کو اس انقلاب کی عملی تاریخ سمجھا۔ اور ان پر یہ حقیقت کھُلی کہ انسانیت کے پس ماندہ طبقوں کو اٹھانے کے لیے ضروری نہیں کہ انقلاب ہمیشہ لادینی اصولوں پر ہو۔ بلکہ صحیح راہ عمل یہ ہے۔ کہ خدا کے وجود کا انکار کیے بغیر انسانوں میں انقلابی فکر اور انقلابی عمل پیدا کیا جائے۔ انقلاب کا یہ دینی تصور مولانا کے نزدیک محض مسلمانوں کی مذہبی کتاب اور ان کی ملی تاریخ تک محدود نہیں۔ بلکہ اس فکر میں اتنی وسعت ہے کہ انجیل' تورات اور گیتا کے ماننے والے بھی اس قسم کا انقلاب سوچ سکتے ہیں۔

ممکن ہے بعض معترضین یہ فرمائیں کہ ہم کتاب وسنت کے عالم ہیں' شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتابیں ہم نے بھی پڑھی ہیں۔ لیکن جو باتیں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کتاب وسنت کی انقلابی تعلیمات اور شاہ ولی اللہ کی انقلابی حکمت کے متعلق کہتے ہیں' وہ ہمیں تو ان کتابوں میں کہیں لکھی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ آخر یہ معما کیا ہے؟

ان بزرگوں کی خدمت میں ہم یہ عرض کریں گے کہ آپ حضرات کو اس بات سے تو شاید انکار نہ ہوگا کہ مولانا بھی کتاب وسنت کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کی ساری زندگی قرآن مجید کے مطالعہ اور اس کے حقائق کو سمجھنے میں گزری۔ اس راہ میں انہوں نے

کبھی کسی جسمانی تکلیف، اور دماغی مشقت کی پروانہ کی۔

اور آپ کو اس کا بھی علم ہوگا کہ موصوف نے علم حدیث وفقہ کی تحقیق میں بھی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ صرف کیا تھا۔ پھر فلسفہ وحکمت پر بھی وہ غائرنظر رکھتے تھے۔ تصوّف کے تو وہ محض عالم نہ تھے بلکہ انہوں نے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر سلوک کی با قاعدہ منزلیں طے کی تھیں۔ اور اپنے بزرگوں اور استادوں کے ساتھ ان کی عقیدت اور وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ جس مرشد (حافظ محمد صدیق صاحبؒ) نے بچپن میں سب سے پہلے کلمہ توحید کی تلقین فرمائی تھی، زندگی کے آخری دنوں تک جب بھی اس مرشد کا نام ان کی زبان پر آتا تو فرطِ محبت میں مولانا پر رقت طاری ہو جاتی۔ آنکھیں بے اختیار پرنم ہو جاتیں۔

جس استاد (حضرت شیخ الہندؒ) سے انہوں نے کتاب وسنت کی تعلیم پائی تھی۔ اس پاک نفس بزرگ کے ارشادات کی تعمیل میں انہوں نے اپنی ساری زندگی جان جوکھوں میں کاٹی۔ وطن سے بے وطن ہوئے، پردیس میں مارے مارے پھرے۔ ذلتیں برداشت کیں۔ بھوکے رہے۔ کوڑی کوڑی کے محتاج ہوئے۔ اس استاد سے ان کی فریفتگی کا یہ حال تھا کہ آخر وقت میں بسترِ مرگ پر پڑے ہیں۔ اور جب جان لینے والا فرشتہ آ کر دستک دیتا ہے تو انہیں اپنے مرحوم ومغفور استاد کے نام کو زندہ رکھنے کے سلسلہ میں ''یادگار شیخ الہند'' اور ''محمود نگر'' کے متعلق تدبیروں میں مصروف پاتا ہے۔ کتاب وسنت کے مطالعہ وتحقیق سے اتنی وابستگی اور ان کی تعلیم دینے والوں سے زندگی کی آخری ساعت تک اس قدر شیفتگی اور عقیدت۔

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے متعلق جو شخص الزام تراشی کرتا ہے سچی بات یہ ہے کہ وہ مولانا کے مزاج اور اُن کی طبیعت سے بالکل ناواقف ہے۔ ورنہ اگر مولانا کی زندگی پر اُس کی نظر ہوتی تو وہ بآسانی سمجھ لیتا کہ مولانا کی طبیعت والے آدمی کے لیے سالہا

سال تک اس طرح کی دوُرخی زندگی گزارنا نہ ممکن تھا اور نہ انہیں اس کی مطلق ضرورت تھی۔ وہ خدانخواستہ اگر کتاب وسنّت کو خیر باد کہہ کر حقیقۃً دوسری وادی میں قدم رکھ چکے ہوتے تو وہ اس کا کھلے بندوں اعلان کرتے۔اس کے صلے میں ایک دنیا اُن کی پیشوائی کو آگے بڑھتی اور عظمت اور قیادت اُن کے قدم چومنے کو حاضر ہوتی۔

اگر وہ ایسا کرتے تو ہمارے خیال میں اُنھیں اس میں زیادہ دقت بھی نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر بچپن ہی میں دنیا کی سب سے بڑی متاع یعنی بیوہ ماں کی محبت' جاں نثار بہنوں کی عقیدت اور گھر کا آرام اور سُکھ چھوڑ چکے تھے۔اور اس کے بعد بھی بارہا اپنے ذہن اور عمل کی یک رُخی کی خاطر انہوں نے بڑے بڑے مناصب سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ انھوں نے زندگی میں اشارۃً بھی کبھی کتاب وسنت سے اپنی ذراسی بے تعلقی کا اظہار نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کے خلاف ان کی زندگی کے آخری دنوں میں راقم السطور جب خدمت میں حاضر ہوا تو وصیت کے طور پر اُسے فرمایا کہ

> ''قرآن کی محبت دل میں جاگزیں کرواُسے اپنے فکر وعمل کی اساس بناؤ۔اور پھر زندگی کے مسائل کو سوچو' سمجھو اور ان کو سلجھاؤ۔ ہوا یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے پہلے تو قرآن کی جلدیں باندھیں۔ پھر اسے غلافوں میں لپیٹا۔ہم ان غلافوں کو چاک کرنا چاہتے ہیں۔ہم ان جلدوں کو پھاڑ دیں گے تا کہ قرآن جیسا وہ ہے لوگوں کے پاس پہنچے' اپنی اصلی شکل میں' بالکل واشگاف اور بے نقاب' لوگ اسے پڑھیں اور اپنی زندگی میں اُسے مشعلِ راہ بنائیں۔''

ہماری ان معروضات کے باوجود اہل علم کا ایک ایسا گروہ پھر بھی موجود رہے گا جو اس بات پر مُصر ہوگا کہ مولانا کے انقلابی فکر اور ان کی انقلابی تعلیمات کی سند ہم کتاب و سنت کے صحائف میں نہیں پاتے۔

ان واجب الاحترام اہل علم کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ نے اور سب لوگوں

نے دیکھا ہے کہ مولانا جو کچھ فرماتے اور لکھتے تھے' اس میں ایک بات کا وہ بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کا دستور یہ تھا کہ کتاب وسنت کے حوالے سے جو بات بھی کہتے' اس کے ساتھ ہی یہ ضرور بتادیتے کہ یہ نتیجہ میں نے شاہ ولی اللہ صاحب کی فلاں کتاب کی فلاں عبارت سے استنباط کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی بات کہتے جس کے لیے انہیں شاہ صاحب کی کتابوں سے سند نہ ملتی تو صراحت کر دیتے کہ یہ میرا ذاتی اجتہاد ہے میں اس کو منوانے کے لیے مُصر نہیں۔ جو چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔

ہمارے خیال میں آپ حضرات کو اس بات سے تو شاید انکار نہ ہوگا کہ مولانا عبید اللہ صاحب' شاہ ولی اللہ کے علوم اور ان کی حکمت پر بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ولی اللہی علوم ساری عمر ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہے۔ اس سلسلہ میں مجلّہ ''الفرقان'' (بریلی) کے صفحات پر مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کا یہ ارشاد گرامی ہم نے دیکھا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:۔

> ''مولانا سندھی کے مضمون کو میں نے بغور پڑھا۔ اور اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ بے شک مولانا کی نظر حضرت شاہ صاحب کے فلسفے اور نظریات پر نہایت وسیع ہے۔''

اس کے علاوہ الفرقان کی اسی اشاعت میں مولانا منظور صاحب نعمانی نے بھی مولانا کے متعلق لکھا تھا۔

> ''ولی اللہی حکمت پر مولانا کی نظر کس قدر گہری ہے اور شاہ صاحب کے علوم ومعارف کا انہوں نے کس قدر عمیق مطالعہ فرمایا ہے۔''

قارئین خود ہی انصاف فرمائیں کہ ان شہادتوں کے بعد کسی صاحب کا یہ کہنا کہ مولانا سندھیؒ خدانخواستہ شاہ صاحب کو سمجھ نہیں سکے۔ یا انہوں نے جان بوجھ کر شاہ صاحب

کی باتوں کا غلط مطلب لیا۔ کس قدر ظلم ہوگا۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ بعض اہل علم یہ کہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحب ہمارے لیے حجت نہیں۔ ہم تو کتاب وسنت کو براہِ راست مانتے ہیں۔ ہمیں تو صرف کتاب وسنت کی سند چاہیے۔ ان اہل علم سے ہم یہ عرض کریں گے کہ اگر واقعی آپ لوگوں کا نقطۂ نظر یہی ہے جو آپ نے ابھی فرمایا تو آپ یقین کریں کہ مولانا کو خود اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ آپ کے مسلک کے اہل علم حضرات کو اپنی بات منوانے سے قاصر ہیں۔ آپ بڑی خوشی سے صرف کتاب وسنت کو اپنا دلیل راہ بنایئے۔ اور آپ کو پوری اجازت ہے کہ اس سلسلہ میں کسی عالم اور محقق کو واسطہ نہ مانیے۔

جہاں تک مولانا کی دعوت کا تعلق ہے۔ وہ تو صرف اُن اہل علم کو اپنا مخاطب بناتے تھے، جو ان کی طرح شاہ ولی اللہ اور ان کے سلسلہ کے استادوں کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں۔ مولانا دیوبندی تھے۔ اور ہندوستانی علماء کی دیوبندی جماعت کی طرف ہی اس معاملہ میں زیادہ تر ان کا روئے سخن رہا۔ بے شک ''علمائے اہل حدیث'' کے بارے میں بھی کبھی کبھی وہ کچھ فرمایا کرتے تھے۔ لیکن اس سلسلہ میں صرف وہ اتنا کہتے کہ آپ لوگ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کو تو مانتے ہیں۔ لیکن جس سرچشمہ سے ان دونوں بزرگوں کو فیض ملا اور جس تحریک کے یہ دو اولوالعزم رکن تھے، تم نے اس کی صحیح اہمیت سمجھنے کی کوشش نہ کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تم باہر کے افکار اور حالات سے متاثر ہو کر غلط فہمی میں پڑ گئے۔ اور تم نے ولی اللہی تحریک کی بجائے جو دیوبندی اور اہل حدیث دونوں جماعتوں کا اصلی مرجع اور مدار تھا یمنی اور نجدی تحریکوں کو اقرب الی الصواب بنا لیا۔ جس کی وجہ سے تقلید اور عدم تقلید کے بے معنی اور بے نتیجہ جھگڑے پیدا ہو گئے اور دونوں گروہوں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی، نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے اور تمہارے دونوں کے بزرگوں کی برسوں کی محنتیں اور قربانیاں

یوں ہی رائگاں گئیں۔ اور گزشتہ صدیوں میں شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید رضوان اللہ علیہم نے اس ملک میں اسلام کو ایک زندہ، فعّال اور صاحب اقتدار قوت بنانے کے لیے جو جدوجہد کی، اس کی صحیح اہمیت ہم نے نہ سمجھی۔

............................o............................

مختصراً مولانا تو اس خاص معاملے میں کتاب اور سنت اور شاہ ولی اللہ کے نام سے علماء کی صرف ان جماعتوں کو دعوت دیتے ہیں۔ جو مولانا کی طرح کتاب وسنت کو تو مانتے ہی ہیں۔ لیکن کتاب وسنت کو سمجھنے کے لیے شاہ ولی اللہ اور ان کے سلسلے کے استادوں کو بھی اپنا واسطہ بناتے ہیں۔ اب جو لوگ شاہ صاحب اور ان کے سلسلہ کے واسطے کے سرے سے قائل ہی نہیں، ظاہر ہے مولانا کے لیے ان کو اپنی بات سمجھانا بڑا مشکل ہے۔

لیکن اگر اہل علم کے اوپر کے گروہ ہی میں سے کوئی صاحب یہ کہیں کہ ہم نے کتاب وسنت کو پڑھا ہے اور شاہ صاحب کے علوم کا بھی احاطہ کیا ہے لیکن اس کے باوجو ہمیں قرآن کی انقلابی تعلیم اور شاہ صاحب کی انقلابی حکمت کا کہیں سر پتہ نہیں ملا تو اس کے جواب میں مجبوراً یہی عرض کرنا پڑے گا کہ محترم بزرگو! پڑھنے پڑھنے میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے بے شک آپ نے یہ سب کچھ پڑھا، ہمیں اس سے مجالِ انکار نہیں لیکن آخر اس سے بھی تو انکار نہیں ہوسکتا کہ مولانا نے بھی کتاب وسنت کو پڑھا تھا۔ اور انہوں نے جیسا کہ سب کو تسلیم ہے شاہ صاحب کی حکمت پر برسوں غور کیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ مولانا اپنے مطالعہ وفکر کے ذریعہ جن نتائج اور حقائق تک پہنچے آپ کیوں ان تک نہیں پہنچ سکے تو اس ضمن میں ہماری صرف اتنی گزارش ہے کہ مثال کے طور پر آپ انسان کی نظر کو لیجیے۔ نظر کا کام دیکھنا ہے اور بالعموم ایک آدمی کی نظر دوسرے آدمی کی نظر سے اپنی طبعی خصوصیات میں زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔ لیکن یہ تجربے کی بات ہے

کہ ایک چیز کو ایک وقت میں دو آدمی دیکھتے ہیں تو ایک خوشی اور انبساط سے بھر جاتا ہے اور دوسرے پر درد و کرب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی آدمی ایک وقت میں ایک چیز کو مرغوب اور دل کش پاتا ہے اور دوسرے وقت میں یہی چیز اُسے مکروہ لگتی ہے۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ جب انسانی نظر جیسی مادی چیز کا یہ حال ہے کہ مختلف حالات و کوائف میں اس کے اثرات اس قدر مختلف ہو سکتے ہیں تو فرمایئے جب معاملہ ہو الگ الگ طبیعتوں کا' جُدا جُدا خاندانی حالات کا۔ پھر ایک دوسرے کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہو۔ بعد میں ایسے حالات رونما ہوں کہ ایک تو جس فضا میں اس نے جنم لیا ہو اسی میں اطمینان سے اپنی زندگی گزار دے اور دوسرے کو ساری عمر زمانے کے طرح طرح کے انقلابات سے سابقہ پڑے کیا اس صورت میں ان مختلف اشخاص کی معنوی زندگی میں بہت بڑا فرق نہیں ہوگا۔ اور یہ لوگ مشاہدہ اور نظر کی حد سے آگے بڑھ کر جب مطالعہ و فکر کی حدوں میں داخل ہونگے تو کیا یہ یقینی امر نہیں کہ ایک کی فکری جستجو اور قلبی بصیرت ایک ہی کتاب کے مطالعہ سے اس پر حقائق و معارف کی ایک وسیع دنیا بے حجاب کر دے۔ اور دوسرے کی نظر الفاظ کے ٹھوس مفہوم سے آگے نہ بڑھ سکے۔

ہماری تاریخ میں اب تک ایسا ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا۔ اسلام کے مابعد الطبیعاتی مسائل میں یہ ہوا ہے۔ اور خود احکام کے فرقِ مراتب پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ اس بناء پر علم کلام کے مختلف خیال بنے۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ متعدد فقہی مذاہب وجود میں آئے۔ حنابلہ نے تاویل کی مطلق ممانعت کر دی۔ بعض ائمہ نے تاویل کی مشروط اجازت دی۔ معتزلہ کا فرقہ پیدا ہوا۔ اشعریہ نے اپنا علم کلام بنایا۔ اور ماتریدی خیال والوں نے اپنا نظام فکر مرتب کیا۔ بے شک ان سب کی اساس کتاب و سنت تھی۔ اور سب نے ''محکمات''

ہی پر اپنے علم وفکر کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر صاحب نظر کو اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق ہی دین کے اسرار اور حقائق معلوم کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔

شاید بے محل نہ ہو اگر ہم شاہ ولی اللہ صاحب کی سب سے مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ابتدائی مقدمہ کی ایک عبارت کا ایک مختصر سا خلاصہ یہاں پیش کر دیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے مسئلہ زیر بحث کی زیادہ وضاحت ہو سکے گی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

''علوم یقینی اور فنون دینی کا اصل الاصول علم حدیث ہے یہی مشعل ہدایت ہے۔ اور اسی سے دین کی صحیح راہ ملتی ہے۔ لیکن علماء حدیث کے مختلف طبقے ہیں۔ اور ان کے متعدد مراتب ہیں۔ اس علم کے چھلکے ہیں جن کے اندر بیج ہیں۔ اور اس کی سیپیاں ہیں، جن میں موتی ہیں۔ اس علم کو بڑے بڑے اہل فضل وکمال نے موضوع بحث بنایا۔ اس میں پہلا درجہ تو ان محدثین اور حفاظ کا ہے جنہوں نے صحیح اور ضعیف، متواتر اور غریب حدیث کی نظر سے اس علم پر بحث کی۔ یہ پہلا قدم ہے ظاہر سے اس علم کے باطن کی طرف جانے کا۔ اور چھلکے سے گودے تک پہنچنے کا۔ دوسرا درجہ احادیث کی لفظی اور معنوی تشریح اور توضیح کا ہے۔ اس موضوع کو عربی زبان وادب میں دستگاہ رکھنے والوں نے خاص کر لیا۔ اس کے بعد احادیث سے شرعی مسائل اور جزوی احکام استنباط کرنے کا درجہ ہے۔ اسی کو عام علماء نے لب لباب اور حاصل مقصد سمجھا۔ اور محقق فقہاء اس کی بحث میں لگ گئے۔

لیکن میرے نزدیک حدیث کا بحیثیت مجموعی دقیق ترین علم، جو اپنے معانی میں سب سے عمیق، نورِ ہدایت میں سب سے ارفع اور شرعی علوم میں سب سے افضل ہے وہ اسرار دین کا علم ہے جس کی مدد سے احکام دین کی حکمت معلوم ہو اور ان کی حقیقت کا پتہ چلے۔ اور دینی اعمال کے خواص اور ان کے نکات کو سمجھا جائے، خدا کی قسم! یہ ہے وہ علم جس

میں دوسرے سب علوم سے زیادہ آدمی اپنے قیمتی وقت کو صرف کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جن اطاعتوں کو ہم پر فرض کیا ہے ان کو ادا کرنے کے بعد اس علم کی تحصیل کو اپنی آخرت کے لیے زادراہ بنائے۔" (مقدمہ حجۃ البالغہ)

مولانا جب اپنے طلبہ کو "حجۃ اللہ" کی یہ عبارت پڑھاتے تو اس علم کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے اکثر یہ فرمایا کرتے کہ ایک زمانے میں مسلمانوں کی اپنی حکومت تھی۔ ان کی سلطنت کا دبدبہ تھا۔ ان کے بازوؤں میں قوت اور ان کے اخلاق میں پختگی تھی۔ ان کی قومی جمعیت بنی ہوئی تھی۔ اور اُن کا قانون حاکم اور نافذ تھا۔ اس لیے اسرار دین کو سمجھنے اور ہر خاص و عام کو ان حکمتوں سے واقف کرانے کی علماء نے اس وقت زیادہ ضرورت محسوس نہ کی لیکن آج نقشہ ہی دوسرا ہے۔ نہ حکومت باقی رہی۔ نہ سلطنت کا دبدبہ جمعیت بھی کی مفقود ہوگئی۔ قانون کا عمل دخل نہیں رہا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انتشار آخری حد تک پہنچ چکا ہے۔ اور تو اور اب تو خود ہمارا دین اغیار کے نرغے میں ہے اور اس پر ہر طرف سے اور ہر طرح کے حملے ہو رہے ہیں۔ اور ڈر یہ ہے کہ جس طرح ہماری قومی جمعیت توڑ دی گئی ہے اسی طرح خدا نہ کرے کہیں ہمارے دین کو گزند نہ آ جائے۔ چنانچہ آج اس زمانے میں تو اہل علم کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ دین اسلام کی حکمتوں کو سمجھیں۔ اور غیر تو ایک طرف رہے خود اپنوں کو ان کے دین کی یہ حکمتیں سمجھائیں۔ کیوں کہ اب تو نوبت اس کی آ رہی ہے کہ کہیں مسلمان خود ہی اسلام سے خدانخواستہ دل برداشتہ نہ ہو جائیں۔

اتنا کہنے کے بعد مولانا موصوف قدرے توقف فرماتے اور پھر رُک رُک کر آہستہ سے کہتے کہ اس معاملہ میں میرا اپنا یہ حال ہے کہ شاہ صاحب کے اس ارشاد کے مطابق میں نے شروع زندگی سے فرائض کے بعد اسی شعبۂ علم کی تحصیل اور اسی کے مطالعہ کو

اپنی تمام محنت وجستجو کا موضوع بنائے رکھا ہے۔اور عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اسلام کے اصول وقواعد کے اسرار خود سمجھوں اور ان کے حقائق سے دوسروں کو بھی آگاہ کروں۔

اسرار دین کی جستجو اور احکام اسلام کی حکمت کی تلاش۔ مولانا کا انقلابی فکر دراصل نتیجہ ہے اُن کے اسی دینی جذبے کی برسوں کی سخت اور پیہم جدو جہد کا۔

لیکن کہنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بھی اسرار دین کی جستجو کی ہے۔ پر ہمارا منتہائے نظر تو وہ نہیں جس پر مولانا اپنی بحث وتحقیق میں پہنچے۔

سو بات یہ ہے کہ حضرات! آپ لوگوں کی تو کیفیت یہ ہے کہ خیر سے آپ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے ۔ ہوش سنبھالا تو اردگرد سب کو ایک طرح کی زندگی گزارتے اور ایک طرح سوچتے دیکھا۔ بڑے ہوئے تو دیکھا دیکھی باپ دادوں کی روش پر چلنے لگے۔ آبائی علم پڑھا۔ بڑے بوڑھوں کی عادتیں سیکھیں۔ خاندانی حالات سازگار ہوئے تو ساری زندگی ایک ہی ڈھرے پر گزار دی۔ اور کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ اپنے خیالات اور عقائد واعمال پر جرح کریں۔ اتفاق سے اگر کسی میں علم اور مطالعہ نے مذہبی جستجو کا شوق پیدا کیا تو اس نے اپنے خاندانی عقائد واعمال میں کرید شروع کر دی۔ اس کے بعد اکثر تو ایسا ہوا کہ آپ بحث وتحقیق میں تھوڑی دُور پیچھے جا کر کسی اور عالم اور بزرگ کی تاریخی عظمت سے مطمئن ہو گئے۔ اور آپ کو اپنے افکار وخیالات میں اپنے خاندان سے باہر جانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ لیکن اگر حوصلہ بلند ہوا اور ذہن کی کاوش نے زیادہ بے چین کیا تو فقہی تقلید کی جکڑ بندیوں سے نکل کر اہل حدیث میں جا ملے۔ یا اور ہمت کی تو فقہ اور حدیث دونوں سے دامن چھڑا لیا اور قرآن کو اپنا مدار مان کر دل کو تسکین دے لی۔

بے شک آپ حضرات کے ”علم اور مطالعہ“ کی ہمارے دلوں میں کچھ کم قدر

نہیں۔لیکن معاف فرمایا جائے !اگر ہم یہ عرض کریں کہ آپ کی اس قبیل کی تحقیق اور تدقیق اکثر تقلیدی ہوتی ہے۔آپ کو آباؤ اجداد سے جو نظر ورثہ میں ملی تھی۔آپ نے اسی نظر سے اپنے گرد و پیش کی دنیا کو دیکھا۔اسی نظر سے اپنی تاریخ کا مطالعہ کیا۔اور اپنے علوم وفنون کو بھی آپ نے اسی نظر سے پڑھا۔غرضیکہ آپ کی یہ ساری تگ ودو اور کاوش وجستجو اپنی محدود دنیا میں محصور رہی۔

یہ صحیح ہے کہ اس محدود نظر کے ساتھ اسلام اور تاریخ اسلام کے مطالعہ سے جو نتائج برآمد ہوں گے ان کی حیثیت بالکل جدا ہوگی،اس شخص کی بحث و تحقیق کے نتائج سے، جس کے ذہن میں سب سے پہلے اسلام کا تصور آیا ہو تو اس شکل میں کہ اگر اسلام کے پیش کردہ ''الـلـه'' کو مانتے ہو تو سب سے پہلے ''اله'' کا انکار کرو۔چنانچہ جب اس نے اسلام کا کلمۂ شہادت پڑھا ہو تو وہ واقعتہً ''الــه'' کا انکار کر چکا ہو۔ اور پھر اس کے بعد اپنی تمام زندگی میں ''الا الـلـه'' کی راہ میں جہاں بھی اس نے کسی ''الـه'' کو حائل پایا تو وہ ''الـه'' کو ترک کرنے کے بعد ''الا اللہ'' کی طرف بڑھا۔ظاہر ہے ''لا الـه الا اللہ' کے یہ معنی جو مولانا سمجھے تھے ان لوگوں کے تصور توحید سے کتنے مختلف ہوں گے۔جنہیں اپنی زندگی میں کبھی کسی ''الــه'' کو ترک کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔کلمۂ توحید کے بارے میں مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ''میرے نزدیک تو اقرار باللہ سے پہلے غیر اللہ کا انکار لازمی ہے۔اور اسی غیر اللہ کے انکار کی عملی جدوجہد کو میں جہاد کہتا ہوں''۔چنانچہ مولانا مسلمان ہوئے تو اسلام کا یہ مفہوم سمجھ کر مسلمان ہوئے کہ وہ عقیدہ میں توحید خالص اور عمل میں جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ توحید اور اس طرح کا جہاد' مولانا کے نزدیک یہ دو اساس تھے اسلام کی تعلیمات کے۔اور اسی اسلام کی کشش تھی جس نے آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے اُن سے گھر بار چھڑایا تھا۔اور اسی اسلام کو خارج میں متمکن اور حاکم بنانے میں انہوں نے اپنی

زندگی کو وقف کر دیا۔ ورنہ خدانخواستہ اگر معاملہ دوسرا ہوتا اور بعض علمائے کرام جس قسم کے اسلام کو آج سرمایۂ افتخار بنائے ہوئے ہیں، مولانا کو بھی اسی اسلام کی دعوت ملتی تو شاید وہ بھی بغداد کے اس یہودی کی طرح جس کو حضرت جنیدؒ کے زمانے میں اسی قسم کی دعوت دینے والوں نے مسلمان ہونے کو کہا تھا، یہی جواب دیتے کہ معاف فرمایئے۔ آپ حضرات سے تو میں ''غیر مسلم'' ہی اچھا ہوں۔

مولانا کے ان معترضین کو معلوم ہونا چاہئے کہ حُسنِ اتفاق یا سوءِ اتفاق سے مولانا کے حالات کچھ ایسے تھے کہ موصوف نے آپ حضرات کی طرح کتاب و سنت کو اپنے مخصوص خاندانی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا۔ اور پھر وہ آپ لوگوں کی طرح بزرگوں کی تقلید میں مسلمان نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے خود تحقیق کی۔ اور جب اسلام کو اپنے آبائی دین سے بہتر پایا تو مسلمان ہوئے۔ اس کے بعد واقعات ایسے پیش آئے کہ اُن کا مطالعہ آپ کی طرح صرف اپنی تاریخ اور خاص اپنے علوم تک محدود نہ رہا۔

اور مزید اتفاق یہ ہوا کہ ان کو زندگی میں ایسے حالات سے سابقہ پڑا جن کی وجہ سے انہیں کئی ملکوں۔ کئی قوموں اور کئی مذاہب کی تاریخ اور ان کے ماضی و حال کے نشیب و فراز کو بامعانِ نظر دیکھنا پڑا۔

جب صورت یہ ہو کہ دماغ میں توحید کا عقیدہ اور دل میں جہاد کا جذبہ ہو۔ نظر و فکر میں آفاق بینی اور آفاق گیری کے تجربات سمائے ہوئے ہوں۔ اور پھر اپنی پوری زندگی سرتا پا عمل، بے لوث اور بے ریا، مال و دولت سے بے نیاز اور ہر رشتہ و پیوند سے آزاد رہی ہو تو جو شخص ان باطنی کیفیات کے ساتھ کتاب و سنت اور ولی اللہی علوم و معارف میں غوطہ زن ہو گا تو ظاہر ہے وہ ان میں جو کچھ پائے گا۔ اس سے ان اہل علم کی تحقیقات کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ جنھوں نے اسلام کو آباء پرستی کے ضمن میں اپنایا۔ اور جب اس کی خدمت کرنے نکلے

تو اپنے دل و دماغ کو جاہ منصب کی ہوس سے آزاد نہ کر سکے۔ توحید کا دم بھرا لیکن امراء اور نوابوں کی شان میں قصیدے لکھے۔ جہاد کا نام لیا لیکن تلوار تو ایک طرف رہی کبھی اپنی زبان یا قلم کو بھی راہ حق میں حرکت دینے کی جرات نہ ہوئی۔ شہرت عامہ ان کے مقصود نظر رہی اور ''قربِ سلطانی'' کو انہوں نے منتہائے کمال بنائے رکھا۔

اہل علم کا یہ طبقہ اگر مولانا پر خفا ہے' اور ان کے افکار و تعلیمات کو اسلام کے خلاف قرار دیتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کو اسلام واقعی اسی شکل میں نظر آتا ہو' لیکن انصاف شرط ہے کہ اس معاملہ میں مولانا کا کیا قصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کتاب و سنت کے نام سے جو کچھ کہتے ہیں ان کے دل اور دماغ پر کتاب و سنت کے مطالعہ سے واقعتہً یہی کیفیات گزری ہیں۔ اور شاہ ولی اللہ کی انقلابی حکمت کا جب وہ نام لیتے ہیں تو یہ سچ ہے کہ انھوں نے اس حکمت کو اسی طرح سمجھا ہے۔ اب یہ فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ ہمارے لیے ان بزرگوں کے فہم و بصیرت کا حاصل قابلِ قبول ہونا چاہئیے یا مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے فکر و نظر کے نتائج۔

مولانا کے نزدیک توحید کا عقیدہ زندگی کی ایک زندہ اور فعال قوت تھی اور ہمارے ان علماء نے اسے علم کلام کا ایک مسئلہ بنا دیا ہے۔ مولانا نے توحید کو مانا تو غیر اللہ کے خلاف معرکہ آرا ہونا ضروری سمجھا۔ اور یہ حضرات توحید کا سبق برسوں پڑھاتے ہیں لیکن کبھی اپنے اندر جذبہ کردار کو متحرک محسوس نہیں کرتے۔ مولانا کی نظر میں توحید فکر و عمل کے لیے انقلاب کا حکم رکھتی تھی۔ اور یہ لوگ توحید کے عقیدہ کے ساتھ جمود اور بے عملی کو بیک وقت جمع کر لیتے ہیں۔

اسی بنا پر مولانا اسلام کی ساری تاریخ میں عقیدہ توحید کا بہترین عملی مظہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کے مبارک زمانے کو سمجھتے ہیں۔ جس میں عمارؓ بن یاسر

اور بلالؓ جیسے غلام، مصعبؓ وسعدؓ وسعیدؓ جیسے نوجوان، اور ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ جیسے حسب و نسب والے حضرات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے توحید کا سبق پڑھ کر اپنے سرکش اور ظالم آقاؤں کو کچلتے' اپنے مشفق ومہربان ماں باپ کو خیر باد کہتے اور اپنے عزیز واقارب کو قتل کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اسی عقیدۂ توحید کا اعجاز تھا کہ انہوں نے پرانے فرسودہ نظام کو ختم کر کے ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھی۔ اور اپنے فکر وعمل سے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ مولانا قرآن مجید کی آیاتِ جہاد کو بدر، واُحد، وخندق، کے معرکوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے پڑھتے ہیں۔ آپؐ کے مکی ومدنی دور کو سامنے رکھ کر قرآن کے احکام وقواعد کو سمجھنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ اور اُس مبارک عہد کا نقشہ اپنے دل ودماغ میں تازہ کر کے کتاب و سنت سے ہدایت طلب کرتے ہیں جب مسلمانوں کی زندگی سرتاپا انقلاب تھی

"جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ" کا نعرہ ان کی زبانوں پر تھا اور ان کے ہاتھوں سے قیصر وکسریٰ کی سلطنتیں پاش پاش ہو رہی تھیں۔ یہ انقلابی زمانہ' صحابہؓ کی یہ انقلابی سیرتیں اور ان کا یہ انقلابی کردار مولانا کے نزدیک قرآن کی دعوت کا یہ ایک نمونہ تھا جو اسلام کے قرن اوّل میں متشکل ہوا۔ اور ہر ہر زمانے میں اسی انقلاب کو بار بار بروئے کار لانا قرآن کے ماننے والوں کا فرض ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کے مطالعہ نے ہندوستانی مسلمانوں کی اس دور کی دو بڑی شخصیتوں پر ایک ہی اثر ڈالا۔ اقبال مرحوم نے "جاوید نامہ" میں جمال الدین افغانی کی زبان سے ملتِ روسیہ کے نام جو پیغام دیا ہے اُسے پڑھیے اور پھر مولانا کے ان افکار وخیالات کا مطالعہ کیجیے۔ یہ دونوں کے دونوں بزرگ اس بات میں متفق ہیں کہ اسلام ایک عالم گیر انقلاب کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اور "لا قیصر ولا کسریٰ" کو اس نے ابتدائی زمانے میں متحقق بھی کر دیا۔ ممکن ہے چند علماء علامہ اقبال اور مولانا عبید اللہ

سندھی دونوں پر شواذ کا حکم لگائیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری قوم کے ان دو اہل بصیرت نے جو چیز بہت دور سے آتے دیکھی تھی وہ اب بہت قریب آ چکی ہے۔ خدا نہ کرے کہ ہم بے خبری کے عالم میں ہوں۔ اور وہ ہمیں آ لے۔ اس لیے اگر اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی مقصود ہے تو خدا کے لیے مولانا عبیداللہ سندھی اور علامہ اقبال کی صداؤں کو گوشِ ہوش سے سنیے اور قرآن کی انقلابی دعوت کی راہ میں روک نہ بنیے۔

ہماری ان طول طویل معروضات کے بعد بھی اگر کوئی صاحب مولانا کے اسلام کو مجالِ بحث بنانے پر مصر ہوں۔ اور قرآن کی توحید اور اس کی دعوت جہاد سے جو کچھ موصوف سمجھے اس کے تسلیم کرنے میں انہیں بدستور تامل ہو۔ تو ہم ان کی خدمت میں بدرجہ مجبوری علامہ اقبال کے یہ شعر پیش کر کے انہیں قائل نہ کر سکنے کا اعتراف کرتے ہیں۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

وہ رمزِ شوق جو پوشیدہ لاالہ میں ہے
طریق شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے

سُرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے

جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے

انقلاب کے ان بلند عزائم کے ساتھ مولانا واپس وطن لوٹے۔ جہاں تک انقلاب کے فکر کے نظری پہلوؤں کا تعلق تھا۔ یقیناً مولانا اس ضمن میں قطعی نتائج پر پہنچ چکے

تھے لیکن اب سوال درپیش تھا انقلاب کو بروئے کار لانے کا۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی سیاسی فکر کو ایک ملک میں عملی شکل دینے کے لیے ضرورت پڑتی ہے۔ اس ملک کے خاص حالات اور اس کے ماحول کے مخصوص تقاضوں کے مطابق اس سیاسی فکر کے عملی مراحل کو درجہ بدرجہ طے کرنے کی ۔ ایک جست (چھلانگ) میں تمام قصہ طے کر دینا۔ فکر میں تو البتہ ممکن ہے لیکن عمل کی دنیا میں ایسا شاذ و نادر ہی دیکھا گیا ہے۔ اور اگر بفرض محال ایسا ہو بھی جائے تو اس کا ردعمل خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انقلاب کا جذبہ ایک فوری اور پوری قوت کے ساتھ اقدام چاہتا ہے اور خود انقلابی کی طبیعت بھی بڑی بے چین اور مضطرب ہوتی ہے ۔ پر بات یہ ہے کہ ایک انقلابی انتظار بھی کر سکتا ہے۔ اور وہ اپنی طبیعت پر اتنا قابو ضرور رکھتا ہے۔ کہ وہ ایک انارکسٹ کی طرح اپنے فکر و عمل کی انقلابی قوتوں کو بے راہ رو نہ ہونے دے۔

مولانا انقلابی تھے اور صحیح معنوں میں ایک سچے انقلابی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انقلاب ایک فرسودہ نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک بہتر اور زیادہ مفید نظام کو برسر کار لانے کا نام ہے۔ اور ظاہر ہے پُرانے نظام کی تخریب اگر آسان بھی ہو لیکن نئے نظام کی تعمیر اور اس نظام کو چلانے والوں کی تربیت میں ایک عرصہ لگتا ہے۔

مولانا ۱۹۳۹ء میں جب وطن لوٹے ہیں۔ تو کافی بوڑھے ہو چکے تھے ان کے قوی میں بھی اضمحلال آ چکا تھا۔ اور ان کو اس بات کا بھی پورا احساس تھا کہ ان کے چل چلاؤ کا زمانہ اب زیادہ دور نہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے ضبط و نظم کی یہ حالت تھی کہ اس عمر میں اور اس قدر مایوسیوں اور ناکامیوں میں گھرے ہوئے انہوں نے گھبراہٹ اور جلد بازی میں یہ نہیں کیا کہ ان کے پیش نظر انقلاب کو عملی جامہ پہننے کے لیے جن تمہیدی

کاموں اور ابتدائی تیاریوں کی ضرورت تھی، وہ اُن سے اپنی طبیعت کے انقلابی جوش میں آنکھیں بند کر لیتے۔ مولانا اس عالم میں بھی اس طویل راہ کو نہیں بھولے۔ جس پر چلے بغیر ہندوستان کے لیے اس زمانے میں اور موجودہ حالات میں کسی انقلاب کا سوچنا ایک حد تک محال ہے۔ ہاں اس معاملہ میں مولانا یہ ضرور چاہتے تھے کہ اس طویل راہ کو انقلابی ذہنیت اور انقلابی عمل کے ساتھ جتنی جلد ہو سکے، قطع کرنے کی کوشش کی جائے۔

آج کل ہندوستان کی حالت یہ ہے کہ اس پر برطانیہ جیسی زبردست یورپی طاقت کا قبضہ ہے۔ جو ملک کے تمام سیاسی اور معاشی وسائل پر پوری طرح مسلط ہے۔ لڑنے والی فوجیں گو ہندوستانی ہیں لیکن ان کے افسر سارے کے سارے انگریز ہیں۔ دفتری حکومت بہت حد تک ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے، لیکن حقیقی اقتدار دراصل اعلیٰ عہدہ داروں ہی کے پاس ہے۔ جو زیادہ تر برطانی ہیں، بے شک اہل ہند کے بیدار طبقوں کی طرف سے اجنبی تسلط کے خلاف ایک عرصہ سے بڑے زوروں پر کوشش ہو رہی ہے، اور اس کا اتنا اثر بھی ہوا ہے کہ برطانی حکومت کی آہنی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ اور برطانیہ والے مجبوراً ہندوستان کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ جہاں تک ہندوستانی جمہور اور یہاں کی ہندوستانی فوج کا تعلق ہے۔ ابھی وہ اس قابل نہیں کہ ان کے بل پر کسی جمہوری انقلاب کا خیال بھی کیا جا سکے۔

مولانا اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ آج اس وقت اور ان حالات میں فوری انقلاب کی باتیں کرنا محض پریشاں خیالی اور تضیع وقت ہے جب تک ہم اپنے عوام کو

منظم نہ کرلیں۔ اور ہماری فوج اس قابل نہ ہو جائے کہ وہ ضرورت کے وقت اس ملک کی حفاظت کر سکے، مولانا کی رائے میں کوئی جمہوری انقلاب لانا یہاں ممکن نہیں ہے۔ اور اگر کسی صورت میں اس کا امکان نکل بھی آئے تو قبل از وقت انقلاب کے نتائج ہمارے حق میں اچھے نہیں ہوں گے۔

اس لیے آج وقت کی سب سے اہم ضرورت اور وطن کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ہم اپنی پوری انقلابی قوتوں کو عوام کے منظم کرنے میں لگا دیں۔ اور جس طرح بھی ممکن ہو اپنے ملک کو اس قابل بنائیں کہ آگے چل کر اس کی فوج خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے۔

ہندوستانی عوام کیسے منظم ہوں؟ اور ہندوستان کی فوجی طاقت کس طرح آج کی ضرورتوں کے مطابق مضبوط کی جا سکتی ہے؟ مولانا نے اپنے خطبات اور مقالات میں بار بار اسی مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا مسئلہ جس کو حل کیے بغیر مستقبل کی کوئی تدبیر عمل میں نہیں آ سکتی، ہندوستان پر اجنبی تسلط کا مسئلہ ہے۔ گزشتہ ایک سو برس سے اس ضمن میں جو بھی کوششیں ہوئی ہیں، ان سے کبھی بھی خاطر خواہ نتائج نہیں نکل سکے۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف طبقوں نے اب تک یک خیال اور یک سُو ہو کر کبھی اس ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد نہیں کی۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی فوج اور بعض جاگیرداری طبقے اُٹھے۔ لیکن عوام اور متوسط طبقے ان کے ساتھ نہیں تھے۔ اس لیے نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

اس کے بعد وہ لوگ جو انگریزی علوم پڑھ کر آزادی کی قدر و قیمت سمجھنے لگے تھے

انہوں نے برطانیہ سے ملک کی حکومت میں اپنا حصہ مانگنا شروع کیا۔ یہ تحریک ۱۸۸۵ء سے کانگریس کے قیام کی شکل میں شروع ہوتی ہے۔ ابتداء میں تو محض اونچے انگریزی پڑھے لکھے لوگوں تک یہ تحریک محدود رہی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کا دائرہ اثر بڑھتا گیا۔ اور بعد میں جب ملک کے متوسط طبقوں کو اس میں بار ملا تو ۱۹۲۰ء سے مسلمان بھی بہت بڑی تعداد میں اس میں شامل ہو گئے۔ اجنبی تسلط کو اس ملک سے بے دخل کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی، کسی ایک نظام میں متحد، یک جا ہو کر اگر کبھی برطانیہ کے خلاف صف آرا ہوئی ہے تو وہ کانگرس ہی کا نظام تھا۔ اور یقیناً ان معنوں میں تو صرف کانگرس ہی ایک ایسی جماعت ہو سکتی ہے، جو برطانیہ سے ہندوستان کو آزاد کرا سکے لیکن یہ ملک کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ اس وقت ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ ہم گزشتہ دس برس سے دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان بتدریج کانگرس سے دُور ہٹتے جا رہے ہیں۔ اور ہندوؤں اور مُسلمانوں کا آپس کا اختلاف اجنبی غلامی کی زنجیروں کو اور مستحکم کر رہا ہے۔ ہر نیا دن ہمارے لیے تازہ مصیبت لاتا ہے اور ہماری آپس کی دشمنیاں بجائے کم ہونے کے بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی گرفت روز بروز اور مضبوط ہو رہی ہے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ عوام کی تنظیم خاک ہو گی۔ اور جمہوری انقلاب کا خیال کس طرح قابل عمل ہو سکے گا۔

مولانا کا خیال یہ ہے کہ اگر اس ملک سے اجنبی تسلط کو ختم کرنا ہے۔ یہاں کے عوام میں سیاسی شعور کا پیدا کرنا ہے۔ اور اس طرح خدا کی اتنی بڑی مخلوق کے لیے جو اس ملک میں اَن گنت روگوں اور ناقابل بیان مصیبتوں میں جان توڑ رہی ہے، آزادی، خوش حالی اور عزت

وآبرو کی نعمتوں کو عام کرنا ہے تو خدا کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان آپس کے تفرقوں کو ڈور کرنے کی کوئی تدبیر سوچیئے۔ اوران کی موجودہ غلط فہمیوں کا کوئی حل ڈھونڈیئے تاکہ یہ سب مل کر اس ملک سے برطانی قبضے کی لعنت کو دُور کرسکیں۔

مولانا جب کانگرس کا نام لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں کانگرسی ہوں اور کانگرس میری ہے اور میں کانگرس کا چار آنے والا ممبر نہ ہوتے ہوئے بھی کانگرس میں ہوں توان کا مطلب "دراصل کانگرس کے اس سیاسی تصور سے ہے۔ جس کے تحت وہ تمام مذہب وملت کے ہندوستانیوں کو ایک نظام میں متحد ہوکر اجنبی تسلط کے خلاف جدوجہد کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ مولانا کانگرس کی موجودہ قیادت سے کتنے بدظن تھے۔ اور گاندھی جی کے فلسفہ سے اُنھیں کس قدر بُعد تھا لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اگر اس ملک سے برطانیہ کی حکومت کو بے دخل کر کے یہاں ہندوستانیوں کے کسی سیاسی نظام کو اُس کی جگہ لینا ہے تو وہ کانگرس کے اس تصور کے علاوہ اور کون سا سیاسی نظام ہوسکتا ہے۔

مولانا نے اپنے خطبوں میں بار ہا کہا ہے کہ برطانیہ سے ہندوستان کی حکومت کا ''چارج'' صرف کانگرس ہی لے سکتی ہے اور یہ ہے بھی سچ۔ لیکن یہ کانگرس گاندھی جی اور سردار پٹیل کی موجودہ کانگرس نہیں ہوگی۔ اس کانگرس میں تو ہندوستان کی سب قوموں کی ایک سی آواز ہوگی۔ اور یہ سب کی صحیح معنوں میں نمائندہ ہوگی۔ کم سے کم موجودہ حالات میں اگر اتنا ہو جائے کہ گاندھی جی کی کانگرس اور مسٹر جناح کی مسلم لیگ آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیں تو مولانا کے نزدیک اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ موصوف کے ذہن میں کُل ہند کانگرس کا

جو تصور ہے' اس سمجھوتے سے اس کی طرح پڑ سکے گی۔ اور دوسرے اس سمجھوتے کی وجہ سے جہاں تک ہندوستان کے اندرونی معاملات کا تعلق ہے ہم برطانیہ کے اقتدار کو بہت حد تک بے اثر کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

مولانا اس مرحلہ کو ''ڈومینین اسٹیٹس'' کا نام دیتے ہیں۔ اور ان کا کہنا یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مستقبل کے جمہوری انقلاب کی پہلی منزل ہندو مسلم اتحاد یا فی الحال اسے کانگرس لیگ سمجھوتہ کہہ لیجیے کی ہے۔ اس سے یہ ہوگا کہ ہم برٹش کامن ویلتھ میں رہتے ہوئے پوری آزادی سے اپنے عوام کی معاشی' تعلیمی' اجتماعی اور اخلاقی حالت کو درست کر سکیں گے۔ اور یہ عوام کی صحیح تنظیم کی طرف ہماری جدوجہد کا پہلا قدم ہوگا بے شک اس میں ہمیں ایک مدت لگے گی۔ لیکن اگر اس اصلاح کی زمام کار انقلابیوں کے ہاتھ میں ہوئی اور خدا نے چاہا تو ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

کانگرس لیگ کا سمجھوتہ بے شک آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ لیکن اس طرح کے سمجھوتے دونوں میں کئی بار ہوئے اور پھر ٹوٹ گئے۔ ہندو مسلمان پہلے پہلے بھی کئی بار ملے' لیکن پھر آپس میں جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ مولانا کے خود اپنے الفاظ میں:۔

> ''ہندوستان کا سیاسی تقدم اتنا مشکل نہیں جتنا پہلے سمجھا جاتا تھا لیکن یہ امر بھی ساتھ ہی منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ کھیل جب کبھی بھی بن کر بگڑتا ہے تو اس کی تہہ میں ہندو مسلم اختلافات ہی نظر آتا ہے''۔

مولانا کے پیش نظر جیسا کہ ہم پہلے بتا آئے ہیں دراصل جمہور عوام کا انقلاب ہے۔ اور اس عمومی انقلاب کے لیے ان کے نزدیک شرط اول یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کی

آپس کی تاریخی عداوت' ان کے فکری تنافر اور باہمی قومی اور جماعتی مخالفت کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع ہو جائے۔

نیز مسلمانوں کو اس غلطی سے بھی نکالنے کی ضرورت ہے کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے ہندوستانی نہیں بن سکتے۔ بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمانوں کی غالب تعداد غلطی سے اب تک یہ سمجھ رہی ہے کہ اسلام وطنیت کے منافی ہے۔ اور ایک سچا مسلمان قوم و وطن کی ملکی حدود سے آزاد اور بے تعلق ہوتا ہے۔ اگر مسلمان عوام میں اپنے موجودہ گرے ہوئے اور بوسیدہ ماحول کی تخریب اور اس کی جگہ نئی زندگی کی تعمیر کا احساس اور اس کے لیے حوصلہ وعزم پیدا کرنا ہے تو ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان کی اس غلط فہمی کو رفع کیا جائے۔

اب تک بارہا ایسا ہو چکا ہے کہ مسلمان عوام کے جوش عمل کو اس ملک سے دور کسی دوسرے اسلامی ملک کی خاطر حرکت میں لایا گیا۔ اور چونکہ دوسرے اسلامی ممالک کے حالات ہمارے اختیار سے باہر تھے اس لیے کسی وجہ سے جب انہوں نے اپنا طریقہ کار بدل دیا تو ہم کہیں کے نہ رہے۔ اور ہمارے عوام بھی مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ بے شک مسلمان عوام میں انقلاب کی غیر معمولی صلاحیتیں موجود ہیں۔ لیکن انھیں دور کے سہانے خواب دکھا کر اصل مسئلہ سے غافل کر دیا گیا ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان عوام اپنے دین کی صحیح انقلابی حیثیت کو سمجھیں۔ اور اپنی انقلابی قوتوں کو جن کی ان کے ہاں کمی نہیں ہے' خود اپنے وطن کو بہتر بنانے میں پورے یقین وایمان کے ساتھ صرف کر دیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے اہل وطن بھی یہ سمجھ لیں کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا نہیں ہے اس کو بنانے وترقی دینے اور اسے منزل پر لانے میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس لحاظ

سے اگر مسلمان ہندوؤں سے زیادہ نہیں تو ان سے کسی حیثیت سے کم بھی نہیں۔

..............o..............

اصل دین کیا ہے؟ اسلام کی دنیا کے تمام دینوں میں کیا حیثیت ہے؟ خدا کو ایک ماننے کے کیا معنی ہے؟ یہ کائنات جس کا ہم ایک حصہ ہیں کیسے وجود میں آئی؟ اور انسان کا اس کائنات میں کیا مرتبہ ہے؟ انسان کا مختلف وطنوں اور ملکوں میں تقسیم ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور کیا یہ ضروری ہے کہ انسان مختلف ملتوں میں بٹ کر اور جدا جدا ملکوں میں بس کر ہمیشہ آپس میں برسر پیکار ہی رہے۔ یا اس کا کوئی امکان ہے کہ کوئی ایسا مذہبی فکر اور کوئی ایسا سیاسی نظام سوچا جا سکے۔ جو خدا کی ساری مخلوق کو مہر و محبت کے رشتے میں پرو کر انھیں زندگی کے ایک اعلیٰ اور بلند مقصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل کر دے؟

مولانا نے اپنے دینی فلسفے اور سیاسی نصب العین کے ضمن میں انھیں سوالوں کے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان تفصیلات کو بیان کرنے کی نہ تو یہاں گنجائش ہے اور نہ اس کا موقع۔ جن لوگوں کو ان مسائل کے متعلق مولانا کی تفصیلی آرا معلوم کرنا ہوں وہ ان کی دوسری کتابوں کا مطالعہ کریں۔

ان مسائل میں مولانا کے افکار و خیالات کا لب لباب یہ ہے کہ اسلام دراصل مذاہب عالم کی تاریخ کی آخری کڑی ہے۔ جس نے تمام ادیان کے بنیادی اصولوں کو ایک کتاب میں منضبط کر دیا۔ مولانا کے نزدیک ہر مذہب اپنے زمانے کے لیے ایک انقلاب کا پیغام لایا۔ اور اس مذہب کے نبی کی ذاتِ گرامی اس انقلاب کی حامل بنی۔ اسلام بھی دنیا

میں ایک انقلاب کا پیغام لے کر آیا۔لیکن جس طرح اسلام پہلے کے تمام ادیان کا نقطہ کمال ہے اور اسلام کی کتاب تمام الہامی کتابوں کی مصدق اور ان کی بنیادی تعلیمات پر جامع ہے۔اسی طرح اسلام کا انقلاب بھی تمام انسانیت کے لیے عام ہے۔اور وہ اپنے مقصد میں عالمگیر اور بین الاقوامی ہے۔اسلام کو بین الاقوامی انقلاب کا نقیب ماننے کا عملاً نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر ایک قوم اسلام کے انقلابی اصولوں پر اپنے قومی وجود کی تشکیل کر سکتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی قومی جمعیت اگر اسلام کے اصولوں کی حامل ہو تو وہ اسلام کی عالمگیریت کی ضد نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کی یہ عالمگیریت دراصل مجموعہ ہے مختلف اسلامی قومی جمعیتوں کا' جو اپنی اپنی جگہ مستقل حیثیتوں کی مالک ہوں گی۔ بے شک اسلام تو وطن اور ملک کی حدود سے بالاتر ہے' لیکن ایک قوم اپنے قومی وجود کو برقرار رکھتی ہوئی اسلام کو اپنا سکتی ہے۔انہی معنوں میں مولانا سندھیؒ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بھی دو حیثیتیں مانتے ہیں۔ایک قومی جس کے ذریعہ عرب بحیثیت ایک قوم کے اسلام کے انقلاب کے حامل بنے اور اس سے ان کی قومی جمعیت کو استحکام اور سر بلندی نصیب ہوئی۔ اور دوسری اس بعثت کی ہمہ گیر اور عالمگیر حیثیت' جس کے فیض سے اسلام کا یہ انقلاب عربوں تک محدود نہ رہا۔ بلکہ عربوں کے بعد دوسری قوموں نے بھی اس سے نئی زندگی پائی اور آئندہ بھی رہتی دنیا تک اسلام کی اس انقلابی دعوت کا اثر و فیض برابر جاری رہے گا۔

اس بیان سے مولانا کا حاصل مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستانی بن کر یہاں اس ملک میں اسلام کے اصولوں پر انقلاب برپا کرے اور وہ اپنے ہندوستانی ہونے کو

اسلام کی کسی غلط تعبیر کی وجہ سے اسلام کے خلاف نہ سمجھے' بلکہ اس کے برعکس اپنی ہندوستانی قومیت کو اسلام کی صحیح بین الاقوامی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے عین مطابق جانے' لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ ہندوستانی قومیت اسلام کی بین الاقوامی روح انقلاب سے متضاد نہ ہو۔ غرضیکہ ہندوستانی مسلمان دنیا کی اسلامی برادری کا ایک مستقل رکن رہے اس کا اپنا وطن ہے' اپنا کلچر ہے' اپنی تاریخ ہے' اور اپنی زبان اور اپنا ادب ہے۔ ہندوستانی مسلمان کو اگر اس دنیا میں عزت واقبال حاصل کرنا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے قومی وجود اور اپنے قومی خصائص کو ترقی دے۔ اور اپنی ہندوستانی قومیت کو اسلام کے بین الاقوامی انقلاب کے رنگ میں رنگ کر اسے خود اپنے لیے، اپنے غیر مسلم اہل وطن کے لیے اور دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے لیے خیر و برکت کا باعث بنائے' یہ ہیں وہ اغراض و مقاصد جن کے لیے مولانا اپنے خطبوں میں بار بار ہندوستانی مسلمانوں کو نیشنلسٹ بننے کی دعوت دیتے ہیں۔

ہندوستان محض ہندوؤں کا وطن نہیں جیسا کہ غلطی سے بعض ہندو سمجھتے ہیں یا جیسے بعض مسلمانوں نے اپنی بے سمجھی سے یہ کہہ کہہ کر ہندوؤں کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ واقعی مسلمان کا کوئی خاص وطن نہیں ہوتا' اس لیے ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے مولانا نہایت شدت سے اس خیال کی تردید فرماتے ہیں' ان کے نزدیک وطن، خاک وآب وباد کا نام نہیں ۔اور نہ وطن کے معنی جامد زمین کے ہیں۔ وطن ایک نمو پذیر وجود ہے۔ مثلاً ہندوستان ایک وطن ہے۔ جہاں کبھی گونڈ اور بھیل بستے تھے۔ شمال سے آریا آئے ۔ اور انہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا۔ آریاؤں نے ہندوستان کو نئی تہذیب دی اُسے صدیوں تک ترقی

کی شاہراہ پر چلایا۔ یہاں فلسفے بنے۔علوم کا رواج ہوا۔ کرشن جی اور مہاتما گوتم بدھ جیسے اصحاب مذاہب اور اشوکا جیسے فرماں رواں آریاؤں ہی کی طفیل اس ملک کو نصیب ہوئے ۔جن کی بدولت آج ہندوستان کا نام دنیا میں عزت سے لیا جاتا ہے۔ان آریاؤں کو زوال آیا تو شمال سے ان کے دوسرے بھائی بند نیا مذہب' زندگی کا نیا فلسفہ' نئے علوم وفنون اور نئی تہذیب وتمدن لے کر اس وطن میں وارد ہوئے ۔اور انہوں نے اس کی کایا پلٹ دی۔ مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کی جو بُری حالت تھی اور جس قسم کا سیاسی انتشار' اخلاقی انحطاط' ذہنی جمود، اور اجتماعی بدنظمی یہاں تھی' اس کا مقابلہ اکبر' جہانگیر' شاہ جہان اور عالم گیر کے دور اقبال سے کیجیے۔جب کابل سے لے کر بنگال تک اور کشمیر سے دکن تک اس تمام براعظم میں امن وامان کا دور دورہ تھا سب ایک حکومت کے تابع اور ایک قانون کے ماتحت آرام اور آسائش سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ کے اس طویل عہد میں مسلمانوں نے محض بڑے بڑے فاتح اور حکمران پیدا نہیں کیے۔انہوں نے تاج محل اور لال قلعے جیسی عجائب روزگار عمارتیں ہی نہیں بنائیں' اور ان کے صوفیا کرام نے اپنی پاک زندگیوں اور اپنے محبت بھرے بولوں سے یہاں کے باشندوں کو محض مسلمان نہیں کیا' بلکہ مسلمانوں کے فکر وعمل نے خود ہندوؤں کے دلوں اور دماغوں میں بیداری کی ایک لہر پیدا کر دی۔اور ان کے اثر سے ان میں کئی ایک اصلاحی تحریکیں اٹھیں' جن کی وجہ سے ہندو عوام جو صدیوں سے بے خبر سوئے پڑے تھے بیدار ہونے کے لیے کروٹیں بدلنے لگے۔اسی زمانے میں ہندوستان کی مقامی زبانیں وجود میں آئیں اور بڑے بڑے مصلح اور بھگت ان زبانوں میں عوام کی دبی ہوئی خواہشات اور

بجھی ہوئی امنگوں کو اپنے گیتوں میں بیان کرنے لگے۔

بے شک مسلمان حکمران طبقوں کو اس تمام عرصہ میں زیادہ تر حکومت وسطوت سے تعلق رہا۔ اور یہ اُس زمانے کے خاص حالات کے پیش نظر ایک حد تک ضروری بھی تھا۔ لیکن اس سیاسی سطوت کے ساتھ ہزار ہا ہزار اصحابِ علم وفکر اور بے شمار اہل رشد و ہدایت بزرگ بھی موجود تھے۔ جن کا مقصد نہ مادی دولت ہوتا اور نہ کوئی سیاسی اقتدار' یہ لوگ حکومت کے خرخشوں سے دُور علوم وفنون کے مطالعہ اور فلسفہ وحکمت کی تحقیق میں اپنی ساری ساری عمر گزار دیتے' مانا کہ بادشاہوں کی ہیبت سے رعایا کانپا کرتی۔ لیکن ان بزرگوں کے خلاف جاتے یہ بادشاہ بھی ڈرتے تھے' حکمران طبقے اسلامی ہند کے جسم کے محافظ تھے' لیکن ان بزرگوں نے اسلامی ہند کے ذہن اور اس کی روح کو جلا بخش کر اس کو نکھارا۔

مسلمان اہل علم کی تحقیقی جدوجہد محض اسلامی علوم وفنون تک محدود نہ تھیں۔ ان میں سے بعض ہندوستان کی قدیم زبانیں سیکھتے۔ یہاں کے پرانے علوم کا کھوج لگاتے اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا عربی اور فارسی میں ترجمہ کرتے۔ انہوں نے یہاں کے فلسفے اور یوگ کو بھی جس پر صدیوں کے توہمات اور جہالت کی تہیں جمی ہوئی تھیں کھنگالا۔ اُسے اپنی حکمت ودانش کی مدد سے نئی زندگی عطا کی، الغرض مسلمانوں نے اپنے ان سیاسی' علمی اور تحقیقی کارناموں سے اس طرح اپنے آپ کو اس وطن کا سب سے بہتر سپوت ثابت کر دیا۔ "آریہ ورت" ان کے دم قدم سے تمام دنیا میں نیک نام ہوئی اور "مغل اعظم" کا ذکر سات سمندر پار کے ملکوں میں بڑی عظمت واحترام سے لیا جانے لگا۔

چنانچہ ہندوستانی مسلمان کو آج پورا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس وطن کا مالک سمجھے۔ مولانا کے الفاظ میں "صحیح معنوں میں ہندوستانی وہ ہے جس نے ہندوستان کا انتشار دُور کر کے اس میں وحدت پیدا کر دی ہو۔ اور اُسے ایک راستے پر لگا دیا ہو...... پس جب مسلمان کہتا ہے کہ "ہندوستان ہمارا ہے" تو اس میں ایک عظیم الشان حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج ہمارے پرانے اور نئے تعلیم یافتہ لوگ ان باتوں پر غور کرنے سے یکسر عاری ہو چکے ہیں۔ اور صرف اپنی مردم شماری کے دھندوں میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اُن کے جو حقوق ہیں اُن کے حصول کی کوشش نہیں کرتے"۔

یہ ہے مولانا کی ہندوستانیت، اور یہ ہے اُن کی وطنیت، ان کو اپنی اس ہندوستانیت اور وطنیت پر اتنا فخر ہے جتنا اپنے اسلام پر اب جو لوگ اسلام اور اس ہندوستانیت کے اجتماع کو بزعم خود اپنے اسلام کے منافی سمجھتے ہیں تو ان کی خدمت میں صرف اتنا عرض ہے کہ خدا نے چاہا تو مولانا کا اسلام ہندوستانی بن کر اس سرزمین میں نہ صرف خود زندہ رہے گا بلکہ اپنوں اور غیروں کو بھی زندگی اور قوت بخشے گا اور آپ کا اسلام خلا میں رہنے کی وجہ سے یہاں محض بحث و مجادلہ کا موضوع بن کر رہ جائے گا۔

--------o--------

عالم گیرؒ کے بعد ہندوستان پھر ادبار میں آ گیا۔ چنانچہ سات سمندر پار سے ایک نئی قوم ہندوستان پر حملہ آور ہوتی ہے، یہ قوم بھی ایک نئے تمدن نئے طریقہ کی زندگی اور نئی

عمرانی اور معاشی قوتوں کے ساتھ ہمارے ملک میں آتی ہے۔اور جیسے پہلوں نے اس سر زمین کو اپنے اپنے وقتوں میں اسے بدلا تھا' اسی طرح یہ قوم بھی ہمارے وطن کو پرانے دور سے نکال کر ہمیں ایک نئی زندگی سے آشنا کرتی ہے۔لیکن پہلوں اور اس قوم میں یہ فرق ہے کہ پہلے تو باہر سے آئے اور یہیں کے ہو گئے۔لیکن اس قوم نے اب تک اپنے آپ کو ہم سے اجنبی ہی رکھا۔اور بظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ یہ قوم اس ملک کو اپنا وطن سمجھنے لگے۔اس لیے ہندوستان کے قومی وجود میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔لیکن ہمارے علوم اور ہماری صنعت و معیشت اور سیاست و اجتماعیت میں یورپ کی اس قوم کے بدولت جو انقلاب آیا ہے' مولانا اس کے فوائد کے بہت حد تک معترف ہیں، بلکہ جس عمومی انقلاب کا وہ فکر پیش کرتے ہیں' یہ انقلاب اُن کے خیال میں اس سے بڑے انقلاب کی اَن گھڑی سی ابتدائی شکل ہے۔

مولانا کا یہ عمومی انقلاب ہندوستان کے جمہور کا انقلاب ہوگا۔اور ہمارے یہ جمہور مشین اور مشین کے استعمال سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں' ان کے ذریعہ بیدار اور منظم ہوں گے۔ہمارا ملک چونکہ اس اجنبی حکومت کی وجہ سے ہی مشین سے متعارف ہوا ہے۔ اس لیے اس معاملہ میں مولانا کی رائے یہ ہے کہ ہمیں برطانیہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔یہ عمومی انقلاب محنت کش مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ سے ہوگا' مولانا کے اپنے الفاظ میں ''اگرچہ ہم آج انقلاب کی پہلی صف میں کھڑے نہیں ہو سکتے' مگر دوسرے یا تیسرے دن ہم پر سب کچھ عائد ہو سکتا ہے جو یورپ کی جمہوریت پسند اقوام پر آج وارد ہوگا'' الغرض موصوف آج کی دنیا میں مشین کو نئی زندگی کی مادی ضروریات کی سب سے بڑی اساس

مانتے ہیں۔اُن کے نزدیک اگر ہم نے مشین کا استعمال نہ سیکھا تو ہم دنیا کی قوموں میں اچھوت بن جائیں گے۔

مشین کے بعد وہ جمہوریت کو نئی زندگی کی اساس بناتے ہیں۔اور اس معاملہ میں بھی وہ برطانیہ کا احسان مانتے ہیں کہ اس نے ہمیں جمہوری طریقوں سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔

ہندوستان گونڈوں اور بھیلوں کے زمانے میں جیسا کچھ تھا' تھا۔آریا آئے تو انہوں نے اس کی جو جُون بدلی اُن کی وجہ سے ہمارے وطن میں انقلاب آیا۔اس کے بعد مسلمان آئے۔اُن سے ہمارے وطن کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔اور انہوں نے اس ملک میں ایک انقلاب پیدا کیا۔مولانا کا کہنا یہ ہے کہ آریائی دور کبھی کا ختم ہو چکا۔اسی طرح ہندوستان کا اسلامی دور بھی اپنی انقلابی قوتوں کو کھو چکا ہے۔اب ہندوستان میں ایک نیا انقلاب ہوگا۔یہ انقلاب ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کریں گے۔لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے اوپر کے طبقے نہیں۔یہ طبقے تو اپنی زندگی کے دن گزار چکے۔برطانی تسلط کا دراصل مطلب ہی یہی تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے حکمران طبقے اب ہندوستان کی حکومت کے اہل نہیں رہے۔بے شک ان میں بعض صالح عناصر اب تک موجود ہیں۔اور وہ اس نئے انقلاب کی سب سے بڑی قوت بن سکتے ہیں۔لیکن یہ انقلاب لازمی طور پر ہوگا عوام کے ذریعے۔مولانا کی ساری کوشش یہ ہے کہ یہ عوام ہندوستانی عوام ہوں۔ہندو عوام ہوں' مسلمان عوام ہوں' اور ہندوستان کے یہ ہندو اور مسلمان عوام مل کر اس عمومی انقلاب کو بروئے کار لائیں۔انھیں ڈر یہ ہے کہ جس طرح پہلے بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہندوستان

والے زمانے کی رَو سے بہت پیچھے رہ گئے۔ اور جب نئے حالات کی وجہ سے انھیں اپنی زندگی کو بدلنے کی ضرورت پڑی، تو وہ اتنے بیکار ہو چکے تھے کہ ان کو مجبوراً باہر کی انقلابی قوتوں کے ہاتھ میں اپنے ملک کی عنانِ حکومت دینی پڑی کہیں پھر ایسا نہ ہو۔

مولانا کے لیے ہندوستان کے مستقبل کا یہ تصور بڑا تکلیف دہ ہے' اسی لیے جب وہ اوپر کے طبقوں کو مخاطب کرتے ہیں تو ان کے لہجے میں انتہائی شدت ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ مولانا ہندوستانی جمہور کو اُٹھانے کے لیے بڑے بے تاب ہیں۔ کیونکہ ان کے اُٹھنے میں جتنی بھی دیر لگے گی ان کے نزدیک ہمارا مستقبل اور تاریک ہوتا جائے گا۔ لیکن جمہور کو اٹھانے کا یہ کام ہندوستان کے اوپر کے طبقوں کے جو صالح عناصر ہیں ان کے کرنے کا ہے۔ اگر خدانخواستہ انہوں نے ادھر سے غفلت برتی تو ہمارے ملک کا جو حشر ہوگا' اس کو زبان پر لاتے ڈر لگتا ہے' چنانچہ مولانا ملک کے ان صالح عناصر کے سامنے اپنا انقلابی فکر پیش کرتے ہیں۔ مولانا کا یہ فکر انقلابی ہے۔ انسانیت عامہ کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ہندوستانی ہے، اور اسلامی ہے، اس لیے یہ صالح عناصر اگر چاہیں تو اس فکر کو بڑی آسانی سے اپنا سکتے ہیں۔ اور اس طرح یہ لوگ اپنے ملک کے عوام کے انقلاب کے۔ جو آج نہیں تو کل آ کر رہے گا۔ رہنما اور قائد بن جائیں گے۔ ہمارے ہاں کے مزدوروں اور کسانوں کے اس قسم کے انقلاب کا نتیجہ ایک ایسا ہندوستان ہوگا، جس کی رفعت اور عظمت کی تاریخ میں شاید ہی کوئی مثال مل سکے۔

مستقبل کا یہ ہندوستان جس کے بنانے کے منصوبے لے کر مولانا وطن لوٹے اس کا ایک عنصر تو مشین ہوگا۔ اور دوسرا عنصر جمہوریت۔ لیکن اگر مشین اور جمہوریت کی

برکات ایک طبقے تک محدود رہیں تو اس کا نتیجہ موجودہ سرمایہ داری ہے۔ جس سے بڑھ کر آج کے زمانے میں کوئی لعنت تصور میں نہیں آ سکتی۔ مولانا مشین، اور جمہوریت، کی برکات کو ہر خاص و عام میں مشترک کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا چاہتے ہیں کہ اس نئے ہندوستان کا ظاہری ڈھانچہ تو بے شک 'مشین' جمہوریت' اور مفاد عامہ کے عناصر سے ترکیب پائے۔ لیکن اس کا معنوی وجود ان عناصر کی طرح کہیں باہر سے مستعار نہ لیا جائے' بلکہ یہ معنوی وجود حاصل ہو۔ ہمارے وطن کے اس سلسلہ ارتقا کا جو ہزار ہا سال سے اس ملک میں جاری ہے جسے پہلے تو آریائی فکر و ذہن نے نمو بخشا۔ اور پھر صدیوں تک مسلمان اس کو سنوارنے اور ترقی دینے میں لگے رہے۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ ہمارا یہ معنوی وجود ہندوؤں اور مسلمانوں کی تاریخی جدوجہد اور ان کے ہزار ہا سال کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے، اور آج ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے وطن کے اس معنوی وجود کی بنیادوں پر اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق ایک آزاد جمہوری' صنعتی اور مفاد عامہ پر مبنی ہندوستان کی تعمیر کریں۔

مولانا کے نزدیک ہندوستان کے اس معنوی وجود کے بہترین شارح اور آخری ترجمان شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی ہیں۔ شاہ صاحب ایک بلند نظر فلسفی بھی ہیں۔ وہ ایک مسلمہ مذہبی عالم بھی ہیں۔ اور اکبر اور عالم گیر کے بعد جب مسلمانوں کا بادشاہی دور ختم ہو رہا تھا۔ تو انھوں نے جمہور مسلمانوں کے سامنے ایک نئے نظام کا فکر بھی پیش کیا۔ جس پر ان کے بعد آنے والوں نے اپنی ایک سیاسی پارٹی بنائی۔ اور اس پارٹی نے عملی جدوجہد بھی کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جہاں تک شاہ صاحب کے فلسفی فکر کا تعلق ہے وہ خالص انسانی ہے

'اس میں کسی مذہب اور ملت سے بحث نہیں۔شاہ صاحب کے اس فکر کی اساس عقیدہ وحدت الوجود ہے۔جس کو ہندو بھی مانتے ہیں اور مسلمان صوفیاء بھی اس کے قائل تھے۔ چنانچہ اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بحیثیت دو انسانی گروہوں کے یہ فلسفی فکر ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب لاسکتا ہے۔آپس کی اس فکری مقاربت کے بعد ہندو اپنی تاریخی روایات اور مذہبی ضابطوں پر اجتماعی زندگی بسر کریں اور مسلمان اپنے دینی اصولوں اور فقہی قاعدوں پر'اس مسئلہ میں شاہ صاحب ایک مسلمہ مذہبی عالم کی حیثیت سے مسلمانوں کے امام اور استاد ہوں گے۔

اس کے بعد مسلمان جمہور کی تنظیم کا سوال آتا ہے،مولانا فرماتے ہیں کہ عوام مسلمانوں کی اس طرح کی تنظیم اور ان کی سیاسی جدوجہد جسے وہ ولی اللہی تحریک کا نام دیتے ہیں۔اس کا سلسلہ ۱۷۳۱ء سے جاری ہے۔جس میں اب تک نئے نئے حالات کے مطابق برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔مولانا کا کہنا یہ ہے کہ آج ہم اس زمانے کی ضروریات کے مطابق جمہور مسلمانوں کی اس تاریخی جدوجہد کو نئی شکل دے سکتے ہیں۔

یہ ہیں تین درجے مولانا کی دعوت اور ان کی عملی سرگرمیوں کے۔ان سہ گانہ مراتب کی اپنی جدا جدا حیثیت ہے اور ہر حیثیت اپنی جگہ مستقل بالذات ہے۔اس سلسلہ میں اگر ضرورت سے زیادہ وسیع مشربی برتی گئی اور محض انسانیت کے غیر محدود دائرے کو ہی ہم نے اجتماعی زندگی کی آخری قدر مانا تو اس کا نتیجہ اکبر اعظم کے دین الٰہی جیسا ایک لامذہبی تصور ہوگا۔جس سے فکر کو تو بے شک ایک بے پایاں وسعت مل جائے گی۔لیکن عملاً اس سے اجتماعی زندگی کو نقصان پہنچے گا۔اس کے برعکس اگر شاہ صاحب کے فلسفی فکر کو الگ کر کے

صرف ان کی مذہبی تجدید ہی کو ہم نے اپنے لیے مدارِکل بنایا۔ تو جماعتی اعتبار سے شاید ہم اپنے ہاں کی اہل حدیث جماعت کی طرح پابند کتاب وسنت ہو جائیں۔ لیکن اس سے عام زندگی میں جو حاصل ہو گا وہ ہم نے گزشتہ ایک سو برس میں دیکھ ہی لیا ہے۔

مولانا کے عمر بھر کے فکر و مطالعہ اور اندرون ہند اور ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں برسوں کے تجربات کا اُسے ایک اعجاز سمجھیے کہ وہ شاہ ولی اللہ کے فکر و عمل کے ان سہ گانہ مراتب میں مطلق التباس نہیں ہونے دیتے۔ اور وُہ ان کی بنیادوں پر ہمیں ایک ایسے فکری وسیاسی نظام بنانے کی راہ دکھاتے ہیں جو خالص انسانی ہے۔ ملی اور اجتماعی اعتبار سے صحیح معنوں میں اسلامی ہے۔ اور آج کی مادی اور معاشی ضرورتوں کے لحاظ سے جدید یورپ کے سب سے ترقی یافتہ صنعتی نظام کے ہم پایہ ہے۔ اور پھر اس نظام کو معرض وجود میں لانے کے لئے مولانا ہم میں انقلابی فکر اور اس پر عمل کرنے کے لیے انقلاب کا ولولہ اور حوصلہ بھی پیدا کرتے ہیں۔

ہندوستان کی فضا میں یہ باتیں بالکل نئی تھیں۔ کیونکہ اب تک کبھی کسی نے ہندوستان کے مسائل پر اس نئے انداز سے نہیں سوچا تھا۔ چنانچہ مولانا جب وطن واپس آئے اور انہوں نے فرداً فرداً عام قومی اور اسلامی اجتماعوں میں اپنے ان افکار و خیالات اور عزائم و مقاصد کا اظہار کرنا شروع کیا۔ تو اکثر لوگ شروع شروع میں مولانا کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہے۔ اس کے علاوہ ان دنوں لیگ اور کانگرس کے نزاع نے ملک میں ایک بحران پیدا کر رکھا تھا۔ اس لیے اتنا تو ضرور ہوا کہ چند افراد مولانا کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن مسلمانوں کی عام سیاسی جماعتوں نے بدقسمتی سے مولانا کی دعوت پر زیادہ دھیان نہ دیا۔

چنانچہ مولانا کی زندگی میں اُن کے بےنظیر دماغ اوران کی غیر معمولی انقلابی قوتوں سے جو رہنمائی مسلمانان ہند کو مل سکتی تھی۔ ہماری سیاسی جماعتوں نے مطلق اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔

مولانا اپنی زندگی کے آخری دنوں میں قوم کی طرف ایک ''نذیر'' بن کر آئے تھے۔ انہوں نے اپنی قوم کو آنے والے انقلاب سے ڈرایا۔ انہیں بتایا کہ انقلاب کا وقت معین ہو چکا ہے۔ اور اب وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹلے گا۔ مولانا نے نہ دن کا خیال کیا اور نہ رات کا۔ وہ شب و روز قوم سے اپنی بات کہتے رہے۔ بعض لوگ سنتے اور چل دیتے اور بعض تو سننا بھی گوارا نہ کرتے اور کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔ مولانا نے اپنی قوم کو کھلے طور پر بلایا۔ اُن سے برملا بھی باتیں کیں۔ اور خلوت میں بھی ایک ایک کے پاس اپنا پیغام لے کر گئے اور مارچ ۱۹۳۹ء سے لے کر اگست ۱۹۴۴ء تک کی یہ ساری مدت مولانا نے اس جدوجہد میں گزاری اور ایک لمحہ بھر کر لیے بھی انہوں نے کہیں ستانے کا نام نہ لیا۔

مولانا کی یہ دعوت ایک نئے دور کے آنے کا اعلان تھا۔ اگر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دے دی۔ اور انہوں نے نئے دور کے اس پیغامبر کی بات کو سمجھ لیا اور وہ اس کے بتائے ہوئے راستہ پر ہو لیے تو یقیناً ان کے لیے فوز و فلاح کے دروازے کھلے ہیں' ورنہ جس انقلاب سے مولانا ڈرا رہے تھے اگر اس نے ہمیں اسی حالت میں جس میں کہ ہم اس وقت ہیں اپنی دار و گیر میں لے لیا تو جو کچھ حضرت نوحؑ کی قوم پر گزری تھی، وہ حشر ہمارا بھی ہوگا اور اپنی عمر بھر کی جان توڑ کوششوں کا یہ افسوسناک انجام دیکھ کر حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح بے شک مولانا عبیداللہ صاحب سندھی بھی اپنے پروردگار کی خدمت میں

ایسی عرض کریں گے کہ

رَبِّ اِنَّهُم عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗ اِلَّا خَسَارًا ط

بے شک ہندوستان کی اسلامی جماعتوں کے بوڑھے رہنماؤں نے مولانا کی زندگی میں ان کی دعوت کی صحیح اہمیت کو نہ سمجھا۔ لیکن مرحوم اس سے مطلق بددل نہیں تھے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ مسلم نوجوان اسمبلی کے ممبروں کی سرمایہ داری سے مرعوب ہو کر زیادہ دیران کے قابو میں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ مولانا کی توقعات اپنی قوم کے نوجوانوں ہی سے وابستہ تھیں۔ اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''ہمارا اصلی مخاطب صرف ہمارا نوجوان ہے۔ اور یہی نوجوان آگے چل کر اپنے ملک میں اپنی حکومت بنائے گا''۔

مولانا نے مسلمان نوجوانوں کے ہر طبقہ سے خطاب کیا۔ آپ نے عربی مدارس کے طلبہ کو بتایا کہ جو دینی علوم وہ پڑھ رہے ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابوں کو ان علوم کی تحصیل کا آخری درجہ بنائیں۔ اور اس کے ساتھ وہ یورپ کے نئے معاشی اور سیاسی انقلاب کو بھی سمجھیں۔ اس سے ان کی نظر میں وسعت اور دلوں میں عمل کا ولولہ پیدا ہوگا۔ اور وہ عوام مسلمانوں کی صحیح تربیت کر کے ان کے حقیقی ترجمان بن سکیں گے۔

آپ نے جمیعت العلماء کے نوجوان کارکنوں کو سمجھایا کہ وہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کو دیکھیں اور ۱۹۲۰ء سے جمیعت جس نہج پر چل رہی ہے اس میں مناسب اصلاح کریں۔ مولانا نے فرمایا کہ تحریکِ خلافت میں علماء کی ترقی کن جماعت اور انگریزی پڑھے ہوئے انقلابی عناصر ملے تھے تو مسلمان ہندوستان کی تمام سیاست پر چھا گئے تھے اور

اگر آج بھی آپ لوگ ملک کے اِن نوجوانوں کو ساتھ لے لیں' جو یورپ کے انقلاب سے خوب واقف ہو چکے ہیں۔تو آپ نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ کُل ہندوستان کی قسمت بدل سکتے ہیں۔لیکن یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک آپ اپنی انقلابی سیاست میں شاہ صاحب کو اپنا امام نہ مانیں۔مولانا نے متنبہ کیا کہ اگر آپ لوگوں نے ایسا نہ کیا تو ہندوستان کے مسلمانوں کا وہی حشر ہوگا' جو بخارا کے مسلمانوں کا ہو چکا ہے۔

مولانا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو علی گڑھ اور دیوبند کی علمی تحریکوں کا تاریخی سنگم سمجھتے تھے۔چنانچہ آپ نے یہاں بیت الحکمت کے نام سے ایک مرکزی ادارہ بنایا۔جہاں عربی مدراس کے فارغ التحصیل علماء اور انگریزی کالجوں کے پڑھے ہوئے نوجوان آپس میں مل کر شاہ صاحب کے علوم کا تحقیقی مطالعہ کریں۔اور ہندوستان کے اس مرکزی مقام اور جامعہ کی خالص علمی فضا میں رہ کر طلبہ کی یہ جماعت شاہ صاحب کی حکمت کے اصولوں پر آج اس زمانے کے لیے ایک اسلامی ہندوستانی فکر کی تشکیل کر کے نیز ہمارے ہاں آئے دن جو سیاسی' معاشی اور اجتماعی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔بیت الحکمت ان میں بھی اہلِ مُلک کی صحیح رہنمائی کر سکے۔

مولانا کی علمی سرگرمیوں کا مرکز تو دہلی' دیوبند اور لاہور رہا۔لیکن مرحوم نے اپنے انقلابی فکر کو عملی شکل دینے کے لیے سندھ کی سرزمین کو منتخب فرمایا تھا۔سندھ سے مولانا کو بے حد محبت تھی۔اور وہ اپنی عمر کے پہلے حصے میں سندھ میں ایک عرصہ تک کام بھی کر چکے تھے لیکن مرحوم نے سندھ کو محض اسی بناء پر اپنی عملی جدوجہد کا مرکز نہیں بنایا تھا۔بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ مولانا کے پیش نظر انقلاب کا جو تصوّر تھا' اس کے لیے سندھ کے حالات خاص طور پر

سازگار ہیں۔اور سندھی مسلمان اور سندھی ہندو بڑی آسانی سے مرحوم کے مشترکہ سیاسی فکر کو اپنا بھی سکتے ہیں۔اور پھر سب سے بڑی چیز جس کی مولانا کو تلاش تھی، وہ سندھ کے عربی مدارس کے نوجوان علماء میں موجود ہے۔مولانا چاہتے تھے کہ علماء اسلام کو شاہ صاحب کی انقلابی سیاست کی صورت میں سمجھیں۔نیز یورپ کے نئے انقلاب سے بھی وہ بے خبر نہ رہیں۔ج۔ن سندھ ساگر نام کی سیاسی پارٹی اور محمد قاسم تھیولجیکل اسکول و کالج نام کی درس گاہیں مرحوم کے انہی تصورات کے عنوان ہیں۔

دہلی اور سندھ ۔۔۔۔۔۔ایک مولانا کا مرکزِ فکر۔اور دوسرا ان کا مرکزِ عمل۔

ہندوستان کی سیاسی بساط اب اُلٹنے کو ہے۔نئے دور میں اگر مسلمانوں کو ایک فعال اور صالح جماعت کی حیثیت سے ہندوستان میں رہنا ہے تو اس کا انحصار زیادہ تر اس پر ہے کہ مسلمان مولانا کے فکر و عمل کو کہاں تک اپنے لیے مشعل راہ بناتے ہیں۔مولانا تو اپنے رب کے ہاں سدھارے۔اب مرحوم کے فکر اور عمل کو زندہ رکھنا دہلی اور سندھ کا فرض ہے۔

محمد سَرور

جامعہ ملیہ دہلی

نومبر 1944ء

مقالہ نمبر ١

جمعیۃ الانصار

کے

قواعد و مقاصد

١٩١١ء

پس منظر

امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنی عظیم تصنیف ''التمھید لتعریف ائمۃ التجدید'' میں لکھا ہے کہ ''حضرت شیخ الہندؒ شعبان ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں مدرسہ دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا سندھ میں سالانہ امتحان کیلئے تشریف لائے' اور حکم فرما گئے کہ رمضان میں دیوبند آ جاؤ''۔ چنانچہ حضرت سندھیؒ رمضان کے آخری عشرہ میں دیوبند پہنچے۔ تو شیخ الہندؒ کے ارشاد پر ''جمعیۃ الانصار'' کی داغ بیل ڈالی۔ جس نے تقریباً ۴ سال تک اگرچہ ظاہراً مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تعلم اور تبلیغ و ارشاد کا کام کیا لیکن حقیقت میں ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی قوت کو منظّم کرنا شروع کیا اور خطہ کی آزادی کیلئے کام کیا۔ چنانچہ خود حضرت سندھیؒ اپنے ایک خطبہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''جب ہم سندھ سے دیوبند پہنچے اور جمعیت الانصار کا کام کرنا شروع کیا' تو ہمارے پیشِ نظر حضرت شیخ الھندؒ کا یہ فرمان تھا کہ ''جب مسلمانوں کی حکمران طاقت اور ان کی فوجی قوت موجود نہ ہو' تو اس وقت ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنی جماعت بنائے اور جہاد کرے'' جہاد کے متعلق یہ نقطۂ نظر اور اس کے مطابق کام کرنا' یہ ہماری خصوصیت تھی' اور ہم نے اسے حضرت شیخ الھندؒ کی صحبت میں رہ کر حاصل کیا تھا'' (خطبہ صدارت جمعیت طلباء سندھ)۔

اسی طرح جب حضرت شیخ الہندؒ مالٹا میں گرفتار ہوتے ہیں تو سی آئی ڈی کے افسران نے جمعیۃ الانصار کے حقیقی مقاصد کی بابت بھی سوالات کئے۔ ظاہر میں جمعیۃ کے اغراض و مقاصد کیا تھے۔ انہیں حضرت سندھیؒ نے اسی وقت تحریر کر کے شائع کیا تھا۔ اس کے بین السطور سے حقیقی مقاصد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اس تحریر میں سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کا تعارف اور اس کے اغراض و مقاصد کا بیان ہے۔ پھر جمعیۃ الانصار کی اہمیت کا تذکرہ ہے۔ اوّلین جلسہ کی روئیداد ہے۔ اور اس اجلاس میں منظور شدہ قواعد کی ۵۹ دفعات ہیں' اس کے بعد جمعیۃ الانصار کے پانچویں اجلاس کی روئیداد ہے۔ جس میں منظور شدہ قواعد کی دفعہ نمبر ۳ کی مزید تشریح و تفصیل ہے۔ پھر اپریل ۱۹۱۱ء میں مراد آباد کے اجلاس عام میں منظور کردہ سات تجاویز اور ان کی تشریحات بیان کی گئی ہیں۔

رسالہ ''القاسم'' دیوبند میں مطبوعہ اس پوری تحریر سے جمعیۃ الانصار کا دستور العمل اور اس کے اغراض و مقاصد کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔ آزاد]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجامعۃ القاسمیہ (کا) دار العلوم دیوبند

الحمد للہ الذی احیٰی بذکرہ قلوب عبادہ العارفین واماط عن بواطنھم حجب الخفاء فقاموا لاحیاء علوم الدین والصلوۃ والسلام علی سیدنا ومولٰنا سید الاولین والآخرین وصفوۃ الانبیا والمرسلین وقائد الغر المحجّلین وخلاصۃ اللہ من خلقہ اجمعین و علی اٰلہ السادۃ المیامین و اتباعھم با حسان الی یوم الدین۔

امابعد: مخفی نہیں کہ مسلمانوں کا بقاءِ قوم ونظامِ تمدن ایک مذہبی دار العلوم کے قیام پر موقوف ہے۔ جس کے ذریعہ سے مسلمانوں میں اسلام کی حقیقی روح سرایت کر سکے اور اس کی آبیاری سے اسلامی چمنستان سرسبز و بارآور رہے اور اس زمانہ میں اس امر کا استحقاق صرف مدرسہ عالیہ دیوبند کو حاصل ہے۔

کیونکہ اس وقت تک بحیثیت مرکز علوم مذہبی اور مبداء ومنشاء مدارس دینی اس کے فیوض و برکات سے عام اہل ہند مستفید و مستفیض ہو رہے ہیں۔ اور جبکہ اس کو باقاعدہ دار العلوم کی صورت میں دیکھا گیا تو اسلامی علوم کا ایک مستحکم حصار اور اس کی اشاعت کیلئے اپنا سلسلہ قائم ہو جاویگا جس کے ذریعہ سے مسلمانوں کی تمام مذہبی ضرورتیں نہایت خوبی کے ساتھ پوری ہونگی۔ اور اسلامی علوم اسی پایہ پر نظر آنے لگیں گے جو کسی وقت دیکھے جاتے تھے۔ اور آج جو مسلمانوں پر بیجا الزام تعصب، تاریک خیالی، ناواقفی کے لگائے جاتے ہیں یا ان کو مذہب سے بیگانہ اور روارستہ سمجھا جاتا ہے سب مرتفع ہو جاویں گے۔

اس بیداری کے زمانہ میں جبکہ مسلمان اپنے فرائض سے پورے واقف ہوتے جاتے ہیں اوران کومعلوم ہوگیا ہے کہ اگر ہم کو اپنی تمدنی زندگی کیلئے ذرائع کسبِ دنیا کی پوری حاجت ہے تو اپنی فلاح آخرت کیواسطے مذہب سے واقفیت اوراحکام مذہب کی پابندی بھی لازمی امر ہے۔ وہ اگر ایک طرف گورنمنٹ سے اپنے حقوق طلب کرنے میں پوری جدوجہد سے کام لیتے ہیں تو دوسری جانب حقوق اللہ اورشعار مذہب کے نگاہ داشت کیلئے ہمہ وجوہ تیار ہیں، وہ قومیت اور مذہب کے فرق کو بخوبی سمجھ گئے ہیں۔ ان کومعلوم ہو گیا ہے کہ فقط قومیت کے محفوظ رکھنے سے مذہبی قوت قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ نشانات وامتیازات قائم کرنے کے واسطے تیار ہیں ایسی حالت میں کیا یہ سخت غلطی نہ ہوگی کہ مسلمان اپنا مکمل مذہبی دارالعلوم قائم نہ کریں۔ اور مذہبی معاملات وسلاسل کا انتساب اور رجوع اسی کی جانب نہ رکھیں۔

اور کیا اس سے بھی بڑھ کر سخت اور مہلک غلطی یہ نہ ہوگی کہ مذہبی روح کو اسکے معدن کے سوا دوسری جگہ سے طلب کریں۔ دنیا میں جس قدر قوتیں ہیں ان میں سے ہر ایک کا لگاؤ اپنے اپنے معدن سے ہے، ایک قوت اجنبی معدن سے کبھی مرتبط و منتفع نہیں ہو سکتی اور نہ تمام متفرق قوتوں کیلئے ایک معدن ہوسکتا ہے۔ برقی قوۃ اور بھاپ کی قوۃ دونوں کا خزانہ علیحدہ علیحدہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک قوۃ دوسرے کے معدن سے مستفید نہیں ہو سکتی۔

انہیں نظائر اور شواہد پر قیاس کرنے کے بعد کسی ذی عقل وفہم کو کچھ بھی تامل نہیں رہ سکتا کہ تمام قوتیں ایک معدن سے کبھی مستفید نہیں ہوسکتیں اور نہ ان میں سے کسی ایک کا اصل وجود ہوسکتا ہے اگر رہے گا تو صرف اسی کا جس کا اصلی معدن موجود ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بھاپ کا معدن برقی روح کو قائم رکھ سکے۔ اور مذہبی روح اپنے معدن کے سوا کسی

دوسری جگہ سے مستفید ہو کر قائم رہ سکے۔

اگر مسلمان بایں دانش و ہوش ایسا کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو یہ فعل خودکشی سے کسی طرح پر کم نہ ہوگا۔ مسلمان جس طرح یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہمارا وجود قانون شریعت کی محافظت' مذہبی روح کے بقاء' علوم اسلامی کے رواج اور اشاعت پر موقوف ہے اسی طرح ان کو یہ بھی سمجھنا فرض ہے کہ مذہبی علوم کیلئے کوئی ایسا دارالعلوم تجویز کریں جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے مذہبی سلاسل کو اقطار ہند میں تقویت پہونچ سکے۔

مذہبی دارالعلوم قائم کرنے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

۱۔ کسی نئے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی جائے اور مسلمان اپنی متفقہ کوشش سے فراہمیٔ سامان کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

۲۔ کسی موجودہ درسگاہ کو جس میں دارالعلوم بننے کی استعداد اور مادہ موجود ہو' دارالعلوم تسلیم کرلیا جائے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی حالت کبھی اسکی اجازت نہیں دیتی کہ ایک جداگانہ دارالعلوم کی بنیاد رکھیں اور اسکے لئے وہ تمام جدوجہد اختیار کریں جس کے بغیر اس کا قیام دشوار ہے۔ ان کے واسطے جو امر کہ ممکن اور سہل ہے وہ یہی ہے کہ کسی موجودہ درسگاہ کو دارالعلوم تسلیم کریں اور اس کے اندر جو کمی ہے اس کو رفع کر کے مکمل دارالعلوم کے درجہ پر پہونچادیں۔

مدرسہ عالیہ دیوبند نے گذشتہ چھیالیس سال میں وہ تمام خدمات ادا کیں ہیں جو ایک دارالعلوم کو کرنی چاہیئے۔ اس سے مسلمانوں کو وہی مفاد پہونچے جو ایک دارالعلوم سے پہونچتے ہیں۔ گو مدرسہ نے مدعی بن کر اس مسئلہ کو کبھی مسلمانوں کے سامنے پیش کر کے تسلیم کرانا نہیں چاہا۔ مگر وہ اپنی خاموش رفتار میں وہی کام کرتا رہا جو ایک مرکز سے ہونے چاہیئے

تھے اور اس کا اب بھی یہی خیال ہے کہ جہاں تک ممکن ہو گا ان تمام مذہبی علوم اور مذہبی کاموں کی تکمیل کرے گا۔ جن کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور جس حد تک مالی حالت اس کو اجازت دے گی وہ قدم آگے بڑھاتا جاویگا۔

مگر ہماری التجا مسلمانوں سے یہی ہے کہ وہ اپنے مذہبی امراض کو اور ان کے علاج اور طریقۂ علاج کا کماحقہ اندازہ کر کے اسکی فکر کریں کہ تمام مذہبی امور کیلئے ایک مکمل دار العلوم بنالیں۔ اور اگر وہ ایک مستقل اور جداگانہ مذہبی دار العلوم نہیں بنا سکتے اور ظاہر ہے کہ نہیں بنا سکتے تو مدرسہ عالیہ دیوبند کی طرف تھوڑی سی التفات کریں تا کہ وہ بہت جلد اس درجہ تک پہونچ جائے۔

مدرسہ عالیہ دیوبند نے تمام مقاصد کی رفتہ رفتہ تکمیل شروع کر دی ہے اور اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہے توفیق الٰہی شامل حال ہے تو بہت جلد وہ اس درجہ تک پہونچ جائے گا کہ مسلمانوں کو کسی دوسرے دار العلوم کی حاجت نہ رہے گی۔

جن مقاصد اور مدارج کا اظہار عظیم الشان جلسہ دستار بندی میں مسلمانوں کے تیس ہزار کے مجمع کے سامنے کیا گیا تھا بحمد اللہ ان کی تکمیل شروع ہو گئی ہے۔ اگر یہ سب مقاصد پورے اور مکمل ہو گئے اور انشاء اللہ تعالیٰ ہوں گے تو جو جو نقص تعلیم اور طریقۂ تعلیم و تربیت وتہذیب طلبہ اور کسب مکارم اخلاق میں ہیں۔ وہ سب رفع ہو جائینگے۔ اور حفاظت اسلام اشاعت علوم کی تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں گی اس وقت مسلمانوں کو یہ دقت کا سامنا ہے کہ حفاظت اسلام اور اشاعت مذہب کے واسطے جا بجا انجمنیں تو قائم ہو گئیں اور ان میں واعظ بھی مقرر کئے گئے' مگر کام کے واعظ نہیں ملتے' نہ واعظ بننے کیلئے تحصیل علم اور کسی قسم کی سند کی ضرورت باقی رہی ہے۔ نہ واعظوں کیلئے خاص اِن اوصاف کے ساتھ متصف ہونا شرط ہے۔ جن کی ضرورت ایک ایسی جماعت کو ہے جو رہبر اور ہادی و مبلغ ہو کر

نکلی ہے۔ان میں اکثر و بیشتر (اوخویشتن گم است کرارا رہبری کند) کے مصداق ہوتے ہیں۔

علیٰ ہذا تصنیف و تالیف کا صیغہ بھی ایسا عام ہو گیا کہ مصنف بننے کے واسطے ذی علم ہونا بھی شرط نہیں رہا جو شخص اردو میں کچھ لکھنے پڑھنے پر قادر ہے اس کو مصنف بن جانے سے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ آج اگر ہندوستان کی بے شمار تصانیف پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ان میں کا بیشتر حصہ ایسا دیکھا جاتا ہے جن کے مصنف ہرگز ذی علم نہیں، مسلمان بیچارے کیا کریں ان کے ہاتھ میں اردو کی کتابیں پہونچتی ہیں ان کو یہ تمیز کرنا دشوار ہے کہ قابلِ اعتماد کونسی ہے اور نا قابل اعتماد کونسی۔

پھر لطف یہ ہے کہ تصانیف بھی معمولی مسائل میں نہیں ہیں بلکہ عقائد و کلام اور اصول دین کے غامض (مشکل) اور دقیق مسئلوں کے متعلق ہوتی ہیں اس بارے میں یہاں تک جرأت بڑھ گئی کہ جو شخص اخباری مذاق اور طرز کی عبارت لکھنے پر قادر ہو گیا۔ چند یورپین اور جدید مصنفین کے معمولی رسالے یا اقوال اسکی نظر سے گذر گئے وہ اپنے آپ کو ایسا محقق سمجھنے لگتا ہے کہ تمام متکلمین و مفسرین پر بے دھڑک رد کرنے اور طعن کرنے سے اس کو کوئی چیز نہیں روکتی۔ تماشا ہے کہ کسی فن میں تصنیف کرنے کے واسطے اس فن کی واقفیت شرط ہوتی ہے۔ لیکن خاص مذہبی معاملات میں یہ شرط کسی درجہ میں بھی ملحوظ رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ حدیث کا ایک لفظ نہ پڑھا ہو۔ محدثین کی اصطلاحات سے واقفیت نہ ہو۔ تفسیریں نہ دیکھی ہوں مفسرین کے اقوال و ماخذ پر نظر نہ ہو۔ مگر کسی حدیث کو رد اور قبول کرنے کے لئے اپنا ذہنی معیار کافی سمجھا جاتا ہے۔ مفسرین کے تمام اقوال کا یکلخت بُرے پیرایہ میں رد کرنے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ ان کی رائے کے خلاف ہے۔

مسلمانوں کی آسمانی کتاب (قرآن مجید) جس پر مذہب کا مدار ہے اس کو طبع اور تصحیح کر کے شائع کرنے کے واسطے مسلم و غیر مسلم کی قید بھی نہ رہی۔ ترجموں کا تو یہ حال ہو

گیا کہ جس نے چاہا چند ترجمے سامنے رکھے اور ایک نیا ترجمہ بنا دیا۔ اس میں جدت پیدا کرنے کیلئے محاورے کی پابندی اس درجہ کی کہ اصل مرادِ خداوند عالم کو بھی بدل ڈالا۔ اس سے بھی آگے ترقی کر کے علمی دنیا میں وقعت پیدا کرنی چاہی تو تمام محدثین وفقہاء کے خلاف اپنی رائے سے کچھ باتیں اضافہ کر دیں۔

ان تمام خرابیوں کا انسداد اور سدِّ باب ہوسکتا ہے تو اس طرح کہ مسلمانوں کے تمام مذہبی سلاسل کا انتساب وارتباط کسی ایک مرکز سے قائم ہو جاوے۔ ان کی دینی قوت مجتمع ہو جاوے ایک مذہبی دارالعلوم تسلیم کرلیا جائے جس کے طریقہ اور منوال پر بڑے اور متوسط اور ابتدائی مدارس قائم ہو جائیں۔ اگر مسلمان کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ان کو اپنے مذہب کا پاس ہے وہ اپنے مذہب کی اشاعت میں کچھ حصہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے پاک مذہب کو اغیار کے حملوں سے بچانے کو فرض خیال کرتے ہیں اگر وہ اشاعت اسلام کو صحیح طریقہ پر وسعت دینا ضروری جانتے ہیں اگر ان کو یہ خیال ہے کہ ان میں مستند اور معتبر لائق اقتداء نمونہ سلف علماء پیدا ہوں۔ اور ان میں لائق متدین ذی استعداد خوش بیان واعظ بکثرت پائے جائیں۔ ان میں متکلم ومناظر جماعت کی کمی نہ رہے۔ تو ان کیلئے بہت ضروری ہے کہ جس قدر ممکن ہو تمام دینی ضروریات کو کسی مذہبی دارالعلوم سے وابستہ اور منسلک کریں اور اس کے ماتحت ہر قسم کے مذہبی اور اسلامی علوم کی تعلیم گاہیں قائم کریں۔

مسلمان اگر مسلمان رہ کر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ان کی فلاح وبہبود کا یہی طریقہ ہے جو ہم نے بیان کیا۔ یہ ہمارا خیال ہے جس کو ہم نے ظاہر کیا۔ اور ایک عرصہ سے اکثر واقف کار اہل علم اور ہمدرد حضرات کے قلوب میں بے چینی کے ساتھ خطور (تحریک پیدا) کر رہا ہے۔ جن حضرات کے دل میں اسلام کا سچا درد ہے وہ خود ان مہلک عقبات (گھاٹیوں) پر نظر ڈالکر ان سے نجات کی فکر کریں۔

جمعیۃ الانصار کا قیام

جمعیۃ الانصار اس مفید و بغایت کار آمد و نافع مجلس کا نام ہے جو مدرسہ اسلامیہ عالیہ دیو بند کے فیض یافتہ جلسہ کے اتفاق رائے سے ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ کو قائم ہوئی۔ یہ انجمن جن مفید اغراض و مقاصد کیلئے قائم ہوئی ہے۔ ان میں سب سے بڑا مقصد مدرسہ اسلامیہ دیو بند کی تائید اور اس کے اثر کی ترویج' اور عامۂ مسلمین کے اغراض مذہبی میں (جس قسم کی بھی ہوں) امداد دینا ہے۔ اور جن خیالات کو یہ انجمن اپنے پیش نظر کئے ہوئے ہے اگر وہ سب باذنہ تعالیٰ پورے ہو گئے تو یہ مجلس انشاء اللہ تعالیٰ ہندوستان کی بہترین مجالس میں ہوگی۔ جس کا نفع جو خاص بھی ہے وہ بھی عام ہے۔ کیونکہ مدرسہ دیو بند کی تائید اور اس کے اثر کی ترویج تمام مسلمانوں کا عام نفع ہے جس سے انکے علمی و مذہبی فوائد وابستہ ہیں۔ اور جو نفع عام ہے اس کے عام اور شامل ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہے۔

اس انجمن نے اپنے عملی کام شروع کر دیئے ہیں۔ اور اس کا بڑا جلسۂ علمی جس کا نام ''موتمر الانصار'' تجویز کیا گیا ہے اس سال بمقام مراد آباد ماہ ربیع الثانی ۲۹ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۱۱ء میں نہایت خوبی اور شان سے منعقد ہوا۔ یہ جلسہ تمام پہلوؤں سے اپنی نوعیت میں بے مثل تھا۔ اہل مراد آباد نے کمال اخلاص و نیک نیتی سے جلسہ کے تمام انتظام بہت خوبی سے کئے۔ دل کھول کر خرچ کیا اور نہایت دریا دلی اور کشادہ پیشانی سے مہمانوں کی مدارت کی۔ علماء کے مواعظ اور تقریریں بھی ایسی ہوئیں جن سے بہت کم کان آشنا تھے۔ ''الانصار'' کے مقاصد بھی نہایت وضاحت سے بیان کر دے گئے۔ اور تمام حاضرین و سامعین نے ان تجاویز کے مفید ہونے کو بلا انکار تسلیم کر لیا۔ موتمر الانصار کے بعد ہی مراد آباد میں الانصار کی ایک با قاعدہ شاخ (قاسم المعارف) قائم ہوگئی۔ اور بزرگان مراد آباد نے بہت خوبی سے قاسم المعارف کی رکنیت و اہتمام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

اس تھوڑے سے عرصہ میں جمعیۃ الانصار کی مقبولیت ترقی پذیر ہے اور مسلمان عموماً اس کے کارناموں کو امید ورغبت وشوق وانتظار کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ بہت سی اسلامی انجمنیں اس کی سرپرستی میں آنے کیلئے آمادہ ہیں جمعیۃ الانصار کی شاخیں یعنی قاسم المعارف بھی جگہ جگہ قائم ہوتی جاتی ہیں۔ ابھی حال میں ایک شاخ بمقام کلکتہ اور دوسری بمقام کراچی (کراچی) قائم ہوئی ہے۔ یہ آثار بہت امید افزا ہیں۔ جس وقت بعونہ تعالیٰ انجمن اپنے پورے ارادوں میں کامیاب ہوگی تو ہم کو کامل یقین ہے کہ مسلمانوں کا بھروسہ اس پر بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ اور وہ اس کو مفید ترین کام سمجھنے لگیں گے۔

جمعیۃ الانصار ۲۷ھ میں قائم ہوئی اور مناسب تھا کہ ۲۷ھ کی روداد میں اس کا ذکر کیا جاتا مگر چونکہ وہ بہت ہی ابتدائی حالت میں تھی اور اس نے عملی کام شروع نہ کئے تھے اس لئے بالعموم اس کے ذکر سے اغماض (پہلوتہی) کیا گیا۔ اس روداد میں بھی بہت ہی اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ اور جمعیۃ الانصار کے ان اہم مقاصد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو اس کو پیش نظر ہیں۔ ان مقاصد کو ملاحظہ کرنے کے بعد جمعیۃ الانصار کے مفید وغیر مفید ہونے کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

عبیداللہ سندھیؒ

دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جمعیۃ الانصار

الحمد للہ رب العالمین اکمل الحمد علی کل حال و الصلوۃ والسلام الا تمّان الا کملان علی سیّد المرسلین کلّما ذکرہ الذاکرون وکلما غفل عن ذکرہ الغافلون اللّٰھم صلّ علیہ وعلی الہ وسائر النبیین واٰل کلھم وسائر الصالحین نھایۃ ینبغی ان یسئالہ السائلون۔

امابعد: ابوالحسین عبیداللہ بن الاسلام السندھی مدرسہ عالیہ دیو بند اور جمعیۃ الانصار کے متعلق معلومات تازہ کرنے کی غرض سے عرض پرداز ہے کہ اہل علم کی نظر میں کوئی تعلیم گاہ اسلامی دارالعلوم یا مذہبی یونیورسٹی نہیں بن سکتی جب تک اس میں آنحضرت ﷺ کی تعلیمات شائع کرنے والے معنوی خلفاء تیار کرنے کا پورا تہیہ نہ کرلیا جاوے۔

جن کی تفصیل میں شاہ ولی اللہ قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں۔ ’’المعتنیّن بتعلیم الشرائع والقرآن والسنن والآمرین بالمعروف والناھین عن المنکر والذین یحصل بکلامھم نصرۃ الدین، إما بالمجادلۃ کا لمتکلمین أو بالموعظۃ کخطباء الاسلام اوبصحبتھم کمشائخ الصوفیہ الذین یقیمون الصلوۃ والحج والذین یدلون علی طریق اکتساب الا حسان والمرغبون فی التنسک والتزھد والقائمون بھذاالا مر ھُم الذین نسمّیھم بالخلفاء الباطنین‘‘۔

[ترجمہ: ''جو قرآن وسنت اور شریعت کی تعلیم کی طرف متوجہ ہونے والے ہوں۔ اور بھلائی کا حکم قائم کرنے والے اور برائی کو روکنے والے ہوں، وہ ایسے لوگ ہوں کہ جن کی گفتگو سے دین کا غلبہ ہوتا ہو۔ خواہ مباحثہ کے ذریعہ جیسے متکلمین ہیں یا وعظ و نصیحت کے ذریعہ جیسے خطباء اسلام ہیں۔ یا ان کی محبت اور توجہ سے دین کا غلبہ ہو جیسے مشائخ صوفیہ جو نماز و حج قائم کرتے ہیں اور احسان کے طریقہ کار کی راہنمائی کرتے ہیں اور جو زہد و پرہیز گاری میں رغبت رکھتے ہیں۔ اور جو ان تمام امور کو سرانجام دیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں ہم خلفاء باطن کہتے ہیں''۔]

ایسے دارالعلوم کیلئے برٹش گورنمنٹ کی اس درجہ کی سرپرستی و امداد تو حاصل ہو ہی نہیں سکتی جو ایک ایسی یونیورسٹی یا کالج کیلئے ممکن ہے جس میں ترقی یافتہ یورپ کی شاگردی مقصود بالذات ہو خصوصاً جب قوم کے اس حصہ کا (جس کی آواز گورنمنٹ تک بآسانی پہونچ سکتی ہے) یہ فتویٰ ہو کہ ''خاص مشرقی علوم کی نسبت ہم کو گورنمنٹ کی توجہ درکار نہیں اسکی تعلیم جس طرح کہ ہمارے قدیم طریقہ پر ہماری قوم کی عالموں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اس کو اسی طرح رہنا چاہیئے۔ اور خود ہماری قوم کو اس کے باقی اور قائم رہنے پر ایسے لوگوں میں جو اس کی خواہش رکھتے ہوں توجہ رکھنی لازم ہے مشرقی علوم جو مسلمانوں میں قدیم سے اب تک رائج ہیں وہ مذہبی مسائل سے ایسے مخلوط ہیں کہ جدا نہیں ہو سکتے۔ اور اس لئے گورنمنٹ کو اس کا اختیار کرنا مناسب نہیں اور اگر مذہبی مسائل کو اس سے خارج کیا جاوے تو کوئی شخص جو مشرقی علوم کا خواہاں ہے اس کو پسند نہیں کرے گا اور اگر کسی وجہ سے اسکو اختیار کرے گا تو مسلمان کمیونٹی میں اس کی کچھ وقعت نہ ہوگی۔''

فقہاء اسلام اسلامی ممالک میں قومی تعلیم بلکہ تمام قومی ضروریات کا ذمہ دار جس طرح مسلمان بادشاہ کو قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح غیر مسلم گورنمنٹ کی مسلمان رعایا کو اپنے اتفاق سے اس فرض کفایہ کے ادا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

اب مسلمانوں کو اگر اپنی علوم دین کی حفاظت منظور ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی آئندہ نسلوں میں بھی ان کے اسلاف کے سے عقائد۔ اخلاق۔ طریق تمدن۔ و معاشرت باقی رہیں۔ سلف صالحین کی بے تکلفی، بیدار مغزی، عالی ہمتی، خدا شناسی کے زندہ یادگار ریں سامنے پیش ہوتی رہیں تو ان کو اس دارالعلوم کے استحکام و ترقی میں بلا پس و پیش ایک مدتِ دراز تک مسلسل کوشش کا عزم مصمم کر لینا چاہیئے جس کی بنیاد مسلمانوں کے مقدس عالموں کے ہاتھ سے رکھی گئی اور اب تک انہیں کے زیر سایہ تدریجی ترقی کر رہا ہے جس میں قوم کا اعلیٰ و ادنیٰ فرد مساویانہ حیثیت سے لیا جاتا ہے جس میں دنیاء اسلام کے اطراف و اکناف سے مخلص عباداللہ (اللہ کے بندے) بغیر کسی ظاہری کوشش کے محض بتائیدِ الٰہی کھچے چلے آ رہے ہیں جس کے شیخ الحدیث (شیخ الہندؒ) پر اس وقت بفضلہٖ تعالیٰ بلا مبالغہ صادق آتا ہے۔ الناس یضربون اکبادالابل فلا یجدون عالماً اعلم منه (لوگ دور دراز سفر کر کے ان سے تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں اور ان سے بڑا کوئی اَور عالم نہیں پاتے) جس نے گذشتہ نصف صدی میں جب قوم کسی مذہبی کام کو شاندار حیثیت سے دیکھنے کے قابل نہ تھی۔ نہایت اطمینان و خاموشی کے ساتھ ہزار سے زائد عالم تیار کر کے حفاظت اسلام کا فرض ادا کیا جس کے مقدس بانی کی تمنا بفضلہٖ تعالیٰ اس کے مستقبل کو شاندار بنا کر ہی رہے گی۔ جب یہاں سے مشرق و مغرب میں اشاعت اسلام کیلئے وفد پر وفد جاری ہوں گے۔

مذہبی تعلیم سے نفرت ظاہر کرنے کے زمانہ میں جب دیوبندی عالم تمام مساجد و مدارس کے علاوہ قومی انسٹی ٹیوشنوں (تعلیمی اداروں) محکمہ دینیات کی نظامت۔ اسلامی ریاستوں کے دارالقضاء اور دارالافتاء پر قابض نظر آتا ہے اسلامی آبادی کے کثیر حصہ پر وعظ و تدریس و تالیف و ارشاد کے ذریعہ سے حکومت کر رہا ہے، حجاز۔ شام۔ افغانستان کے عالموں میں ممتاز رتبہ حاصل کر چکا ہے۔ یورپ اور افریقہ بھی اس سے ناآشنا نہیں رہا تو اس

وقت جب کہ عام افراد قوم میں مذہبی تعلیم سے علیحدہ رہنے کے نقصانات کا ہلکا سا احساس پیدا ہو چلا ہو نہایت ضروری ہے کہ حاملین دارالعلوم اپنے انتظامات کو وسیع کر کے اس پیمانہ پر لانے کی کوشش کریں کہ جس سے تشنہ کام قوم کے تمام طبقات بآسانی سیراب ہو سکیں۔ لیکن اس قسم کی کوششوں سے پہلے اپنی منتشر قوت کا جمع کرنا اس درجہ ضروری ہے جیسے تعمیر مکان کیلئے اینٹ پتھر وغیرہ۔ جب تک سامان پورا مہیا نہ ہو تو کسی تجویز میں کامیابی بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے۔

الحمد للہ کہ اس مبارک تمہید کی ابتداء **جمعیۃ الانصار** اور عظیم الشان جلسہ دستار بندی مدرسہ عالیہ کی صورت میں شمس الائمہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب صدر المدرسین، اور فخر الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم۔ جو مقدس بانی قدس سرہٗ کے ظاہری باطنی جانشین ہیں۔ کی متفقہ کوششوں سے نمودار ہوئی۔ جمعیۃ الانصار کے قواعد ومقاصد جس قدر اب تک مرتب ہو چکے ہیں آپ کے پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ ان کے ملاحظہ سے جمعیۃ کی پوری حقیقت سمجھنے میں آسانی ہوگی یہ ایسے مقاصد ہیں جن کی تکمیل کیلئے بہت بڑی محنت اور وقت کی ضرورت ہے، بڑی بھاری غلطی ہوگی اگر قوم تھوڑی سی کوشش کے بعد دفعتًہ بڑے نتیجے کی متوقع رہے یا بعض لازمۂ بشریت فروگذاشتوں پر بجائے چارہ ساز بننے کے یارِ ناصح بننے کو کافی سمجھے۔ ربنا لا تواخذنا ان نسينا او اخطانا . ربنا ولا تحمل علينا اصرا كما حملته على الذين من قبلنا، ربنا ولا تحملنا ما لا طاقة لنا به، واعف عنا واغفرلنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا على القوم الكافرين.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

امابعد

مختصر روئداد جلسۂ جمعیۃ الانصار لطلبۃ المدرسۃ

العالیہ الاسلامیہ الدیوبندیہ

منعقدہ

۲۷۔رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء یوم چہار شنبہ بمقام دیوبند

بصدارت

سلطان العلماء حضرت مولانا مولوی محمود حسن صاحب مدظلہم العالی

مدرسہ عالیہ دیوبند کی عظمت و برکت اور اس کے عام احسان کا احساس ہر قلب مسلم میں دیکھا جاتا ہے' اور کیوں نہ دیکھا جائے' مدرسہ نے مسلمانوں کے دلوں کو اس وقت زندہ کیا جب کہ وہ گرداب جہل میں پھنس کر حیات علمی کھونے کے قریب پہونچ گئے تھے اس نے انکی اس وقت رہبری کی جب کہ وہ بے علمی کے بھول بھلیاں میں پھنس چکے تھے مدرسہ نے صراط مستقیم اور طریق نبوی ﷺ کے آثار کو اس وقت نمایاں کیا جب کہ ان

کے مٹنے کے اسباب مہیا ہورہے تھے۔

مدرسۂ عالیہ دیوبند ایک قدیم ترین مدرسہ ہے جو تمام اسلامی مدارس سے پیشتر اورسب سے زیادہ اشاعت ملت بیضاء کررہا ہے یہی ایک مدرسہ ہے جس نے اسلام حقیقی اور کلام اللہ اور حدیثِ نبوی کی حقیقت کو سمجھا ہے اور مسلمانوں کے قلوب میں ٹھیک اسلامی مسائل وعقائد کو راسخ کیا ہے۔ یہی ایک مدرسہ ہے کہ جس کے نقش قدم پر چلنے والے کثیر التعداد مدارس اسلامی مسلمانوں کی اعلیٰ اسلامی خدمات کررہے ہیں **اللھم زدفزد۔**

چونکہ مدرسہ عالیہ دیوبند کا احسان عام ہے اس لئے حسب ارشاد **ھل جزاء الاحسان الا الاحسان** اس کی خدمت اُسکی امداواعانت بھی عام اہل اسلام پرواجب ہے لیکن مصرع۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد

عام مسلمانوں سے بڑھ کر اس کے احسان عام کی ثناء اگر لازم ہے تو خاص انہیں حضرات کے اوپر جن کو بلاواسطہ اس بحرالعلوم سے زلہ ربائی کا موقع ملا، اور جن کو مدرسہ عالیہ دیوبند کے طالب علم رہنے کا فخر حاصل ہو چکا ہے اس لئے اگر سابق طلبہء مدرسہ عالیہ مدرسہ کی اعانت و امداد اور اراکین مدرسہ کے دست و بازو بن کر کام کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ اور مسلسل جاری رہنے والی مجلس قائم کرلیں تو بے حد مناسب ہوگا۔ جس سے نہ صرف مدرسہ عالیہ کی عظمت قائم اور برکت وسیع ہوگی بلکہ وہ اپنے علمی باپ کی خدمت کرنے سے دنیا میں روحانی راحت، فخر وعزت اور دین میں ہر قسم کے جاری رہنے والے ثواب حاصل کریں گے۔

یہ خیال تھا جو عرصہ سے بندہ کے دل میں گذرتا تھا اور جس سے ہر سننے والا اتفاق کرتا تھا۔ اتفاقاً بندہ مع مولوی ابومحمد احمد صاحب چکوالی و مولوی محمد صادق صاحب کراچوی،

حضرت مولانا مولوی محمود حسن صاحب مدظلھم العالی و جناب مولانا مولوی مفتی عزیز الرحمٰن صاحب و جناب مولانا مولوی حافظ احمد صاحب کی زیارت کیلئے آخر عشرۂ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ میں دیوبند پہونچا۔ اس موقع پر ہم تینوں یاروں نے مل کر ارکان مدرسہ کی خدمت میں اپنی دیرینہ آرزو اور پرانے خیال کو دہرایا۔ اور حضرت مولانا مدظلھم العالی سے رمضان المبارک کی ۲۷ شب مقدس کو اس مجلس کی انعقاد کی منظوری حاصل کر لی۔ حُسن اتفاق سے رمضان المبارک کی تعطیل میں دیوبند کے رہنے والے سابق طلبہ اکثر دیوبند تشریف فرما تھے اور بعض بیرونی طلبہ بھی ایمان تازہ کرنے اور رمضان المبارک کا حقیقی لطف اٹھانے کے لیے ہم خدام کی طرح یہیں حاضر تھے اس لیے سب ایسے حضرات اور اکابر مدرسہ کی خدمت میں بندہ نے ایک گشتی اعلان لے جا کر ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ کو ۹ بجے مدرسہ میں جمع ہونے کی درخواست کی خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ سب نے میری ضعیف مگر با موقع آواز پر کان دھرا اور توجہ سے سن کر وقت مقررہ پر تشریف لائے۔

اسمائے شرکاء جلسہ

سلطان العلماء حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلہم' جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم مدرسہ' جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مددگار مہتمم' جناب مولانا محمد فاضل صاحب' جناب مولانا مولوی محمد ناظر حسن صاحب' جناب مولانا ابو محمد احمد صاحب چکوالی' جناب مولانا محمد صادق صاحب کراچی' جناب مولانا عبدالمومن صاحب' جناب مولوی ضیاء الحق صاحب' جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی' جناب مولوی نور الحسن صاحب دیوبندی' جناب مولوی محمد یسین صاحب' جناب مولوی شبیر احمد صاحب' جناب مولوی عبدالسمیع صاحب' جناب مولانا گل محمد خانصاحب' جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب مدراسی' جناب

مولوی حافظ کفایت اللہ صاحب گنگوہی' جناب مولوی سلطان علی صاحب بریلوی۔ جناب مولوی محمد شفیع صاحب' جناب مولوی محمد میاں صاحب' جناب مولوی عبداللطیف صاحب' جناب مولوی ظہور الحق صاحب' جناب مولوی غلام رسول صاحب پنجابی' جناب مولوی ظہور محمد صاحب سہارنپوری' جناب مولوی محبوب شریف صاحب حیدرآبادی۔

کاروائی ۱۰ بجے کے بعد سے شروع ہوئی اس سے پیشتر مولانا ناظر حسن صاحب مدرس اول مدرسہ اسلامیہ ریاست چھتاری کے علاوہ سب حضرات تشریف لے آئے تھے'

اول حافظ قاری محمد طیب سلمہٗ تعالیٰ ابن مولانا حافظ احمد صاحب نے سورۂ صف خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کی اس کے بعد بندہ نے اپنے مربی علمی مدرسہ عالیہ دیوبند کے حقوق اور انعقاد مجلس کی ضرورت پر مختصر تقریر کی جس کا حاصل یہ تھا۔

خلاصہ تقریر بندہ ناظم

خدا تعالیٰ جل شانہٗ نے توحید کے بعد برالوالدین کا مرتبہ رکھا ہے۔ توحید حاصل کرنے کے بعد جیسا کہ اپنے آبائے حقیقی کی خدمت واطاعت اوران کے حقوق کی حفاظت لازمی ہے' ایسا ہی اپنے علمی آباء (مدرس واساتذہ) کی خدمت اور ادائے حقوق ضروری اور سعادتمند فرزندان کے فرائض منصبی میں داخل ہے' اور یہ خدمت واطاعت کسی درجہ میں بھی ان پر احسان شمار نہ ہوگا بلکہ آباء کے پہلے احسانات کا جزوی بدلہ سمجھا جائے گا۔ پس اسی قاعدہ کے موافق ہم (طلبہ مدرسہ اسلامیہ دیوبند) پر اس کے گذشتہ احسانات کے عوض میں اس کے ہر کام سے دلچسپی رکھنا اور ہر امر میں ہمت مردانہ اور گرمجوشی کیساتھ امداد کرنا ضروری ہے اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ایک مجلس کے انعقاد کی ضرورت ہے جو ہم لوگوں کو ہوشیار کرکے مدرسہ کے بارے میں ہمارے فرائض سے ہم کو آگاہ کرتی رہا کرے۔

بندہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو استاذ العلماء حضرت مولانا مدظلہم نے اسکی تائید میں ایک مفصل تقریر فرماتے ہوئے مجلس کی ضرورت ظاہر فرمائی حضرت مولانا کی دوران تقریر میں جناب مولانا ناظر حسن صاحب تشریف لے آئے تھے ان کے بعض سوالات کے جواب میں مولانا مدظلہم نے تقریر فرماتے ہوئے بعض ان اہم واقعات وضروریات کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس کی وجہ سے اب ایسا کرنا ناگزیر ہوگیا ہے۔اس درمیان میں جناب مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ (ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ) وغیرہما نے بھی تقریریں فرمائیں اور معمولی بحث کے بعد مجلس کے انعقاد کی ضرورت باتفاق رائے تسلیم کی گئی۔اور آگے کارروائی شروع ہوئی۔

مجلس کا نام تجویز کیے جانے کا مرحلہ پیش ہوا' بندہ نے اس کا مقصد دیکھتے ہوئے الانصار۔(مددگار جماعۃ) پیش کیا جو منظور کیا گیا۔

بعد ازاں مقاصد وقواعد مجلس میں پیش ہوئے۔معمولی بحث کے بعد ان میں معمولی تغیر کیا گیا (جن کی دفعات وار تفصیلات آئندہ صفحات میں آرہی ہیں) بعض امور ضروریہ اس اجلاس میں طے ہوئے جن کا ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

امور طے شدہ

(۱) دفتر الانصار مدرسہ عالیہ دیوبند میں رہے گا۔

(۲) ناظم الانصار ابوالحسین عبیداللہ السندہی۔اور نائب ناظم مولوی ابوالحامد محمد میاں صاحب انصاری۔اور مولوی ظہور الحق صاحب تجویز ہوئے۔

(۳) روئداد اجلاس ہذا پانچ ہزار طبع ہو۔

(۴) مہر مجلس کی علیحدہ بنے۔

(۵) رسیدیں طبع ہوں۔

(۶) اخبارات میں مجلس کے مضامین شائع ہوں۔ بالفعل موجودہ اسلامی اخبارات کے ذریعے سے کاروائی مشتہر کی جائے۔

(۷) یہ تجویز جوش کے ساتھ منظور ہوئی کہ سعی ایسے پیمانہ پر ہو کہ جلسہ دستار بندی تک ارکان مجلس تین سو اور معاون ایک ہزار پیدا ہوسکیں۔

(۸) اسی عرصہ میں کم از کم دو ہزار روپیہ جمع ہو۔ تاکہ مجلس جلسہ دستار بندی کے موقع پر مدرسہ کی کوئی خاص خدمت کر سکے۔ اور مجوزہ اخبار جاری ہو سکے۔

(۹) عام چندہ کی مقدار ۲۔ فی کس طے ہوئی۔

(۱۰) ایک مجلس خاص جو نصاب اور نظام مدرسہ اور طرز تعلیم کے بارہ میں غور و فکر کرے جمعیۃ الانصار کے ارکان ذیل سے مرکب کی گئی۔

مولانا مولوی ناظر حسن صاحب، مولانا مولوی مرتضٰی حسن صاحب، مولانا شاہ وارث حسن صاحب بنارسی، مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، مولانا حسین احمد صاحب مدنی مولانا کفایت اللہ صاحب شاہجہاں پوری۔ مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی۔ مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی، نیازمند عبیداللہ ناظم۔

عبیداللہ عفی عنہ

ناظم الانصار دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علے عبادہ الذین اصطفےٰ

امابعد

قواعد ومقاصد الانصار دیوبند

۱۔ اس جمعیۃ کا نام الانصار (مددگار جماعۃ) ہے۔

۲۔ اس جمعیۃ کا مرکز مدرسہ عالیہ دیوبند ہے اور حسب ضرورت اس کی شاخیں جہاں جہاں مناسب ہوں قائم کی جائیں گی۔

۳۔ اس جمعیۃ کی غرض مدرسہ عالیہ دیوبند کے مقاصد کی تائید وحمایت اور اس کے پاک اثر کی ترویج واشاعت ہے۔ ملکی معاملات سے اسے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۴۔ اس جمعیۃ کے ارکان مدرسہ عالیہ (عربیہ) دیوبند کے سابق تعلیم یافتہ حضرات ہوں گے مدرسہ کی تعلیمی، انتظامی، مالی ترقی میں انتہائی کوشش کرنا ہر ایک کا فرض ہو گا۔

۵۔ مدرسہ عالیہ کے ممبران شوریٰ وارکان مجلس منتظمہ اس جمعیۃ کے سرپرست ہوں گے۔ جمعیۃ کی کوئی کاروائی ان کے منظور کئے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

۶۔ اس جمعیۃ کے مقاصد کی تائید وہمدردی میں دیگر اہل علم اگر عملی حصہ لیں تو اعوان کہلائیں گے۔ معاونین جمعیۃ کے اجلاسوں میں مثل ارکان شریک ہو سکتے ہیں۔

۷۔ جمعیۃ کے ہر قسم کے جلسوں میں اگر سر پرست حضرات شامل ہوں تو اپنی جماعت میں سے کسی ایک کا صدارت کیلئے انتخاب کرنا ان کا حق ہوگا۔ اور بصورت عدم موجودگی سر پرستان ارکان کثرت رائے سے صدر انجمن مقرر کرینگے۔

۸۔ جمعیت اپنے مالی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے علاوہ چندۂ ارکان ومعاونین عام مسلمانوں سے ایک خاص مقدار کا چندہ وصول کرنے کی کوشش کرے گی۔

۹۔ مخلصین کے عطایا عام اغراض کیلئے ہوں یا خاص خاص مقصد کیلئے جمعیت بکمال شکریہ قبول کرے گی، اورانہیں معطی کی شرط کے مطابق صرف کرے گی۔

۱۰۔ اس جمعیۃ کا خزانہ ''خزینۃ الانصار'' کہلائے گا۔ خزینۃ الانصار میں جو رقوم جمع ہونگی سوائے مقاصد جمعیۃ اور کسی غرض کیلئے صرف نہ ہوسکیں گی اور نہ کسی شخص یا جماعت کو قرض دیا جائے گا، خزینۃ الانصار خزانہ مدرسہ عالیہ کے ضمن میں محفوظ رہے گا۔

۱۱۔ اس جمعیۃ کی تمام کاروائی کا کوئی شخص واحد مالک نہ ہوگا بلکہ حاکم جمعیۃ ہوگی اور اپنے اجلاس کے ہر قسم کے فیصلے نافذ کر سکے گی، بالفاظ دیگر یہ مجلس سابق تعلیم یافتگان مدرسہ عالیہ کی قومی وجمہوری انجمن ہے۔

۱۲۔ شرکاء چندہ میں سے ہر ایک شخص جمعیۃ کا حساب دیکھ سکتا ہے۔

۱۳۔ جمعیۃ کے سب اجلاسوں میں کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا۔ اور صدر انجمن اگر سر پرست نہ ہوں تو صدر کی رائے دو کے برابر سمجھی جائے گی۔

۱۴۔ یہ جمعیت ارکان میں سے ایک مدبر، تجربہ کار منتظم، امین، معتمد اور باخدا شخص کو ناظم مقرر کرے گی، جائز اختیارات برتنے میں وہ جمعیۃ کا پورا قائم مقام ہوگا۔

۱۵۔ اس جمعیۃ کے اجلاس (۱) اجماع الانصار۔ (۲) جلسہ انتظامیہ، (۳) جلسہ علمیہ پر مشتمل ہونگے۔

ارکان ومعاونین

۱۶۔ اس جمعیۃ کی شرکت کیلئے ضروری ہوگا کہ ہر ایک رکن یا معاون ایک درخواست پیش کرے جس میں تصریح ہو کہ میں الانصار کے قواعد ومقاصد پر مطلع ہو کر حسب الاستطاعۃ اس کے مقاصد کی پوری تائید اور قواعد کی پوری پابندی کا وعدہ کرتا ہوں۔

۱۷۔ ہر ایک رکن یا معاون کیلئے ضروری ہوگا۔ کہ درخواست کے ساتھ ایک روپیہ چندہ داخلہ بھیجدے۔

۱۸۔ ہر ایک رکن کو اپنی آمدنی میں سے ایک روپیہ فیصدی دائماً دینا ہوگا اور ہر ایک معاون چار آنہ ماہوار یا تین روپیہ سالانہ دے گا۔

۱۹۔ ارکان یا معاونین وقت پر چندہ نہ بھیجنے سے خارج نہیں ہو سکتے مگر یہ ضرور ہے جب وہ کوئی تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں تو بقایا ان کے ذمہ نہ ہو۔

۲۰۔ اگر ارکان یا معاونین میں سے کوئی شخص جمعیۃ کے مقاصد یا قواعد سے انحراف کرے تو جمعیت اس سے جواب طلب کرے گی ۔ اور بصورت عدم اطمینان بمنظوری سرپرست اسکی علیحدگی کا اعلان کردے گی۔

۲۱۔ حضرات سرپرست کے اتفاق یا کثرت رائے سے اگر کوئی رکن یا معاون جمعیۃ کے مقاصد سے منحرف سمجھا جاوے تو جمعیۃ اسے جواب طلب کئے بغیر علیحدہ کر دے گی۔

جلسہ اجماع الانصار

۲۲۔ اجماع الانصار اس جمعیۃ کا پورا قائم مقام ہے' اس جلسہ کا فیصلہ قطعی ہوگا' اس

لئے تمام شرکاءِ جمعیۃ کو اس کا فیصلہ ماننا ضروری ہے۔ الانصار جب مطلق استعمال ہوگا تو اس سے یہی جلسہ مراد ہوگا۔

۲۳۔ وضع ضوابط و ترمیم و تنسیخ قواعد۔ تقرر جلسہ انتظامیہ' جلسہ عزل و نصب ناظم۔ محاسبہءِ عہدہ داراں۔ اجازت مصارف' علیحدگی ارکان و معاونین مختلف کاموں کیلئے خاص خاص جماعتیں مقرر کرنا اجماع الانصار کا کام ہوگا۔

۲۴۔ اجماع الانصار منعقد نہیں ہوسکتا۔ جب تک اس میں۔

(الف) حضراتِ سرپرست موجودہ مرکز شامل نہ ہوں۔

(ب) ناظم اور سب نائب شامل نہ ہوں۔

(ج) جب ارکان جمعیۃ کی تعداد سو تک ہو تو پانچواں حصہ اور جب تین سو ہوں تو دسواں حصہ اور جب اس سے بڑھیں تو کم از کم پچاس شامل نہ ہوں۔

(د) معاونین میں سے کم از کم تین سے دس تک شامل نہ ہوں۔

۲۵۔ بوقت اشد ضرورت ارکان کی تحریری رائے ان کی حاضری کے قائم مقام ہوگی۔

۲۶۔ اجماع الانصار کا معمول کے مطابق انعقاد سال میں ایک بار ہوگا۔ اور بوقت ضرورت سال سے پہلے بھی ہوسکتا ہے۔

۲۷۔ اجماع الانصار کی تاریخ انعقاد وہی ہوگی جس میں حضرات سرپرست شوریٰ مدرسہ عالیہ کیلئے جمع ہوں۔

۲۸۔ اجماع الانصار کی کاروائی پر جمیع حاضرین کے دستخط ہوا کریں گے۔

۲۹۔ شرکاءِ جمعیۃ کو تاریخ انعقاد جلسہ اور امور زیر بحث سے ایک ماہ پیشتر اور روائیداد جلسہ سے ۱۵۔ روز کے اندر اطلاع دی جائے گی۔

جلسۂ انتظامیہ

۳۰۔ جلسۂ انتظامیہ میں ناظم اور نائب ناظم کے سوا اور دس ارکان جن کو اجماع الانصار ایک خاص مدت تک نامزد کرے شامل رہیں گے۔ اس میعاد میں ان ارکان کا دیوبند میں رہنا ضروری ہوگا اور ضرورت ہو تو ان کے مصارف خزینۃ الانصار سے دئے جائیں گے۔

۳۱۔ جلسہء انتظامیہ کا اجلاس منعقدہ نہ ہوگا جب تک اس میں ناظم یا نائب ناظم کے سوا چھ ممبر موجود نہ ہوں۔

۳۲۔ اجماع الانصار کی تجاویز عملی صورت میں لانا جلسہ انتظامیہ کا فرض ہوگا۔

۳۳۔ جمعیۃ کے اغراض کی تکمیل کیلئے سفیر مقرر کرنا اور ان کیلئے دستور العمل بنانا۔ اخباروں میں مضامین شائع کرنا اپنے اخبار ورسائل جاری کرنا جو مختلف انجمنیں اجماع الانصار نے قائم کی ہوں ان کی ضروری امداد کرنا جلسہ انتظامیہ کا کام ہوگا۔

۳۴۔ خزینۃ الانصار سے روپیہ برآمد کرنا جلسہ انتظامیہ کا کام ہے جب تک ناظم ارکان جلسہ کی تصدیق شدہ درخواست خزانچی کے سامنے پیش نہ کرے روپیہ نہیں لے سکتا۔

۳۵۔ اگر مصارف مجوزہ اجماع الانصار سے زائد کی ضرورت پیش آئے تو جلسہ انتظامیہ ایک سو روپیہ تک خرچ کرسکتا ہے۔

۳۶۔ جلسہ انتظامیہ کا انعقاد کم از کم ہر ماہ میں ایک دفعہ ہونا چاہیئے۔

۳۷۔ انعقاد جلسہ کی تاریخ مع فہرست امور تصفیہ طلب کی اطلاع تین روز قبل اور روداد

کی اطلاع ایک ہفتہ کے اندر ہر ایک ممبر جلسہ انتظامیہ کو بھیجی جائے گی۔

ناظم

۳۸۔ ناظم کا تقرر بحکم اجماع الانصار زیادہ سے زیادہ تین سال کیلئے ہوا کرے گا۔

۳۹۔ دفتر کی ذمہ داری، جلسہ اجماع الانصار۔ جلسہ انتظامیہ اور جلسہ علمیہ کا انتظام ناظم کے خاص کام ہوں گے۔

۴۰۔ ناظم کے ماتحت حسب ضرورت کئی نائب رہیں گے جن کا تقرر وغیرہ جلسہ انتظامیہ کے اختیار میں ہوگا جمعیۃ کا دفتر ان کی تحویل میں رہے گا۔

۴۱۔ ناظم روپیہ کی کوئی مقدار جلسہ انتظامیہ کی اجازت کے بغیر خرچ نہیں کر سکتا مگر بوقت اشد ضرورت دس روپیہ تک صرف کر کے تین دن میں منظوری حاصل کرے۔

۴۲۔ اگر میعاد ختم ہونے سے پیشتر اجماع الانصار کے دوثلث رکن یا جلسہ انتظامیہ کے تمام ممبر یا حضرات سرپرست ناظم کی علیحدگی پر متفق ہوں اجماع الانصار اسے علیحدہ کر دیگا۔

۴۳۔ ناظم کی غیر موجودگی میں نائب ناظم باجازت سرپرست اس کا قائم مقام ہوگا۔

سفیر

۴۴۔ سفیروں کو خدمت مفوضہ کے متعلق جو دستور العمل جلسہ انتظامیہ سے ملے۔ اس کے خلاف کاروائی کی جمعیت ذمہ دار نہ ہوگی۔

۴۵۔ سفیروں کو تنخواہ دی جائے یا نہ، بحیثیت سفارت جو ہبہ یا انعام ملے وہ سب خزینۃ الانصار میں داخل کرنا ہوگا۔

دفتر

۴۶۔ جمعیۃ کے دفتر کے رجسٹر مدرسہ عالیہ کے رجسٹروں کے موافق ہوں گے۔

انجمن کی شاخیں

۴۷۔ جس شہر یا علاقہ میں دس رکن ہوں، وہاں اس جمعیۃ کی شاخ قائم کی جائے گی۔

۴۸۔ ہر ایک شاخ کا صدر اور ناظم مقامی ارکان منتخب کرینگے اور اس کی منظوری جلسہ انتظامیہ سے لینا ضروری ہوگی۔

۴۹۔ ہر ایک شاخ کا روپیہ خزینۃ الانصار میں جمع ہوگا۔ اور مصارف کیلئے جلسہ انتظامیہ سے منظوری لے کر روپیہ منگا سکیں گے۔

۵۰۔ ہر ایک مقامی انجمن اپنی تمام کاروائی کی نقل جلسہ انتظامیہ میں ماہوار بھیجا کرے گی۔

۵۱۔ جب تک خزینۃ الانصار میں وسعت نہ ہو خاص جلسوں کے اخراجات کیلئے علیحدہ چندہ ہوا کرے۔

جلسہ علمیہ

۵۲۔ اجماع الانصار جلسہ انتظامیہ کے ماتحت ایک جماعت ایسی نامزد کرے گا جو جلسہ علمیہ کیلئے مناسب ضوابط وضع کرے گی۔

۵۳۔ جلسہ علمیہ میں فقط قرآن شریف اور حدیث شریف کے اسرار و لطائف بیان ہوا کریں گے۔

۵۴۔ کوشش کی جائے کہ تمام شرکاء چندہ یعنی ارکین و معاونین کے علاوہ تمام چندہ

دینے والے بھی اس میں شامل ہوں۔

۵۵۔ یہ جلسہ تکلفات مروجہ سے بالکل مبرّا ہوگا۔ سلف صالحین کے جلسوں سے تشبہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۵۶۔ جلسہ کے انعقاد کی تاریخ اور مضامین کی فہرست تین ماہ پیشتر بذریعہ اخبارات شائع کر کے عام اہل اسلام بلکہ غیر مسلم شائقین کو بھی اس میں شرکت کا موقع دیا جائے گا۔

۵۷۔ مضامین مقررہ پر شرکاء جمعیتہ کے سوا دیگر اہل علم بھی بہ پابندی قواعد تقریر کرسکیں گے۔

۵۸۔ جلسہ انتظامیہ کا دفتر مقام جلسہ پر موجود رہے گا۔ شرکاء جمعیتہ اس کا معائنہ کرسکیں گے۔

۵۹۔ جلسہ انتظامیہ کی ضروریات بعد اختتام جلسہ علمیہ بہت تھوڑے وقت میں عام حاضرین کے گوش گذار کردی جائیں گی۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علے عبادہ الذین اصطفٰے

امابعد

مختصر روئداد جلسۂ اجماع الانصار نمبر ۵

منعقدہ

۱۲۔ ربیع الثانی ۔۱۳۲۸ھ ہجری

بمقام مدرسہ عالیہ

دیوبند

اس سے پہلے ایک جلسۂ میں الانصار کے مقاصد و اغراض اور ان کی اہمیت اور مدرسہ عالیہ کے مرتبہ کا اظہار کیا جاچکا ہے' لیکن ضرورت باقی تھی کہ جمعیۃ کیلئے مختلف کاموں کے شعبے اور مصارف کا علیحدہ علیحدہ تعین کی جائے۔

ان امور کے طے کرنے کیلئے ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۸ء بوقت ۳ بجے جلسہ کرنے کا اعلان کیا گیا۔

اسماء گرامی شرکاء جلسہ

سلطان العلماء حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلھم العالی صاحبزادہ عالیجاہ مولانا مسعود احمد صاحب گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری مدظلھم العالی جناب مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ عالیہ جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مددگار مہتمم مدرسہ عالیہ	سرپرستان جمعیۃ
ابوالحسین عبیداللہ بن الاسلام السندی	ناظم الجمعیۃ
مولوی ابوالحامد محمد بن عبداللہ الانصاری مولوی ظہور الحق صاحب دیوبندی	نائب الناظم
مولانا محمد فاضل صاحب' مولانا عبداللہ صاحب انصاری ناظم دینیات محمڈن کالج علی گڑھ' مولانا محمد ناظر حسن صاحب' مولانا حکیم محمد حسن صاحب مولانا عبدالمومن صاحب' مولانا مولوی عزیز الرحمٰن صاحب' مولانا مرتضیٰ حسن صاحب' مولانا انور شاہ صاحب' مولانا حسین احمد صاحب مدنی' مولوی گل محمد خان صاحب' مولوی محمد یٰسین صاحب' مولوی منظور احمد صاحب' منشی امداد الحق صاحب' مولوی سید اصغر حسین صاحب' مولانا حکیم معین الدین صاحب' مولوی محمد فاروق صاحب' مولوی عبدالخالق صاحب بخاری' حافظ محمد برات صاحب بلخی' مولوی محمود صاحب' مولوی سعید احمد صاحب سندیبی' مولوی عبدالغنی صاحب دربھنگوی' مولوی نور الحسن صاحب دیوبندی' مولوی ولی الرحمٰن صاحب ہزاروی' مولوی محمد اسحٰق صاحب بلیاوی'	اراکین

مولوی ضمیر احمد صاحب اعظم گڈھی، مولوی محمد ناظر صاحب بنگالی، مولوی عبدالحمید صاحب، مولوی محمد ابراہیم صاحب سورتی، مولوی محمد یعقوب پرتابگڈھی، مولوی محمد حنیف صاحب دیوبندی،	اراکین
جناب حاجی امری شاہ خان صاحب، مولوی عبداللہ صاحب سندھی، مولوی احمد علی صاحب سندھی،	معاونین

نصاب شرکاء مکمل ہو چکا۔ تو حضرت سلطان العلماء مدظلھم سے اجازت لے کر ناظم نے ایک مفصل تقریر میں کاموں کے شعبے اور مصارف علیحدہ علیحدہ قائم کرنے کی تحریک کی۔

جس کا خلاصہ مع تغییر یسر (معمولی ردوبدل) ذیل میں مندرج ہے۔

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ امابعد یہ جلسہ اجماع الانصار ہے۔ دفعہ ۲۴ کی سب شرائط پورے ہیں بایں وجہ اس اجلاس کا فیصلہ قانون ہوگا۔

حضرات! ایسا زمانہ بہت تھوڑا رہا ہے جس میں علوم اسلامیہ کی اشاعت سلطنت کی طرف سے رہی ہے، خلافت راشدہ کے گزر جانے کے بعد میں اسکی بہت کم نظیریں ملیں گی کہ اہل علم اور اولوالامر میں اختلاف نہ رہا ہو۔ تاریخ داں جماعت پر یہ واقعات پوشیدہ نہیں ہیں۔

اس لئے اسلامی علوم کی اعلیٰ خدمات کو اس وجہ سے مؤخر کرنا کہ اگر سلطنت تائید کرتی تو کرتے ایک رکیک عذر ہوگا۔ موجودہ گورنمنٹ جو رعایا کے کسی خاص مذہب کی بہ نظر مصالح عدیدہ تائید نہیں کرسکتی۔ اس کا ہر ایک مذہب کو پوری آزادی دینا۔ اور حاملین مذہب اگر گورنمنٹ کے حقوق کی مزاحمت نہ کریں تو ان کی راہ ترقی میں کوئی روک پیدا نہ کرنا

یہی انعام الٰہی ہے اور قابل شکر یہ۔

اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ باوجود عدم تائید سلطنت‘ علوم اسلامیہ کے شیوع (پھیلاؤ) اور بقاء کی علی الخصوص ہندوستان میں منجانب اللہ کیا صورت پیش آئی۔

۱۔ میرا خیال ہے کہ اکبر کے زمانہ میں جب صحیح علم اٹھنے لگا۔ تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اصلاح وتجدید سے علوم اسلامیہ اپنی اصلیت پر قائم رہی۔

۲۔ حضرت مجددؒ اور انکے اتباع نے جو علوم اسلامیہ کی خدمات کی ہیں وہ اسکی شہادت پورے طور پر دے رہی ہیں۔

۳۔ مجدد صاحبؒ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ اور ان کے خاندان نے اس منصب جلیل کو اچھی طرح سنبھالا۔

۴۔ اور ان کے بعد ہمارے حضرات مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہما نے علوم اسلامیہ سے جاہلوں کی تاویلات اور مبطل اور غالی (باطل اور شدت پسند) لوگوں کی تحریف ودعوی بے جا کے نفی کرنے کی پوری کوشش فرمائی۔ **جزاھم اللہ عن الاسلام واھلہ خیر الجزاء.**

ان حضرات کی متفقہ کوششوں کی مجسم صورت مدرسہ عالیہ دیوبند ہے جو اسی منہاج پر اسلامی علوم قرآن شریف اور سنت رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ افاضہ علوم ومعارف کر رہا ہے۔ جس کے نتائج حسنہ آپ حضرات ابھی دیکھ چکے ہیں۔

مدرسہ عالیہ کے منتظمین کیلئے ایک ایسی جماعۃ کی اشد ضرورت ہے۔ جو ان کے مقاصد کی تکمیل اور انکی تعلیم کی اشاعت میں حواریین وانصار (مددگار) کا کام دے اور ان کے مقدس ارادوں کی تکمیل میں بمنزلہ دست وپاء وچشم وگوش کام کرتی رہے۔ اس جماعت

میں اگر کبھی قصور بھی ہوا تو یہی کہ موافقت و اتباع جیسا چاہیئے ویسا نہ ہو سکا۔ مگر بوئے مخالفت تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہ ہو۔

سوالحمدللہ کہ مدرسہ عالیہ نے ایک ایسی جماعت تیار کردی ہے جو کام کرنے کی پوری قابلیت رکھتی ہے اوراس کو مدرسہ کے ساتھ پوری محبت ہے' حضرات منتظمین کے ساتھ کامل خلوص و اعتقاد اور عام مذہبی کاموں سے نہایت شغف ہے' یہ جماعت اپنے اکابر حضرات کا طوق اطاعت گلے میں ڈالے ہوئے ان کے کاموں میں دست و بازو بنے رہنے کو اپنا فخر خیال کرتی ہے اور اسی وجہ سے الانصار کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

الانصار کے قواعد آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ان میں دفعہ (۳) یعنی ''اس جمعیت کی غرض مدرسہ عالیہ دیوبند کے مقاصد کی تائید وحمایت اوراس کے پاک اثر کی ترویج واشاعت ہے۔'' ایک امر مجمل ہے۔

میری رائے میں اس کی تفصیل کے لئے موزوں ہوگا کہ جمعیت الانصار کے پانچ شعبے حسب ذیل قرار دیئے جائیں:

(۱) جمعیت تکمیل التعلیم'

(۲) جمعیت نظام التعلیم'

(۳) جمعیۃ الارشاد'

(۴) جمعیۃ التالیف والاشاعت'

(۵) جلسہ علمیہ'

جمعیت تکمیل التعلیم: جمعیۃ الانصار کے شعبہ جمعیۃ تکمیل التعلیم کا فرض ہوگا کہ مدرسہ عالیہ دیوبند کے موجودہ نصاب ختم کرنے والے حضرات کیلئے جو درجہ تکمیل کھولا جاتا ہے۔ اسکی ضروریات مہیا کرے۔

تشریح

درجہ تکمیل میں:

(الف) حضرت مولانا محمد قاسم قدس اللہ سرہٗ العزیز کی تالیفات اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کی کتابیں مثل حجۃ اللہ البالغۃ خیر کثیر عبقات از شاہ محمد اسماعیلؒ تکمیل الاذھان از شاہ رفیع الدینؒ وغیرہ اور حضرت مجددؒ کے بعض مکتوبات پڑھائی جائینگی۔

(ب) علم تفسیر وکلام ادب وغیرہ فنون کی اعلیٰ کتابیں بھی داخل درس ہونگی۔

(ج) تقریر وتحریر کی خاص مشق کرائی جائیگی۔

(د) طریقہ تدریس وانتظام سکھلایا جائیگا۔

(ہ) مدت تعلیم میں جو دو برس ہو گی۔ وظیفہ دیا جائے گا جسکی مقدار دس روپیہ ماہوار سے کم نہ ہو گی۔

جمعیت نظام التعلیم: مدرسہ عالیہ دیو بند کی سر پرستی جو مدرسہ قبول کرے۔ اور اس کے نظامات تعلیمیہ اپنے ہاں نافذ کرے اس کی اصلاح اور امداد جمعیۃ الانصار کے شعبہ جمعیۃ نظام التعلیم کا فرض ہوگا۔

جمعیۃ الارشاد: جمعیۃ الانصار کے شعبہ جمعیۃ الارشاد کا فرض ہو گا کہ

(الف) ایسے مذکر (واعظ) اور خطیب تیار کرے۔ جو مختلف زبانوں میں یہ اسلامی خدمت بوجہ احسن ادا کریں۔

(ب) تحریری وتقریری مناظرہ کرنے والے ایسے فاضل تیار کئے جاویں جو (الف) مشرکین۔ (ب) دہریین (ج) اہل کتاب (د) ملحدین

(ہ) مبتدعین پر اتمام حجت کرسکیں۔

اس موقع پر اس امر کا اظہار بھی مناسب ہوگا کہ ہمارے زمانے میں مناظرہ میں کچھ ایسے مفاسد پیدا ہو گئے ہیں؛ جن کے باعث یہ اسلامی ضرورت بہ نظر نفرت دیکھی جانے لگی ہے، الانصار کا فرض ہوگا کہ ان مفاسد کی اصلاح کر کے مناظرہ کو اس کی اصلی صورت پر لائے۔

جمعیۃ التالیف والاشاعت: جمعیۃ التالیف والاشاعت کی چند شاخیں مرتب کی جاویں۔

(۱) آئمہ متقدمین کے کتب کی حفاظت واشاعت۔

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے خاندان کی کتب کی اشاعت۔

(۳) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب وحضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس اسرارھما کی تالیفات کی حفاظت واشاعت۔

(۴) مدرسہ عالیہ کے کتب خانہ میں ہر قسم کی کتابیں فراہم کرنا (۵) اپنی جماعت کی عمدہ تالیفات۔عربی۔فارسی اردو وغیرہ کی اشاعت۔

یہ پانچ شعبے ہیں، جو میری رائے میں دفعہ نمبر۳ کی تفصیل ہو سکتے ہیں، ان میں اچھی طرح غور فرمالیا جائے اس کے بعد منظوری دی جائے۔

اس تقریر کے ختم ہونے پر حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری صاحب اور جناب صاحبزادہ حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی نے ان خیالات پر تحسین وآفرین فرمائی اور جمعیۃ کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار فرمایا۔

جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مددگار مہتمم نے اپنی اور تمام سرپرست حضرات کی طرف سے ہمت افزا تقریر فرمائی اور فرمایا کہ بالفعل ان تجاویز کے موافق کام شروع کر دینا چاہیئے۔ آگے چل کر اگر کسی ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس وقت اصلاح

ممکن ہوگی۔

اختتام جلسہ پر ایک تحریر لکھ کر شرکاء نے اس پر دستخط فرمائے جو یہ ہے:

''۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ کے جلسہ میں ناظم صاحب نے جو تجاویز پیش کیں، ان پر کاروائی شروع کرنے کی اجازت دی جاتی ہے فقط''

الحمد لله على ذلك حمدا كثيراً طيباً مباركاً فيه وعليه وصلى الله على خير خلقه محمد واٰله واصحابه اجمعين.

اب اپنی جماعت سے اس قسم کی درخواست کا وقت آ گیا کہ جس جس شعبہ سے اپنی طبیعت کی مناسبت دیکھیں اس شعبہ میں اپنے خدمات مفوض فرمادیں۔

جمعیۃ میں کام کرنے والے دونوں قسم کے حضرات ہونگے' اہل مقدرت جو بلا معاوضہ اپنے خدمات وقف فرماسکیں۔ ارباب حاجت جن کی ضرورت کے موافق جمعیۃ خدمت کرے گی اور وہ اس صورت میں اپنے نفوس کو مدرسہ عالیہ کے لئے وقف خیال فرمائیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين.

(عبیداللہ)

ناظم الانصار۔ دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

امابعد

۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ بمطابق اپریل ۱۹۱۱ء کو مراد آباد میں جمعیۃ الانصار کے اجلاس عام میں درج ذیل تجاویز جمعیۃ کے اغراض مقاصد کے طور پر متفقہ طور پر منظور کی گئی۔اس سے قبل اراکین کے خاص اجلاس میں دو گھنٹہ کے بحث مباحثہ کے بعد ان کی حتمی منظوری دی گئی ہے۔

تجویز اوّل۔ انگریزی مدارس میں مسلمان طلبہ کی مذہبی تعلیم اور ان کے دارالاقامۃ میں مسلمان طلبہ کی مذہبی تربیت کیلئے جمعیۃ الانصار مدرسہ عالیہ دیوبند کے اعضاء(ارکان واعوان)وقف ہوں اور انکے ضروریات کی جمعیۃ کفیل ہو۔

مختصر تقریر ناظم

ارکان اسلام میں اقرار شہادتین اور نماز پنجگانہ کا لزوم اور ایمان یوم الحساب میں احکم الحاکمین کے رُوبرو اپنے آمد وخرچ کے حساب دینے کا اعتقاد ہر ایک مسلمان کیلئے دینی اور دنیوی تعلیم کو ضروری قرار دیتا ہے۔

اسلامی سلطنت میں مساجد و مکاتب دونوں قسم کی تعلیم کیلئے کافی تھے چنانچہ انہی مکاتب کے تعلیم یافتہ سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر (مثل وزارت وغیرہ) ممتاز ہوتے تھے اور اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔حتیٰ کہ ہنود بھی سلطنت کے انہی

مکاتب میں تعلیم پاتے تھے انقلابِ سلطنت کے بعد دینی اور عربی کیلئے مدارس علیحدہ ہو گئے اور دنیوی تعلیم کیلئے اسکول اور کالج قائم ہوئے۔

چونکہ گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں تھا اور مشن اسکولوں میں مخالف مذہب تعلیم دیجاتی تھی اس لئے مسلمانوں کو اپنے اسکول اور کالج بنانے پڑے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی ضرورتوں کی وجہ سے مجبور ہو کر مسلمانوں کو اپنے اسکول اور کالج بنانا اور اپنی ہی یونیورسٹی قائم کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

مسلمان جس قدر چاہیں اپنی درسگاہیں علیحدہ بنائیں لیکن ایک عرصہ دراز تک گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔

سلف میں دینی تعلیم پر اجرت لینے کی رسم بہت کم تھی اور اسی بناء پر امام ابو حنیفہؒ تحریم اجرت کے قائل ہیں مگر تھوڑے عرصہ کے بعد ائمہ حنیفہؒ نے جب بلا اجرت کام کرنے والوں میں کمی آتی دیکھی تو با اجرت تعلیم دینے کے جواز کا فتوی دیا یعنی مسلمانوں کی دینی تعلیم کیلئے معلمین کو بعض مکروہات کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے تو اس سے اجتناب کر کے علم میں کمی نہ آنے دی جائے۔

پس اہل علم کو گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں اگرچہ بعض امور خلاف طبع پیش آئیں لیکن مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کیلئے یہ تکلیف برداشت کرنی چاہیئے۔

ہمارا نصاب اس وقت فقط ارکان اسلام کی تعلیم ہوگی جو عام مروجہ کتابوں مثل راہ نجات، مالا بدمنہ، کے ذریعہ سے دی جائے۔ ترجمۂ قرآن شریف اور حدیث شریف کی کوئی مختصر کتاب، علم اخلاق کے چند اسباق بھی ساتھ شامل رہیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کیلئے جو ہیئت و وضع ضروری قرار دی ہے اس کی

حفاظت کی طرف توجہ دلائی جائے گی۔ جس کے بدلنے کی اب پرواہ نہیں کی جاتی' اور اس کا بُرا نتیجہ دیر کے بعد معلوم ہوگا۔ جب خدانخواستہ اس فعل کی شومی (خرابی) سے افراد قوم قوم سے علیحدہ ہونے لگیں گے جس کا تجربہ دیہات کے مسلمانوں میں جو وضع و ہیئت میں ہندوؤں سے علیحدہ نہیں ہوئی' بخوبی ہو رہا ہے۔

بحثیں سکھلانا یا مناظرہ کرنا اس وقت ہمارا مقصود نہ ہوگا اور اس وجہ سے ممکن ہے کہ بعض طلبہ کو ہم مطمئن نہ کر سکیں لیکن ہمارے لئے یہی کافی ہوگا کہ بعض کو مطمئن بنا دیں۔

ہمیں قطعی امید ہے کہ ہماری جمعیۃ کے اراکین جب شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی حجۃ اللہ البالغہ اور مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کے رسائل پیش نظر رکھیں گے جو ہمارے درجہ تکمیل کے نصاب میں داخل ہیں تو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو اسلامی تعلیمات پر مطمئن کر دیں گے۔

تربیت سے مراد اسلامی ارکان کی پابندی سکھلانا ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ ارکان اسلام کی پابندی میں ہماری جماعت ایسی ممتاز ہے کہ بہت تھوڑی جماعتیں اس میں ہمارا مقابلہ کر سکتی ہیں اور مذہبی تربیت بغیر اس کے مکمل ہو ہی نہیں سکتی کہ معلم خود پابند فرائض ہو۔

اسلام کے مختلف فرقوں کی تعلیم جمعیۃ اپنے ذمہ نہیں لے سکتی ہمیں فقط وہی لوگ پیش نظر رہیں گے جو بخوشی ہم سے تعلیم پا سکتے ہیں۔ اور ایسے آدمیوں کی ہر ایک اسکول میں کافی تعداد موجود ہے۔

تجویز دوم۔ ہر ایک انگریزی مدرسہ (اسکول و کالج) میں کم از کم ۲۵ فیصدی طلبہ جن کی دوسری زبان عربی ہو ان کیلئے جمعیۃ انعامی وظائف جاری کرے اور انتظام میں سہولت پیدا کرنے کیلئے لائق استاد بہم پہونچائے۔

تقریر ناظم

انگریزی اسکولوں میں تعلیم پانے والے مسلمانوں میں عربی زبان سے ناواقفی انہیں اسلامی علوم سے اجنبی بنا رہی ہے۔ اختیاری مضمون میں دوسری زبانوں اور سائنس کا حصہ چھوڑ کر ۲۵ فیصدی سے عربی داں کم نہ ہونے چاہئیں۔

دوسری قوموں میں جو شغف اپنی مذہبی زبان کی طرف پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں عربی کیلئے اس سے زیادہ ہونا چاہیئے۔

جمعیۃ بذریعہ وظائف یہ کمی پوری کرنا چاہتی ہے اور یہی وہ لوگ ہونگے جو آئندہ دینیات کی تعلیم مکمل کرسکیں گے۔

تیسری تجویز: ایسے منتہی (گریجوائٹ یا انڈر گریجوایٹ) طلبہ جن کی دوسری زبان عربی ہوانکے لئے مدرسہ عالیہ دیوبند میں تعلیم دینیات کا خاص انتظام ہو اور جمعیۃ ۳۰ یا ۴۰ روپے ماہوار کے وظائف جاری کرے۔

تقریر ناظم

ہماری قوم اب بہت جلد ایسے پروفیسر تلاش کرے گی جو مذہبی علوم بخوبی پڑھا سکیں ممکن ہے اس وقت شام ومصر کے فاضلوں کی طرف رخ کیا جائے۔ مگر سب سے عمدہ اور آسان یہی تجویز ہوگی کہ اپنے لائق گریجویٹ جو قومی ضرورت سے واقف اور گورنمنٹ کے پورے معتمد ہوں اور ان میں مذہبی روح موجود ہو اور تکمیل دینیات کا شوق رکھتے ہوں ان کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ مذہبی علماء اور صلحاء کی صحبتوں سے مستفید ہوں اور دینی علوم کی تکمیل کریں اس کام کی ضرورت مان لی جائے تو مدرسہ عالیہ دیوبند سے بہتر اور کوئی جگہ اسکے پورا کرنے کی نہیں مل سکتی۔ مدرسہ عالیہ فقط ایسے گریجوایٹ کو لے گا۔ جس کے دینی رحجان اور شوق پر اسے اطمینان ہوگا۔

مجوزہ وظائف اگر کافی ثابت نہ ہوں تو جمعیۃ ان کے بڑھانے کیلئے بآسانی آمادہ ہوسکتی ہے۔

چوتھی تجویز: جمعیۃ مدرسہ عالیہ دیوبند میں دو سال کیلئے ایک ایسی جماعت کھولے جو قرآن شریف پر مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دے سکے اور جس قدر تالیفات اس وقت تک اس باب میں لکھی جاچکی ہیں انکے زیر مطالعہ ہوں۔ اس کے لئے ۱۰ ؍ سے ۲۰ تک وظیفہ دیا جائے۔

تقریر ناظم

قرآن شریف پر اعتراضات کا ذخیرہ جس قدر اردو اور عربی میں موجود ہے بالفعل ہماری کوشش ہوگی کہ ان کی جوابدہی کی طرف توجہ کریں۔

یورپ کی سوسائٹیوں کی تحقیقات سے مستفید ہونے کے ابواب جمعیۃ کیلئے بہت جلد کھل جائیں گے۔ جب ہماری تجویز نمبر ۳ پر عملدرآمد شروع ہوا۔

بالفعل ہم اسکول قائم کررہے ہیں۔ کالج کے درجہ تک اگر کچھ عرصہ بعد پہونچیں تو اس میں کچھ حرج نہ ہوگا۔

پانچویں تجویز: مساجد کے انتظام میں جہاں کہیں ضرورت ہو۔ اور وہاں کے مسلمان جمعیۃ سے خواہش کریں تو جمعیۃ ان کیلئے لائق عالم امامت و وعظ کیلئے بہم پہونچائے۔

تقریر ناظم

حفاظت اسلام کا صحیح ذریعہ یہی ہے کہ مساجد کے معمور بنانے میں کوشش کی جائے یہ تجویز پوری تفصیل سے آئندہ کسی موقعہ پر پیش کی جائے گی۔

چھٹی تجویز: جمعیۃ اپنے اراکین و معاونین سے امید کرتی ہے کہ قرآن شریف اور دینی کتب کی طباعت وتجارت میں مسلمانوں کو غیر قوموں کا محتاج نہ رہنے دے گی۔

تقریر ناظم

مسلمان تجارت کی طرف اپنا میلان ظاہر کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی ضروریات زندگی بہم پہونچانے میں مسلمان پورا حصہ لیں۔ کسی غیر قوم کے دست نگر نہ رہیں۔

جمعیۃ ایسے لوگوں کو دینی کتب کی تجارت کی طرف توجہ دلائے گی کہ اسے بھی وہ مناسب تدبیروں سے اپنے ہاتھ لیں۔ اس سے زیادہ کوئی عملی کاروائی پیش نظر نہیں۔

ساتویں تجویز: جمعیۃ ایسے چھوٹے چھوٹے رسائل بکثرت مفت شائع کرے گی جس میں عقائد اسلامیہ کی تعلیم اور آریہ کے جوابات کی ہدایت ہوگی۔

تقریر ناظم

اب کثرت مشاغل کی وجہ سے کوئی بڑی کتاب یا رسالہ اور وہ بھی دینی ہو دیکھنا باعثِ ملال ہو رہا ہے۔ اسلئے چھوٹے چھوٹے رسائل جو چند منٹ میں دیکھے جا سکیں گے اور سلیس کہ بچے بھی بلا مدد استاد سمجھ لیں۔ شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

مقصد فقط تعلیم عقائد ہے۔ اور آریہ چونکہ عام طور پر اسلامی عقائد پر جرح کر رہے ہیں اس لئے ان کے جوابات ملحوظ رہیں گے۔ مخاصمانہ انداز اختیار نہیں کیا جائے گا۔

عبید اللہ سندھیؒ

ناظم جمعیۃ الانصار دیوبند ۱۹۱۱ء

مقالہ نمبر ۲

آزاد برصغیر کا دستوری خاکہ

تحریکِ آزادیٔ ھند کا دوسرا دور

(ایک تاریخی منشور)

۱۵ ستمبر ۱۹۲۴ء

پس منظر

[امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ ہندوستان کی آزادی کیلئے جدوجہد کرتے ہوئے جب کابل اور ماسکو سے ہوتے ہوئے ترکی تشریف لے گئے' تو آپ نے ہندوستان کی قومی آزادی کے لئے جدوجہد کا ایک عوامی پروگرام ترتیب دیا اور قومی حکومتوں کے لئے جامع سیاسی نظامِ حکومت کا ایک جاندار دستوری خاکہ مرتب کیا اور اس خطہ میں موجود علاقائی اور مذہبی اقوام کے درمیان سیاسی' معاشی اور ثقافتی تعلقات کا ایک ایسا ڈھانچہ متعارف کرایا' جس میں تمام تہذیبی اکائیوں کے بنیادی حقوق پوری طرح محفوظ کر دیئے گئے۔ نیز تمام اقوام کے سیاسی و معاشی حقوق کی ادائیگی کا جامع نظام وضع کیا گیا۔ مولانا سندھیؒ کا تیار کردہ یہ آئینی' سیاسی اور معاشی خاکہ آج بھی اس علاقہ میں بسنے والی اقوام کے لئے ایک جامع پروگرام کی حیثیت رکھتا ہے۔ قوموں کی حقِ خودارادیت کی حفاظت کا اس سے بہترین نظام ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ اور آج خطہ کے زمینی حقائق ہمیں اس جانب دھکیل رہے ہیں۔ آج نہیں تو کل انہیں ضرور رُوبہ عمل آنا ہے۔ کیونکہ یہ محض تخیل پسندی پر مبنی خاکہ نہیں ہے' بلکہ خطہ کے زمینی حقائق کا لازمی تقاضہ ہے۔

مولانا سندھیؒ نے یہ پروگرام ستمبر ۱۹۲۴ء میں اُردو میں مرتب کر کے ترکی سے شائع کیا تھا۔ اور ہندوستان میں اسے مختلف ذرائع سے ارسال کیا تھا' لیکن مئی ۱۹۲۵ء میں حکومتِ برطانیہ نے اس پر پابندی عائد کر دی تھی۔ پھر ۱۹۲۶ء میں اس کا انگریزی ترجمہ کیا گیا' اور اس میں ابواب قائم کر کے بظاہر جزوی تبدیلیاں کی گئی تاکہ پابندی کی زد میں نہ

آئے اور اسے دنیا بھر میں تقسیم کیا گیا۔

فروری ۱۹۵۶ء میں مولانا سندھیؒ کا یہ پروگرام انجمن ترقی اُردو (پاکستان)، کراچی کے سہ ماہی مجلّہ ''تاریخ و سیاسیات'' کے ایک شمارہ میں ''مولانا سندھی مرحوم کا منصوبہ'' کے عنوان سے چھپا تھا، اس کے شروع میں ہاشمی فرید آبادی کے قلم سے ایک نوٹ لکھا ہوا تھا، وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمیں مولانا کے عزیزِ قریب اور رفیق طریق مولوی عزیز احمد صاحب نے جو آج کل کراچی میں مقیم ہیں، مہربانی سے یہ قلمی مسودہ دیا، اور چونکہ یہ نہ صرف مولانا مرحوم کی انقلاب پسندی اور سیاسی فراست کی دستاویز ہے، بلکہ ہمارے افکار میں ارتقاء کی اب ایک تاریخی شہادت بن گیا ہے، ہم نے اسے رسالہ ''تاریخ و سیاسیات'' میں ازسرِ نو چھاپ دینا مناسب سمجھا، یاد رہے کہ اس وقت تک خود اہلِ ہند کی طرف سے آزاد ہند کے آئین کا اور کوئی خاکہ یا مسودہ مرتب نہیں ہوا تھا۔''

بعد میں جب پروفیسر محمد سرور مرحوم نے خطبات و مقالات کا ایڈیشن ترتیب دیا، تو پروگرام کو ''ایک تاریخی سیاسی منشور'' کے عنوان سے شائع کیا۔ ہم نے پروگرام کی اصل اشاعت کے موقع پر حضرت سندھیؒ نے اپنے قلم سے اس پروگرام کا جو عنوان تجویز کیا تھا، اور جس کے مطابق اس کی اُردو اور انگریزی طباعت ہوئی تھی، اس کو قائم رکھا ہے، تا کہ مصنف کے قائم کردہ اصل عنوان کو محفوظ رکھا جا سکے۔ اس دستاویز کی تشریح و توضیح کیلئے حضرت سندھیؒ کے چند مکتوبات ممد و معاون ہیں اس میں سے چار مکتوب بطور ضمیمہ آخر میں درج کئے جاتے ہیں۔ آزاد]

مہابھارت سرو راجیہ پارٹی

ہندوستان کلاں کی جمہوری جماعتوں کی مجلس کا نظام عمل

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

مہابھارت سرو راجیہ پارٹی کے پروگرام کا تعارف کرانے سے پہلے چند سطریں کانگریس کمیٹی کابل کے متعلق لکھنا ضروری ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں ہندوستان کی آزادی پسند جماعتوں کے چند افراد کابل میں جمع ہوئے۔ کوئی بلوچستان اور پشتانیہ (سرحدی علاقہ) کے پہاڑوں اور جنگلوں کو عبور کر کے پہنچا اور کوئی یورپ کا چکر کاٹ کر ایران کے دشت و بیابان سے گزرا۔ حکومت افغانستان کی ہمدردی سے ان لوگوں کی سرگرمی نے کابل کو تحریک آزادی ہند کا ایک زبردست مرکز بنا دیا۔

سب سے پہلے زار روس نے اس مرکز کی بعض کارروائیوں سے برطانیہ کو مطلع کیا' جس کی تفصیل ایک روسی پمفلٹ موسومہ بہ (سونے کی پتری) میں ملتی ہے۔ چند روز بعد ہندوستان میں ہمارے بعض کاغذات پکڑے گئے۔ اس پر برطانیہ نے اس مرکز کو دبانے کے لیے پوری توجہ سے کام لیا۔ اور امیر حبیب اللہ خاں کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ ان لوگوں کو منتشر کر دیں۔ امیر نے بعض کو افغانستان سے رخصت کر دیا۔ اور بعض کو نظر بند و قید کر لیا۔

مگر انگریزوں کے حوالے کسی کو نہ کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں میں سے جن پر شبہ ہوسکتا تھا کہ وہ اس مرکز سے تعلق رکھتے ہیں، بہت بڑی تعداد میں گرفتار کر لیے گئے۔ حضرت شیخ الہند (تغمدہ اللہ بغفرانہ) کو اسی سلسلہ میں شریف مکہ نے انگریزوں کے حوالے کر دیا اور وہ ایک عرصے تک مالٹا میں اسیر رہے۔

مگر فقط اسی قدر کافی نہیں تھا۔ برطانیہ جانتا تھا کہ ماوراء الہند کے آزاد علاقوں میں پرانی (جماعت مجاھد ھندیہ) اور نئی مہاجر (افغان مجاہدین) کے متعدد مراکز سے ہمارا گہرا تعلق ہے۔ اور امیر افغانستان کی کاروائی اس اتصال پر کوئی بھی اثر نہیں ڈال سکتی۔ اس لیے وہ ''رولٹ ایکٹ'' نافذ کرنے پر مجبور ہوا۔

ہندوستان کی قانونی کونسل کو مفصل واقعات بتانے کی اس میں ہمت نہ تھی ہندوستانیوں کی متفقہ مخالفت کے باوجود اپنی خانہ ساز میجارٹی کے زور پر ''رولٹ ایکٹ'' منظور تو کرالیا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیشنل کانگریس میں حرکت پیدا ہوئی اور اس مقصد کے لیے رسا کشی شروع ہوگئی کہ کونسلوں میں حقیقی طاقت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے اور مہاتما گاندھی نمودار ہوئے۔

ہمارے قید کے زمانے میں افغان ہم سے گہری ہمدری رکھتے تھے۔ غریب و امیر بغیر کسی جان پہچان کے بوقت ضرورت ہماری مدد کرتے رہے۔ اس وقت افغانستان میں انقلاب کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہاں کی انقلابی جماعتوں سے ہماری دوستی تھی۔ اس لیے ہمارے کام میں زیادہ رکاوٹ نہیں ہوئی چنانچہ انقلاب روس کے بعد ہمارا ایک رفیق قید سے بھاگ کر برفانی موسم میں ان دوستوں کی مدد سے بخارہ پہنچ گیا۔ ہمارا یہ وقت زیادہ تر اتحاد افغانستان و ہندوستان کا تفصیلی پروگرام سوچنے میں صرف ہوا۔

۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خان قتل ہو گئے۔ اور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں

تختِ افغانستان پر متمکن ہوئے۔اس وقت حربِ عمومی ختم ہو چکی تھی۔اگر انقلابی افغان امیر کے قتل کی پہلی کوشش میں ناکام نہ ہوتے جب کہ حرب عمومی اپنے انتہائی زور پر تھی تو دنیا کی سیاست کا نقشہ یقیناً بدل جاتا۔

امیر امان اللہ خاں کی شروع سلطنت سے ہم پھر آزاد ہو گئے۔ہمارا قید کے زمانے میں مرتب کیا ہوا پروگرام ہمیں اس وقت بہت کام دے گیا۔ہم امیر امان اللہ خاں کی سرپرستی میں نومبر ۱۹۲۱ء یعنی جس وقت تک انگریزی افغانی معاہدہ تکمیل پذیر نہیں ہوا، پوری آزادی سے کام کرتے رہے۔یورپ کی انٹرنیشنل سیاست اور ایشیائی ممالک عموماً اسلامی ممالک خصوصاً ہمارے زیرِ مطالعہ رہے۔اس مطالعہ کے لیے ہمیں بہترین موقعے میسر آئے۔ہمیں ایشیائی ممالک سے ہندوستان کا اچھا تعارف کرانے میں کامیابی ہوئی۔امیر امان اللہ خاں کی تخت نشینی کے چند روز بعد افغانی انگریزی جنگ کے اسباب پیدا ہو گئے جس میں افغانستان نے ہمیں کام کرنے کا پورا موقعہ دیا۔مگر نا مساعد حالات کی وجہ سے متوقع نتائج مرتب نہ ہو سکے۔پھر بھی اس کا تحریکِ آزادیٔ ہند پر کافی اثر پڑا۔اور ایک سال میں اس قدر کام ہوا جو دوسری صورت میں چوتھائی صدی تک وقت لیتا۔

شروع ۱۹۲۱ء میں ہماری بعض دستاویزات پھر انگریزوں کے ہاتھ آ گئیں۔اور انہوں نے نومبر میں اس سے فائدہ حاصل کیا۔مولانا محمد علی (پریزیڈنٹ نیشنل کانگریس) مولانا شوکت علی (رئیس مجلس خلافت) مولانا حسین احمد (صدر جمعیۃ العلماء) کو کراچی میں ان پر مقدمہ چلا کر مہاتما گاندھی سے جدا کر دیا۔ہمارا خیال ہے کہ مقدمہ کراچی کی کاروائی برائے نام تھی۔حقیقت میں مولانا محمد علی پر ہندوستان کی مجلس انتظامی کے رکن قانون نے ہمارے کاغذات پر ''رولٹ ایکٹ'' کے ماتحت بمبئی ہائی کورٹ میں مقدمہ چلایا ہے۔اس میں مولانا محمد علی کو اطلاع دینی یا ان سے جواب لینے کی ضرورت نہیں تھی۔اس کے بعد تخمیناً

۲۵ ہزار ہندوستانی جیل میں گئے اور مہاتما گاندھی نے بزدلی میں پسپائی کا فیصلہ صادر کیا' جس پر تحریک آزادی ہند کا ایک دور ختم ہو گیا۔

اس میں ہمیں خوشی ہے تو فقط اتنی کہ جس طرح افغانستان نے ہمیں جنگ میں کام کرنے کا موقعہ دیا تھا' اسی طرح ہم بھی اس شورش سے افغانستان کو اپنا استقلال مکمل حاصل کرنے کے لیے مناسب فضا پیدا کرنے میں مدد دے سکے ۱۹۲۰ء میں ہندوستانی مسلمان ہجرت کر کے ہزاروں کی تعداد میں افغانستان آئے۔ افغانستانی ترکستان میں ان کے لیے نو آبادی قائم کرنے کا قانون بنایا گیا' جس میں انہیں مکمل لوکل سیلف گورنمنٹ کے حقوق دیے گئے۔ اسی ضمن میں ہم نے ''ہندوستانی یونی ورسٹی کابل'' کے لیے اجازت حاصل کرنے کی کوشش شروع کی۔ یونیورسٹی کا اساسی قانون پہلی بار افغانستان کی ''شاہی کونسل وضع قوانین'' نے چند ترمیمات کے لیے واپس کر دیا۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں ترمیم شدہ صورت میں منظور کر لیا۔ اور چند ابتدائی کام بھی شروع ہو گئے۔ ہندوستانی نیشنل یونیورسٹی کابل کے لیے شاہی فرمان حاصل کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ نیشنل کانگریس کی برانچ کابل میں قائم کی جائے۔ اس لیے ہمیں ''کانگریس کمیٹی کابل'' بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ گویا سات سال سے کابل میں کام کرنے والی جماعت شاخ کانگریس کی صورت میں تبدیل ہو گئی' جس سے مختلف سیاسی عقیدہ رکھنے والے اصحاب ایک نقطہ پر جمع ہو گئے۔ ہماری ''کانگریس کمیٹی کابل'' کا الحاق نیشنل کانگریس نے ''گیا سیشن'' میں منظور کر لیا۔ مگر واقعات اس قدر جلد تبدیل ہوتے گئے کہ اس الحاق کی اطلاع ہمیں ماسکو میں ملی۔ اس وقت تھوڑی دیر کے لیے ہمیں نادر شاہ قاچار کے اس زریں مقولہ کا لطف حاصل ہوا جو اس نے دہلی میں ہاتھی کی سواری سے انکار کرتے وقت کہا تھا اور ہمیں سارا کام نئے سرے سے شروع کرنا پڑا۔

اگرچہ ہم اس وقت کابل میں نہیں ہیں۔ مگر چونکہ ہماری کمیٹی اسی نام سے بنی اور

اس نام سے اس کا تعارف ہوا اس لیے ہم جہاں کہیں رہیں گے' اس نام کو نہ چھوڑیں گے۔ ہماری سرگزشت ناکامیوں کی طویل فہرست ہے۔ اور غلط کاریوں کے اعتراف سے بھری ہوئی ہے لیکن اس میں ایک خوبی ضرور محسوس ہوگی۔ اس میں مایوسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہے۔ ہمیں حضرت شیخ الہند (مولانا محمود حسن) کی وصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی ہے۔

ایمن مشو کہ مرکب مردانِ راہ را　　　　درسنگلاخ بادیہ پے با بریدہ اند

ترجمہ: اس راہ میں بے خوف ہو کر نہ چل اس سنگ لاخ (پتھریلی) راہ میں اکثر مسافروں کے گھوڑوں کے پیر زخمی ہو گئے ہیں۔

نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش　　　　ناگہ بہ یک خروش بہ منزل رسیدہ اند

ترجمہ: لیکن ناامید ہونے کی بھی ضرورت نہیں کچھ اپنے مقصد کی لگن والے ایک جست میں منزل پر بھی پہنچ جایا کرتے ہیں۔

سروراجیہ تحریک

ہمیں ماسکو میں انقلاب روس کے نتائج آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انقلاب کا پورا مطالعہ کرنے کے لیے ہماری کمیٹی کے بعض ممبروں نے روسی زبان سیکھی۔ ہمیں روس کے اہم اشخاص سے تبادلہ خیالات کے اچھے موقعے ملے۔ یورپ کے دیگر ممالک پر جو انقلاب روس کا اثر آیا' اس کے مطالعہ کیلئے ہماری کمیٹی کے ممبران ملکوں میں گئے۔ ہم نے ترکی انقلاب کا بھی مطالعہ کیا۔ انقرہ اور استنبول کو اچھی طرح دیکھا۔ جس قدرِ واقفیت اور تجربہ ہماری کمیٹی کو حاصل ہوا' اس کی رپورٹ لکھنے کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔ مگر ہم نے ایک مستقل پارٹی پروگرام تحریر کی صورت میں ضبط کرنا زیادہ مناسب خیال کیا۔

اوروں پہ کیوں نزولِ بلا اپنے ساتھ ہو
اب ہم مکان شہر سے باہر بنائیں گے

(پارٹی پروگرام ایک نظر میں)

تعارف کے اس حصہ کو پڑھنے سے پہلے پروگرام کو ایک سرسری نظر سے دیکھ لینا ضروری ہے۔ہمیں افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی موجودہ نسل انقلاب کی ماہیت سمجھنے سے بہت دور ہوگئی۔۱۸۵۸ء کی دہلی دیکھنے والے بہت کم رہ گئے۔اس کے کچھ افسانے لوگوں کو یاد ہیں، لیکن اس انقلاب کو فن کے اعتبار سے سمجھانے والا ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ہماری سیاست عموماً کالجوں اور ہوٹلوں کی بیرونی زندگی میں پلی۔خدا بھلا کرے نیک نفس گاندھی کا کہ اس نے ہندوستانی ذہنیت میں ایک انقلاب تو پیدا کر دیا اور جھونپڑوں میں رہنے والوں کی طرف توجہ پھیر دی۔ بنیادیں بھری جارہی ہیں۔ہمارا پروگرام ان بنیادوں پر عمارت کھڑا کرنے والوں کی رہنمائی کرے گا۔

ہم شمالی ہند کے رہنے والے دکن سے اس قدر آشنا نہیں۔ بنگال کو ہماری معلومات کی ضرورت نہیں۔بنگال سوراجیہ پارٹی کا محترم لیڈر اور اس کے ساتھی گھر بیٹھے ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔لیکن بدقسمت شمال مغربی ہند جس پر مصیبت سب سے زیادہ آتی رہتی ہے، اسی طرح خوابِ غفلت میں مست ہے۔اکالیوں کے سوا ملکی رہبر نوجوانوں کو سحر کی نیند سلا رہے ہیں۔اس لیے ہم نے اس سرزمین کو سب سے پہلے اپنا قبلۂ توجہ بنایا ہے۔ ہندو مسلم اختلاف کو رفع کرنے کی بارہا کوششیں کی گئیں، مگر ان میں سے کوئی بھی بارآور نہ ہو سکی۔کیوں کہ مسئلہ کی اصلیت و ماہیت پر غور نہیں کیا جاتا۔

اگر تعمق (گہرائی) سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف ان دو فرقوں میں باہمی اختلاف ہے بلکہ ہر ایک فرقہ کے اندر قومی اور معاشرتی تقسیمات موجود ہیں۔

مسلمانوں میں قومی سوال موجود ہے' اگر پنجابی و سندھی' ہندوستانی اور پٹھان' کشمیری اور بلوچی کا قومی سوال موجود ہے تو ہندوؤں میں بنگالی و بہاری' مدراسی و مرہٹی' گجراتی و مارواڑی کا مسئلہ پایا جاتا ہے۔ ان قومی اختلافات کو مذہبی یگانگت بھی نہیں مٹا سکتی۔ اس کے بعد ہر قوم میں طبقاتی پیچیدگی موجود ہے' مالدار و محنت کش' زمیندار و کسان' سرمایہ دار و مزدور کی باہمی کشاکش ہر ایک ہندوستانی قوم کو دو متقابل اور متعارض صنفوں میں بہ آسانی تقسیم کر سکتی ہے۔

اس لیے صرف مذہبی بناء پر تمام ہندوستانی مسائل اور خصوصاً ہندو مسلم اختلافات کو حل کرنا کوئی راہ نجات پیدا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ہم اپنے پروگرام میں مذہب کو ان مسائل کے حل کرنے کی اساس نہیں قرار دیتے بلکہ قومی اور طبقاتی تفریق اور اقتصادی و سیاسی اصول پر ان مشکلات کا حل پیش کرتے ہیں' جس کے ذیل میں مذہبی اختلافات بھی معقولیت سے رفع ہو سکتے ہیں۔ ہم ہندوستان کو ایسے ممالک میں تقسیم کرتے ہیں' جہاں ایک قوم آباد ہو۔ جس کی زبان اور معاشرت میں یکسانی پائی جاتی ہو۔ اس تقسیم کے بعد ہر ایک مذہب کے لیے کسی نہ کسی ملک میں اکثریت حاصل ہونے کی گنجائش ہے۔ اس طرح مذہبی تنازعات کا قطعی طور پر سد باب ہو سکتا ہے۔ ان ممالک کی جمہوریتوں میں انتخاب کے لیے حق نمائندگی مذہبی تفریق کی بجائے طبقاتی اختلافات کی بنا پر دیا جائے گا۔ اس طرح چھوٹے مذہبی فرقوں کی بھی حق تلفی نہیں ہوگی۔

آج کل کی صنعتی دنیا سے ہندوستان کی موجودہ ترقی کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستان نظام سرمایہ داری کے مطابق ترقی کر کے یورپ و امریکہ کا پرامن مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائے کہ انگریزی سرمایہ داروں اور ملوکیت پسندوں کا مدّ مقابل بنے۔ اپنے آپ کو آزاد کرنے میں عموماً اہالیان ملک کی فلاح جو اس

نظام کے ماتحت رہ کر حاصل ہو سکتی ہے'اس کا ترقی یافتہ نمونہ صنعتی ممالکِ مغرب میں موجود ہے۔اس لیے ہم اپنے ملک کے موجودہ نظام سرمایہ داری کو توڑ کر ایسے نظام کی بنیاد ڈالتے ہیں' جو طبقہء محنت کش یعنی ملک کی اکثریت کی فلاح کا ضامن ہو۔اور اسی محنت کش طبقہ کے زیرِ اقتدار رہے۔اس سے ہماری تحریک آزادی بھی یقیناً کامیاب ہو سکتی ہے۔کیوں کہ اس نظام کی تائید میں عموم اہالیئے ملک کی ہمدردی جب شروع ہو گئی تو آخر تک قائم رہے گی۔اور یہی کلید کامیابی ہے۔

مروجہ نظام سرمایہ داری کو ہم رد کرتے ہیں' لیکن اس کے بجائے کوئی ایسا نظام قبول نہیں کرتے' جس میں مذہب کے لیے بالکل گنجائش نہ ہو۔اور وہ چھوٹی انفرادی ملکیت کی اجازت نہ دیتا ہو۔کیوں کہ ہمارے ملک کی (۷۲) فی صدی آبادی پرانے طریقہ کاشت کاری سے اوقات بسر کر رہی ہے۔عوام میں مذہبی رسوم' ان کی معاشرت کا جزو بن چکی ہیں۔اگر ان امور کا خیال نہ کر کے کوئی پروگرام بنایا جائے تو تحریک آزادی بہت دور پیچھے پڑ جائے گی۔ہم نے نیا اقتصادی و سیاسی نظام تجویز کرتے ہوئے اپنی پارٹی کے ممبروں کے لیے جو آزاد ہند کی نئی گورنمنٹ بنائیں گے' یہ شرط لگا دی ہے کہ وہ اپنی ذاتی ضروریات اور مصارف کو اپنے ملک کی متوسط زراعت پیشہ آبادی سے زیادہ نہ بڑھائیں تاکہ گورنمنٹ میں سرمایہ داری کو کسی طرح دوبارہ پیدا ہونے کی گنجائش باقی نہ رہے۔اور ہماری پارٹی کی نسبت یہ شبہ نہ ہو سکے کہ اس کا پروگرام محض خود پروری کے لیے ہے۔یا ایک سیاسی حربہ کا حکم رکھتا ہے۔

ہندوستان جیسے ملک کا دنیا سے علیحدہ رہنا ممکن نہیں اور نہ وہ دنیا سے کبھی علیحدہ رہ سکا ہے۔اس وقت جو ہندوستانیوں میں بیرونی تعلقات سے ایک نفرت سی پائی جاتی ہے۔ وہ عارضی ہے وہ جس قدر سیاسی طاقت اپنے ہاتھ میں لیتے جائیں گے' اسی قدر یہ جذبہ کمزور

ہوتا جائے گا۔ ہماری پارٹی ہندوستان کے تعلقات خارجیہ بتدریج پیدا کرنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ ایشیاٹک فیڈریشن تحریک کو سمجھتی ہے۔ اس لیے ہم نے اسے اپنے پروگرام کا اہم حصہ قرار دیا ہے۔

(ایشیاٹک فیڈریشن کے تصور کا پس منظر)

ایشیاٹک فیڈریشن کا خیال پہلے دو دفعہ جاپان اور ترکی کی طرف سے مختلف لہجوں میں دنیا کے سامنے آچکا ہے، مگر وہ چونکہ شہنشاہی طاقتیں تھیں، شاھنشاہی روس کو ایشیائی ممالک میں شمار نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اب تیسری بار یہ آواز ہندوستان سے اٹھتی ہے۔ اگر ہندوستان سرور اجی تحریک یعنی محنت کش طبقہ کی حمایت و حفاظت کو اس کا مرکز قرار دیتا ہے۔ اور اشتراکی روس کو مشرقی ممالک میں شمار کرتا ہے تو ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ اس میں اسے ناکامی نہیں ہوگی۔

ہماری کمیٹی کا خیال ہے کہ ایشیاٹک فیڈریشن کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا، جب تک ایشیا روس کو اپنے اندر جذب نہیں کر لیتا۔ روسی ایک ایشیائی کی نظر میں نیم ایشیائی قوم ہے۔ اس وقت نصف ایشیا اس کے زیر اقتدار ہے۔ روس پرانی ایمپر اطوری خیالات چھوڑ کر ایک ایسے اصول کے لیے لڑ رہا ہے، جس کی علمبرداری ایشیا کو کرنی چاہیئے تھی۔ ممکن ہے روسی انقلاب کے زمانے میں مذہب کے خلاف جو تشدد برتا گیا ہے، اس سے متاثر ہو کر ہمارے دوست ایشیاٹک فیڈریشن میں روس کا نام سن کر گھبرا جائیں۔ اس لیے ہمیں اپنا خیال ذرا وضاحت سے لکھنا چاہیئے۔ انقلابِ روس کے دو پہلو ہیں:

ا۔ ایک تو یہ کہ موجودہ تقسیم دولت اور قانون ملکیت کو بدلا جائے۔ اور اس کے عوض ایک نیا نظام ایسا قائم کیا جائے، جس میں انفرادی ملکیت کے بدلے اجتماعی ملکیت کا قانون

جاری ہو۔ اور زمین کی پیداوار اور صنعتی مال کو بیچنے کے لیے نہیں بلکہ حسبِ ضرورت استعمال کے لیے پیدا کیا جائے۔

انقلاب کا یہ پہلو دنیا پر اپنا اثر ڈال رہا ہے۔ اگر کمیونسٹ انٹرنیشنل اپنے انتہائی نقطہ نظر میں جلدی کامیاب نہ بھی ہو، پھر بھی وہ دنیا میں سیاسی اور اقتصادی طاقت محنت کش طبقہ کو دلا کر رہے گی۔ انقلاب کے اس پہلو سے صرفِ نظر کرنا سیاسی کوتاہ بینی کی دلیل ہے۔ ہندوستان نے انقلاب عظیم فرانس سے چشم پوشی کر کے اپنی عظمت کو خاک میں ملا دیا۔ اب اس عالمگیر اہمیت رکھنے والے واقعہ سے اغماض (نظر انداز) کر کے ہم نہیں چاہتے کہ وہ اپنے موت کے فتوے پر دستخط کر دے۔ ہمالیہ، قرہ کورم اور ہندوکش کے مقام اتصال سے چند قدم آگے روس ہم سے ملتا ہے۔ ہماری قطعی رائے ہے کہ اس غلامی کے (۶۰) سال میں جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے، اگر وہ سارے کا سارا دے دیں اور ننگے بھوکے رہ کر شمال مغربی دروں سے قطب شمالی تک رہنے والی قوموں کی دوستی خرید لیں تو ہم خسارے میں نہیں رہیں گے

نہ سنبھلو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

۲۔ اس انقلاب کا دوسرا پہلو مذہب سے علیحدگی ہے، جو روس میں تشدد کا انتہائی درجہ اختیار کر چکی تھی۔ اگرچہ وہ اس تہلکے سے کوئی نسبت نہیں رکھتی، جو دہلی نے ۱۸۵۸ء میں دیکھا۔ قوم کے ایک حصہ کا دوسرے حصے پر غلبہ اور ایک قوم کا دوسری قوم پر قبضہ یکساں نہیں ہوتے۔ پھر بھی یہ حالت معمولی اور طبعی نہیں بلکہ ایک سخت تلاطم اور ہنگامے کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ راہنمایانِ مذہب نے پرانے نظام امپیراطوری و سرمایہ داری کی حمایت میں مذہب کو آلۂ کار بنایا تھا۔ لیکن حالات کے سکون پذیر ہونے پر مذہب کی مخالفت دھیمی پڑ گئی، روسی کاشتکار ہمارے کاشت کاروں کی طرح سختی سے اپنے مذہب کا پابند ہے۔ ہمارے سامنے ماسکو میں

پادریوں کی کانفرنس ہوئی، جس میں انہوں نے سوویت کی اقتصادی وسیاسی پالیسی کی تائید میں ریزولیوشن پاس کیے۔اورانہیں کسی قدر مذہبی آزادی مل گئی۔

اسی طرح قازان میں مسلمان عالموں کی کانفرنس منعقد ہوئی۔مگرافسوس ہے کہ روسی وترکستانی مسلمان عام طور پر یورپین سیاست کو سمجھنے میں اسی دور سے گزرر ہے ہیں، جس سے ہندوستانی مسلمان ۱۸۷۲ء میں گزر چکے ہیں۔وہ بہت جلد انگریزوں کی نمائشی باتوں میں آجاتے ہیں اورروس ہے کہ کسی حالت میں انگریزی امپیراطوری نفوذ کو برداشت نہیں کرسکتا۔ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ جب ہم ان لوگوں کو دیکھتے ہیں، جن کے مناقب ہم ہندوستان میں گاتے رہتے ہیں۔ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ روس کے متعلق ہماری معلومات ایسی مستند ہیں جن کی محض نظریات سے بھی تردید نہیں ہوسکتی۔البتہ ہمیں اس وقت لطف آئے گا، جب کوئی مشرقی خواہ ہمارے خیال کی تردید کے لیے ہی مشاہدہ وتجربہ کی بنا پر واقعات جمع کرنے پرآمادہ ہوگا۔ہمارا مطلب یہ ہے کہ ایشیاٹک فیڈریشن کا نام لینے والے حضرات روسی مسئلہ کا مستقل مطالعہ شروع کردیں۔اورگھر میں بیٹھ کرکسی غلط پروپیگنڈہ سے متاثر نہ ہوں۔

ہم نے اپنے پروگرام میں جس کو ہم اپنی حیات اورترقی کے لیے لازمی سمجھتے ہیں، مذہب کو پورا موقعہ دیا ہے۔اگر ہندوستانی مذاہب کے راہ نما سروراجیہ جمہوریہ کے سیاسی و اقتصادی پروگرام کو اپنے ہاتھ میں لے کراسے کامیاب بنانے پر کمر ہمت باندھ لیں تو نہ ان کے مذہب کو کوئی خطرہ ہے اور نہ ان کے برخلاف تشدد کا اندیشہ۔ورنہ اقوام اپنا حق حیات قائم رکھنے کی خاطر کسی قسم کی رکاوٹ کی پروانہیں کرتیں اور ہندوستانی بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں رہیں گے۔

حربِ عمومی کے نتیجہ کے طور پر روس، جرمنی، آسٹریا، ترکیا میں شاھنشاہی ختم

ہوگئی۔ یہ سب قومیں اب اپنی تعمیر میں مصروف ہیں۔نئی ترکیا کا رقبہ بے شک تھوڑا ہو گیا ہے مگراس وقت اس کی طاقت زیادہ ٹھوس بن رہی ہے جو ہرایک شرقی کے لیے باعثِ مسرت ہوگی۔لیکن ہمارے ہندوستانی مسلمان دنیا کے تمام مسلمانوں کی انٹرنیشنل تحریک کو جمہوری اصول پر کامیاب بنانا چاہتے ہیں' جس کا نام' خلافت ہے۔ان میں سے ایسے لوگوں کے لیے جو کسی مسلمان سلطنت کی پالیسی کو اپنی رہنمائی کے لیے کافی نہیں سمجھتے' ہم اپنا مختصر مطالعہ بیان کرنے سے بخل نہیں کرتے۔اگر ہمارے سرو راجیہ اصول پر ایشیاٹک فیڈریشن کے لیے موقعہ نکلتا ہے اور مسلمان قومیں اس پروگرام کو اختیار کرنے میں پیچھے نہیں رہتیں تو اس فیڈریشن کی سیاسی و اقتصادی پالیسی کے اندر رہ کر مسلمانوں کا ایک اتحاد اسلامی معاملات پر بحث کرنے کے لیے بنایا جاسکتا ہے۔

''گر یہ نہیں تو باباوہ سب کہانیاں ہیں''۔

اس مسئلہ میں ڈاکٹر اقبال کا''خضر راہ'' ہماری صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ ہند میں سوراج (آزادی) کا نام لینا (اس کا مطلب مکمل آزادی ہو یا مختاریت داخلیہ)اور برطانوی قرضہ ہند کی طرف توجہ نہ کرنا معاملہ فہمی کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ہم نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر ایک حدتک غور کرنے کے بعد اسے اپنے پروگرام میں داخل کیا ہے:

گرچہ بے ساماں نماید کارِ ما سہلش مبیں

کاندریں کشور گدائی زیب سلطانی بود

ترجمہ: ہماری بے سروسامانی کی وجہ سے ہمارے کام کو غیر اہم نہ سمجھ۔اس سلطنت میں فقیری (درویشی)بادشاہ کا زیور ہوتی ہے۔

عبیداللہ

پریزیڈنٹ کانگریس کمیٹی کابل (سابق ناظم نظارۃ المعارف دہلی)

سرِ دراجی اصل الاصول کی تشریح میں مجدّد لسانِ دہلی

خواجہ الطاف حسین حالؔی کے مسدس کا اقتباس

''سرمایہ دار''

امیروں کا عالم نہ پوچھو کہ کیا ہے	خمیر اُن کا اور ان کی طینت جُدا ہے
نہ گفتار میں ان کے کوئی خطا ہے	نہ کردار ان کا کوئی ناروا ہے
وہ جو کچھ کہیں کہہ سکے کون ان کو
بنایا ندیموں نے فرعون ان کو

سمجھتے ہیں سب عیب جن عادتوں کو	بہائم سے نسبت ہے جن سیرتوں کو
چُھپاتے ہیں اوباش جن خصلتوں کو	نہیں کرتے اَجلاف جن حرکتوں کو
وہ یاں اہل دولت کو ہیں شیرِ مادر
نہ خوف خدا ہے، نہ شرمِ پیمبرؐ

نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا	نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس میں خودی سے گزرنا	تعیّش میں جینا نمائش پہ مرنا
سدا خوابِ غفلت میں بے ہوش رہنا
دمِ نزع تک خود فراموش رہنا

پریشاں اگر قحط سے اک جہاں ہے　　تو بے فکر ہیں، کیوں کہ گھر میں سماں ہے
اگر باغِ اُمّت میں فصل خزاں ہے　　تو خوش ہیں کہ اپنا چمن گُل فشاں ہے

بنی نوع انساں کا حق ان پہ کیا ہے
وہ اک نوع، نوع بشر سے جدا ہے

کہاں بندگان ذلیل اور کہاں وہ　　بسر کرتے ہیں بے غم قوُت و ناں وہ
پہنتے نہیں جز سمور و کتاں وہ　　مکاں رکھتے ہیں رشک خُلد و جناں وہ

نہیں چلتے وہ بے سواری قدم بھر
نہیں رہتے بے نغمہ و ساز دم بھر

کمر بستہ ہیں لوگ خدمت میں ان کی　　گل و لالہ رہتے ہیں صحبت میں ان کی
نفاست بھری ہے طبیعت میں ان کی　　نزاکت سو داخل ہے عادت میں ان کی

دواؤں میں مشک ان کے اٹھتا ہے ڈھیروں
وہ پوشاک میں عطر ملتے ہیں سیروں

یہ ہوسکتے ہیں ان کے ہم جنس کیوں کر　　نہیں چین جن کو زمانہ میں دم بھر
سواری کو گھوڑا نہ خدمت کو نوکر　　نہ رہنے کو گھر اور نہ سونے کو بستر

پہننے کو کپڑا نہ کھانے کو روٹی
جو تدبیر اُلٹی تو تقدیر کھوٹی

محنت کش

شَرف جس سے نوع بشر کو ملا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ مگر اِک فریق اَور ان کے سوا ہے

سب اس باغ کی جن سے نشو ونما ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سب اس بزم میں جن کا نُور ضیا ہے

ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر

بنے ہیں زمانے میں خدمت کی خاطر

جہاں دیکھئے فیض اس کا ہے جاری ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری

اِسی پر ہے موقوف عزت تمہاری ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یہی ہے کلیدِ درِ فضلِ باری

اسی سے ہے قوموں کی یہاں آبرو سب

اسی پر ہیں مغرور مَیں اور تُو سب

جہاں عطرِ حکمت سے ہوتا نہ خوشبُو ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہلاتے نہ اَگلے اگر دست و بازو

نہ حق پھیلتا رُبع مسکوں میں ہر سُو ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ نہ اَخلاق کی وضع ہوتی ترازو

حقائق یہ سب غیر معلوم ہوتے رہتے

خُدائی کے اَسرار مکتوم رہتے

سماں زُلف سنبل کی تاب و شکن کا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گُلستان میں جو بَن گُل و یاسمین کا

رُخ جاں فزا لالہ و نسرن کا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ قد دِل رُبا سرو اور نِزوَن کا

غریبوں کی محنت سے ہے رنگ و بُو سب

کمیروں کے خوں سے ہیں یہ تازہ رُو سب

چنیں گر نہ وہ ہوں، کھنڈر کاخ و ایواں
بُنیں گر نہ وہ، شاہ و کشور ہو عریاں

جو بوئیں نہ وہ تو ہوں جاندار بے جاں
جو چھانٹیں نہ وہ، تو ہو جنگل گلستاں

یہ چلتی ہے گاڑی انہیں کے سہارے
جو وہ کَل سے بیٹھیں تو بے کَل ہوں سارے

مُشقّت میں عمر ان کی کٹتی ہے ساری
نہیں آتی آرام کی ان کی باری

سدا بھاگ دوڑ ان کی رہتی ہے جاری
نہ آندھی میں عاجز، نہ مینہ میں ہیں عاری

نہ لُو جیٹھ کی دَم تڑاتی ہے اِن کا
نہ ٹھِر ماگھ کی جی چھُڑاتی ہے اِن کا

کھپاتے ہیں کوشش میں تاب وتواں کو
گھُلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں کو

سمجھتے نہیں اس میں جاں اپنی جاں کو
وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو

بس اس طرح جینا عبادت ہے ان کی
اور اس دھن میں مرنا شہادت ہے ان کی

محنت کش انسانوں کی ہمدردی

سرور اجی تخّیل کی عظمت

بہت نوع انساں کے غم خوار و یاور
ہوا خواہِ ملّت بہ اندیش کشور

شدائد کے دریائے خوں میں شناور
جہاں کی پُر آشوب کشتی کے لنگر

ہر ایک قوم کی ہست و بُو دان سے ہے یہاں
سب اس انجمن کی نمود ان سے ہے یہاں

نہ احباب کے تیغِ احساں کے گھائل　　نہ بیٹے سے طالب نہ بھائی سے سائل
نہ دکھ درد میں سُوئے آرام مائل　　نہ دریا و کوہ ان کے رستے میں حائل

سنے ہوں کبھی رستم و سام جیسے
غیور اب بھی لاکھوں ہیں گمنام ایسے

کسی پر ہو سختی صعوبت ہے ان پر　　کسی کو ہو غم رنج کلفت ہے ان پر
کہیں ہو فلاکت مصیبت ہے ان پر　　کہیں آئے آفت قیامت ہے ان پر

کسی پر چلیں تیر آماج یہ ہیں
لُٹے کوئی رہ گیر تاراج یہ ہیں

یہ ہیں حشر تک بات پر اڑنے والے　　یہ پیاں کو میخوں سے ہیں جڑنے والے
یہ فوجِ حوادث سے ہیں لڑنے والے　　یہ غیروں کی ہیں آگ میں پڑنے والے

اُمنڈتا ہے رکنے سے اور ان کا دریا
جنُوں سے زیادہ ہے کچھ ان کا سودا

جماتے ہیں جب پاؤں ہٹتے نہیں یہ　　بڑھا کر قدم پھر پلٹتے نہیں یہ
گئے پھیل جب پھر سمٹتے نہیں یہ　　جہاں بڑھ گئے پھر تو گھٹتے نہیں یہ

مہم بن کیے سر نہیں بیٹھتے یہ
جب اُٹھتے ہیں اُٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ

خدا نے عطا کی ہے جو ان کو قوت　　سمائی ہے دل میں بہت ان کے عظمت
نہیں پھیرتی ان کا منہ کوئی زحمت　　نہیں کرتی زیر ان کو کوئی صعوبت

بھروسے پہ اپنے دل و دست و پا کے
سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے

مہا بھارت سُرو راجیہ پارٹی

یعنی

(کل ھندوستان کی عوامی جمہوری پارٹی)

پارٹی کی سیاسی اور معاشی بنیاد

(۱)

''کانگریس کمیٹی کابل'' نیشنل کانگریس میں ایک مستقل پارٹی کی بنیاد رکھتی ہے جو ملک میں ''سرو راجیہ حکومت'' پیدا کرے گی۔ ''سرو راجیہ اصول'' پر حکومت کے لیے ضروری ہے کہ:

(الف) ملک کے بڑے طبقوں یعنی کاشتکار، مزدور اور دماغی محنت کش کو چھوٹی صنفوں یعنی زمیندار اور سرمایہ دار کی طرح جمہوری گورنمنٹ کے ہر ایک شعبہ میں نمائندگی کا حق ان کی تعداد کے مطابق دے کر اسے محفوظ کر دیا جائے۔

(ب) اقتصادی نظام مستقل طور پر ایسا قائم کیا جائے، جو محنت کش طبقہ یعنی کاشتکار، مزدور اور دماغی محنت کش کو قرض و افلاس سے بچانے کا ضامن ہو۔ اور ملک کو ایسے

خارجی قرضہ کامحتاج نہ بنائے، جس سے سیاسی آزادی سلب ہونے کا خطرہ پیدا ہوسکے۔

اس پارٹی کا نام ''مہابھارت سرور اجیہ پارٹی'' ہوگا۔

اصول ومقاصد

(۲)

مہابھارت سرو راجیہ پارٹی اپنے سروراجی اصول کی اساس پر مقاصد ذیل کے لیے جدوجہد جاری رکھے گی:

(الف) ہندوستان کی مکمل آزادی حاصل کرنا۔ ملک میں جمہوری نظام قائم کرنا۔

ہندوستان کے مختلف مما لک کو ایک ملک فرض کر کے نئی ہندوستانی واحد قومیت پیدا کرنے کی کوشش کو اساس آزادی نہ بنانا۔

(ب) آزاد ہند کو ملوکیت اور سرمایہ داری سے ہمیشہ کے لیے پاک کرنا اور اسے انسانی سوسائٹی کے لیے ایک نمونہ بنانا۔

(ج) تمام ہندوستانی اقوام کو نظامِ توافق (فیڈرل نظام) میں جمع کرنا۔

(د) ایشیائی اقوام میں ایمپراطوری اور سرمایہ داری کے خلاف ایک توافق (سرو راجیہ ایشیاٹک فیڈریشن) پیدا کرنا۔

(ھ) اقوامِ عالم میں مشرق کو اس کا حق دلوانا۔

وسیع ہندوستان میں اقوام کے درمیان اتحاد کی اساس

(۳)

ہندوستان کا رقبہ یورپ (بہ استثنائے روس) کے برابر ہے۔ اس کے مختلف حصوں کی آبادی میں زبان، معاشرت اور تمدن کے گہرے اساسی اختلاف موجود ہیں۔ ''سرو راجیہ پارٹی'' یقین رکھتی ہے کہ آزادی کے بعد بھی اس قسم کے اختلافات ضرور موجود رہیں گے، جیسے آج کل یورپین اقوام میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے ''سرو راجیہ پارٹی'' ہندوستان میں کسی غیر طبعی اتحاد کو اساس آزادی قرار دینے سے قطعاً انکار کرتی ہے۔

(الف) مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی ہر ایک ہندوستانی ملک کے محنت کش طبقہ کی جدوجہد پر اس ملک کی آزادی کو منحصر سمجھتی ہے۔

(ب) نظام توافق (فیڈرل سسٹم) کے سوا اور کسی نظام کو ہندوستانی وحدت قائم رکھنے والا نہیں مانتی۔

پارٹی کی جدوجہد کا دائرہ عمل

(۴)

پارٹی نیشنل کانگریس سے اپنے اصول و مقاصد منوانے کی جدوجہد برابر جاری رکھے گی۔

(الف) مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی ''نیشنل کانگریس کریڈ'' کی پابندی نہایت سختی سے اپنے اوپر عائد کرتی ہے تاکہ پارٹی نظام بے فائدہ کشت و خون سے محفوظ رہے

لیکن نیشنل کانگریس کی مجلس عاملہ میں اس وقت تک شریک نہ ہوگی جب تک پارٹی کسی چھوٹی یا بڑی کانگریس کمیٹی میں اکثریت حاصل نہیں کرلیتی۔

(ب) مہابھارت سرو راجیہ پارٹی آزادی کی جدوجہد کو برطانوی مقبوضات تک محدود نہیں رکھے گی بلکہ ہندوستانی ریاستوں کو بھی اپنے دائرہ عمل میں شامل کرتی ہے۔

(ج) مہا بھارت سرِ و راجیہ پارٹی اپنی سیاسی جدوجہد میں تمام ایسی ہندوستانی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ اشتراک عمل کرے گی، جو ہندوستان کی کامل آزادی کو اپنا مقصد قرار دیتی ہیں۔ اور نظام سرمایہ داری کی کسی طرح بھی تائید نہیں کرتیں۔

مرکز

(۵)

''مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی'' کا مستقل مرکز ''دہلی'' ہوگا۔ اور ثانوی مراکز ''لاہور'' اور ''آگرہ'' رہیں گے۔

میدانِ عمل

(۶)

مرکزی سرو راجیہ پارٹی ہندوستان کے تین قدرتی حصوں یعنی شمال غربی، شمال شرقی اور دکن میں سے اس حصہ کو جس میں دہلی واقع ہے، بطور نمونہ اپنا مرکزی میدان عمل قرار دیتی ہے۔ اور اسے ''سرو راجیہ ہند'' کے نام سے موسوم کرے گی۔ م س پارٹی فی الحال ''سرو راجیہ ہند'' کے حدود اس طرح مقرر کرتی ہے۔ اس کے شمال میں جھیل مانسرور، کوہ ہمالیہ، قرہ

قرم اور ہندوکش' اسکے مشرق میں نیپال' بنارس اور دریائے چنبل۔ اس کے جنوب میں دریائے نربدا اور بحیرہ عرب۔ اس کے مغرب میں افغانستان اور ایران۔

قومی اور ملکی تقسیم

(۷)

''سروراجیہ ہندکوم' س' پارٹی'' ایسے ملکوں میں تقسیم کرے گی' جہاں ایک قوم آباد ہے۔ جو ایک زبان بولتی ہے' جس کی معاشرت میں عموماً یکسانی پائی جاتی ہے۔ ان ممالک میں ہر ایک ملک ''سُروراجی'' ملک کہلائے گا۔

(الف) ایک ابتدائی تجویز کے طور پر م۔ س۔ پارٹی سروراجی ہند یعنی (شمال مغربی حصے) کو دس سرواجی ملکوں میں تقسیم کرتی ہے۔

(۱) ''بھارت'' جس کی زبان ہندوستانی (اردو) ہے اس میں دوآبہ گنگا جمنا اور لکھنو شامل ہیں۔ اس کے مرکزی شہر دہلی اور آگرہ ہیں۔

(۲) جنوب مشرقی پنجاب' جس کا مرکزی شہر 'امرت سر' ہے اور زبان پنجابی ہے۔

(۳) شمال مغربی پنجاب' جس کی زبان پوٹھوہاری پنجابی ہے۔ مرکزی شہر راولپنڈی ہے۔

(۴) جنوب مغربی پنجاب' جس میں ریاست بہاول پور داخل ہے۔ اس کا مرکزی شہر ملتان ہے' اور زبان ملتانی پنجابی ہے۔ لاہور تینوں جمہوریتوں کے نظام سے خارج رہے گا۔

(۵) 'کشمیر' جس کی زبان کشمیری ہے اور مرکزی شہر 'سری نگر' ہے۔

(۶) پشتانیہ'(یعنی صوبہ سرحدی شمالِ مغربی) جس کی زبان پشتو اور مرکزی شہر'پشاور' ہے۔

(۷) 'بلوچستان' جس کی زبان بلوچی اور مرکزی شہر'کوئٹہ،'قلات' ہیں۔

(۸) 'سندھ' جس کی زبان سندھی اور مرکزی شہر'کراچی' ہے۔

(۹) 'گجرات' جس کی زبان گجراتی اور مرکزی شہر'احمد آباد' ہے

(۱۰) 'راجپوتانہ' اس کی زبان ہندوستانی (ہندی) اور مرکزی شہر'اجمیر' ہے۔

(ب) ہر ایک سروراجی ملک مستقبل میں ایک سروراجی جمہوریہ' ہوگا۔ جو اپنی اقتصادی تمدنی اور سیاسی آزادی محفوظ رکھتے ہوئے 'متوافق جمہوریات ہند (انڈین فیڈرل ری پبلکس) کے لیے اکائی بنے گا۔

پارٹی کی ممبر شپ

(۸)

ہر ایک سروراجی ملک کا باشندہ مرد و عورت بلاتفریق نسل و مذہب اپنے ملک کی ''سروراجیہ پارٹی'' کا ممبر بن سکتا ہے' اگر وہ:

(الف) نیشنل کانگریس کریڈ کو مانتا ہو۔

(ب) سروراجیہ پارٹی کے اصول و مقاصد اور پروگرام کو وفاداری سے مانتا ہو۔

(ج) پارٹی کے انضباطی احکام کی پابندی کا یقین دلائے۔

(د) اپنی ضروریات زندگی اپنے ملک کے متوسط الحال زراعت پیشہ اشخاص سے نہ بڑھائے۔

(ھ) اپنی ضروریات زندگی سے زائد جائداد اگر رکھتا ہو تو پارٹی کے نام منتقل کردے۔

تشریح: جب تک پارٹی ممبروں کی جائداد کو اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کرے اس وقت تک وہ جائداد ان ہی ممبروں کے پاس امانت رہے گی۔

رضا کار

(۹)

ہر ایک سوراجی ملک کا باشندہ مرد و عورت بلاتفریق نسل و مذہب اپنے ملک کی 'سوراجیہ پارٹی' کا رضا کار بن سکتا ہے۔ اگر وہ ممبری کی پہلی تین شرطیں پوری کرتا ہو۔

(الف) ہر ایک رضا کار کا فرض ہوگا کہ اگر وہ ایک ہندوستانی عورت یا ایک ہندوستانی مذہبی مقدس مقام کو خطرہ میں دیکھے تو اس کی مدافعت میں (اپنی) جان تک لڑا دینے سے دریغ نہ کرے۔

(ب) ہر ایک ہندو رضا کارانہ طور پر نہ صرف پرانے اچھوتوں سے برابری کا سلوک کرے گا بلکہ اس کا فرض ہوگا کہ تمام ایسے لوگوں کے ساتھ جنہوں نے ہندوستان کو مستقل طور پر اپنا وطن بنا لیا ہے' بلاتفریق نسل و مذہب مساوات اور محبت کا سلوک کرے۔

(ج) ہر ایک مسلمان رضا کار کا فرض ہوگا کہ وہ گاؤ کشی بند کرنے میں کانگریس کمیٹی کابل کے حسب ذیل فیصلہ کا پابند رہے۔

فیصلہ

کانگریس کمیٹی کابل کو معلوم ہے کہ اسلامی دنیا کے تمام اہل الرائے اپنی نکبت

(ذلت) کا واحد سبب ہندوستانی غلامی کو قرار دیتے ہیں۔ اور جب انہیں بتلایا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا گاؤکشی پر اصرار کرنا بھی ہندوستان کی آزادی میں ایک رکاوٹ ہے تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے اس طرزِ عمل کو سخت نفرت سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے کانگریس کمیٹی کا بل' کا فیصلہ ہے کہ کم از کم مخلوط آبادی میں گاؤکشی قطعاً بند کر دی جائے۔

رضا کاروں کی تنظیم

(۱۰)

ایک مکمل جیش رضا کاروں میں (۳۰۰) رضا کار ہوں گے جس کے دس دستے رضا کار افسروں کے ماتحت کام کریں گے۔ لیکن اس کی قیادت تین پارٹی ممبروں (یعنی ایک 'قائد' اور دو 'نائب قائد) کے ہاتھ میں ہوگی۔

مجالس آمرہ و عاملہ

(۱۱)

جس وقت ایک سوراجی ملک میں کم از کم (۱۰۰) پارٹی ممبر پیدا ہو جائیں گے اور ایک ''جیش رضا کاراں' مرتب ہو جائے گا۔ تو ممبروں اور رضا کاروں کی مشترکہ کانفرنس منعقد ہوگی جسے اس ملک کی 'سوراجیہ کانفرنس' کہا جائے گا۔ اس کانفرنس میں ان تمام پارٹیوں کے ممبر بطور مشیر شامل ہو سکتے ہیں، جن سے سوراجی پارٹی' اشتراک عمل کا فیصلہ کر چکی ہے۔ لیکن رائے دینے کا حق پارٹی ممبروں اور رضا کاروں تک محدود رہے گا۔

(الف) سروراجیہ کانفرنس اپنے ملک کی سروراجیہ پارٹی کے تمام قانونی' مالی اور انتظامی اختیارات کی مالک ہے۔ کانفرنس اس قانون اساسی کی تشریح اور تکمیل کرے گی۔ بیس پارٹی ممبروں پر مشتمل اپنی 'سروراجیہ عاملہ کمیٹی' منتخب کرے گی' جسے انتظامی اور مالی اختیارات حاصل ہونگے۔ کانفرنس اس کی تمام کاروائی کی نگرانی وتصدیق کرتی رہے گی۔

(ب) ہر 'سروراجیہ کانفرنس' کا سب سے پہلا کام دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے:

(۱) اوّل: یہ کہ اپنے ملک کے حاجت مند محنت کش طبقہ کا پرانا (قرض) ادا کرے اور انہیں دوبارہ قرض میں مبتلا ہونے سے بچائے اور جہاں مسلمانوں کا افلاس گاؤکشی بند کرنے میں مانع ہو اِن کی امداد کرے۔

(۲) دوم: یہ کہ برطانوی قرض ہند جو سیاسی آزادی کو سلب کر رہا ہے' اس کا جس قدر حصہ اس ملک پر عائد ہوتا ہے' اس کو ایسے قرض میں تبدیل کرے' جس میں سیاسی آزادی سلب ہونے کا خطرہ نہ ہو۔

(ج) اس کام کی تکمیل کے لیے کانفرنس' مختلف صورتوں میں پارٹی فنڈ جمع کرے گی۔

۱۔ پارٹی ممبروں کی منقولہ جائداد اپنے قبضہ میں لے گی۔

۲۔ مستطیع (مالی طاقت رکھنے والے) رضا کاروں سے چندہ لیا کرے گی۔

۳۔ سوشل ریفارمروں اور حامیان انسانیت سے صدقات وصول کرے گی۔

۴۔ ملک کے ہر ایک متنفس (انسان) سے اقتصادی آزادی حاصل

کرنے کے لیے ٹیکس آزادی وصول کرے گی۔

۵۔ اولاً اپنے ملک میں ثانیاً دوسرے سرو راجیہ ملکوں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے قرض حاصل کرے گی۔

(د) ہر 'سرو راجیہ کانفرنس' کا اصلی اور اہم کام اپنے ملک کی 'سرو راجیہ جمہوریہ پیدا کرنا ہے۔ اس لیے وہ محنت کش طبقہ کو سیاسیات کی تعلیم دے گی۔ ان کی تنظیمات کو اس طرح درست کرے گی کہ وہ اپنے ملک کی حکومت کے ہر ایک شعبہ میں اپنی تعداد نفوس کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکیں۔

(ھ) 'سرو راجیہ عاملہ کمیٹی' ایک سال کے لیے منتخب ہوا کرے گی اور کانفرنس سال میں دو دفعہ ماہ حمل (اپریل) اور ماہ میزان (اکتوبر) میں منعقد ہو گی۔

(و) بوقتِ ضرورت سرو راجیہ عاملہ کمیٹی کے فیصلہ پر یا تیں ممبروں کی متفقہ درخواست پر کانفرنس بلائی جا سکتی ہے۔

مجلس عاملہ کے ماتحت چھ انجمنیں

(۱۲)

'سرو راجیہ عاملہ کمیٹی' اپنے خاص کاموں کے لیے چھ ماتحت انجمنیں بنائے گی' جن میں کمیٹی پارٹی ممبروں کے ساتھ رضا کار بھی اپنے انتخاب میں شامل کرے گی۔ بوقت ضرورت ان انجمنوں میں پارٹی پروگرام سے ہمدردی رکھنے والے تنخواہ دار اصحاب بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔

ا۔ انجمن تنظیم' جو ایک پرگنہ' تحصیل اور ضلع میں اپنا دفتر کھولے گی جو:

ا۔ کسان سبھائیں' انجمن مزدوراں' دماغی محنت کشوں کی محفل اور طالب

علموں کی مسامرہ قائم کریں گی۔ یا ایسی مجالس کو اپنی تنظیم میں شامل کریں گی۔

۲۔ پارٹی فنڈ جمع کریں گی۔ جس میں ممبروں کی منتقل شدہ جائدادیں پارٹی کا قرض، ٹیکس آزادی اور وہ تمام مالی امداد داخل ہے جو انسانیت کے ہمدرد اور سوراج کے ہمدرد لوگوں سے ملے۔

۳۔ محنت کش طبقہ کے حاجت مند افراد کی فہرستیں تیار کرے گی کہ ان پر کس قدر قرض ہے اور مستقبل میں ان کو کس قدر روپیہ بطور امداد اور کس قدر بطور قرض بلا سود ملنا چاہیئے۔

۲۔ 'انجمن نشر تشویقات: جو اپنے ملک کی عام زبان میں ایک 'سروراجیہ اخبار' جاری کریں گے۔ پارٹی پروگرام کے متعلق لٹریچر ایک لائبریری میں جمع کریں گے جس کی شاخیں ہر دفتر تنظیم کے ساتھ قائم ہوں گی۔ ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں پارٹی پروگرام بطور نصاب داخل کرانے کی کوشش کریں گے۔ ایسے مکاتب بنائے جائیں گے، جن میں پارٹی پروگرام پڑھانے کے لیے اعلیٰ معلم تیار ہوں۔

۳۔ 'انجمن انضباط: جس میں پارٹی ممبروں اور رضا کاروں کے سوا اور کوئی شامل نہیں ہوسکتا۔ پارٹی ممبر اور رضا کار بھرتی کریں گے۔ انضباط کے لیے ہدایات نافذ کیا کریں گے۔ ان کی خدمات کا حساب لیا کریں گے۔ اس انجمن کے احکام ممبروں اور رضا کاروں کے لیے قطعی ہوں گے۔

۴۔ 'انجمن کوآپریٹو بنک (جس میں مالیات کے تنخواہ دار ماہر بھی شامل کیے جائیں گے): پارٹی فنڈ سے ایک 'سروراجیہ کوآپریٹو بنک' کی بنیاد ڈالی جائے

گی اس میں:

ا۔ حامیان انسانیت، سوشل ریفارمروں، ہمدردان سوراج کے صدقات جمع کیے جائیں گے جو محنت کش طبقہ کے حاجت مندوں کو بطور امداد یا بطور قرض بلا سود دیے جائیں گے۔ اسی سے اس طبقہ کے پرانے قرض ادا کیے جائیں گے۔

۲۔ کاروباری لوگوں کی عموماً اور محنت کش طبقہ کی امانتیں خصوصاً اس میں جمع کی جائیں گی اور سوسائیٹوں میں بطور سرمایہ لگائی جائیں گی۔ ارباب الاموال بجائے سود لینے کے نفع و نقصان میں شریک رہیں گے۔

۳۔ 'سرو راجیہ بنک' بیرونی ممالک سے سودی لین دین کرنے پر مجبور ہے اسے مستثنیٰ قرار دے کر یہ بنک سرو راجیہ ہند میں کسی طرح کا سودی لین دین نہیں کریگا۔

۵۔ ''انجمن مجالس امداد باہمی'' سرو راجیہ بنک سے سرمایہ لے کر سرو راجیہ شرکت ہائے تعاون (کمپنیاں) کھولی جائیں گی جو زراعت، پیداوار اور ضروریات محنت کش طبقہ کی تجارت کریں گی۔ محنت کش طبقہ میں امداد اور قرض بلا سود ان ہی شرکتوں کے توسط سے تقسیم ہوگا۔

۶۔ ''انجمن محاسبہ دیون'' جو:

ا۔ مقروض محنت کش طبقہ کے پرانے قرض کی ادائیگی اپنے ذمہ لے کر پنچایتی فیصلے سے رقوم واجب الادا معین کرے گی، جس کو سرو راجیہ

بنک اپنے صیغہ جمع صدقات سے ادا کرے گا۔

۲۔ ''برطانوی قرضہ ہند'' کا جس قدر حصہ اس ملک پر عائد ہوتا ہے اس کی ادائیگی کے لیے سوسائٹی کے مختلف طبقات کے مناسب شرح ٹیکس آزادی معین کرے گی۔ اپنے ملک سے قرض لے گی ''سرو راجیہ ہند'' اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں قرض آزادی کا انتظام کرے گی۔

سروراجیہ کانفرنس

(۱۳)

سروراجیہ کانفرنس منعقد ہونے سے پہلے جس وقت ایک ''سروراجی ملک'' میں پارٹی ممبروں کی تعداد بیس تک پہنچ جائے تو وہ اپنے ملک کے لیے ''انجمن نشر تشویقات'' بنائیں گی۔ جو عارضی طور پر اس ملک کی ''سروراجیہ عاملہ کمیٹی'' کے تمام فرائض انجام دے گی۔

مہابھارت سروراجیہ کانگریس

(۱۴)

کم از کم تین سروراجی ملکوں کے تین سو (۳۰۰) پارٹی ممبروں اور نو سو (۹۰۰) رضا کاروں کی مشترکہ کانگریس ''سروراجیۂ ہند'' کی تمام پارٹیوں کے باہمی معاملات اور خارجہ تعلقات میں اعلیٰ اختیارات کی مالک ہے۔ اسے ''مہا

بھارت سرو راجیہ کانگریس'' کہا جائے گا۔

اس کانگریس میں ان تمام پارٹیوں کے ممبر بہ طور مشیر شریک ہو سکیں گے، جن کے ساتھ پارٹی اشتراک عمل کا فیصلہ کر چکی ہے لیکن ان کو رائے دینے کا حق حاصل نہ ہوگا۔

(الف) یہ کانگریس اس اساسی قانون کی ایسی دفعات کی تشریح و تکمیل کرے گی جو ان مطالب سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز اپنے انتظامی، مالی اور عدالتی اختیارات اپنی نمائندہ مجلس ''مہا بھارت سرو راجیہ کمیٹی'' کو تفویض کر کے اس کی کاروائیوں کی نگرانی و تصدیق کرتی رہے گی۔

(ب) یہ کانگریس سال میں ایک دفعہ انعقاد پذیر ہوگی۔ اس کے اجلاس دو حصوں میں تقسیم ہوں گے۔ اول سرو راجیہ ہند کے داخلیہ معاملات کے متعلق۔ دوم سرو راجیہ توافق ایشیائی کے خارجیہ معاملات کے متعلق۔ اس کانگریس کے لیے ایک مستقل قانون بنایا جائے گا۔

(ج) اس کانگریس کا پہلا کام دو حصوں میں منقسم ہے:

اوّل: یہ کہ طبقۂ محنت کش کی ضروریات پورا کرنے میں، جس سرو راجی ملک کو قرض کی ضرورت ہو، اس کے لیے دوسرے سرو راجی ملکوں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے قرض حاصل کرنے کا انتظام کرے۔

دوئم: یہ کہ ''سرو راجیہ ہند'' پر جس قدر ''برطانوی قرضہ'' عائد ہوتا ہے اسے ایسے قرض میں تبدیل کرنے کے لیے جس سے سیاسی آزادی کو نقصان نہ پہنچتا ہو، بیرونی ملکوں سے قرض لینے کا انتظام کرے۔ اس

کے لیے یہ کانگریس ایک ''مرکزی سروراجیہ کوآپریٹو بنک دہلی'' قائم کرے گی' جس سے تمام سروراجی کوآپریٹو بنک وابستہ ہوں گے۔ اور جس کی شاخیں ایشیائی ممالک میں اور ایجنسیاں یورپ وامریکہ میں کھولی جائیں گی۔

(د) اس کانگریس کا دوسرا کام یہ ہے کہ ''سروراجیہ متوافق یعنی وفاقی جمہوریات ہند'' پیدا کرے۔اس کے ذریعے کانگریس سروراجی ملکوں کی حدود معین ومشخص کرے گی۔قومی اور مذہبی اختلافات کا تصفیہ کرنے والی عدالتیں اور پنچائتیں بنائے گی۔

اس کانگریس کا خارجیہ معاملات میں ''سروراجیہ توافق ایشیائی'' پیدا کرنا اہم کام ہے۔اس کے لیے اس کانگریس کے اجلاسوں میں ایشیائی اقوام شامل ہوں گی۔

(ھ) یہ کانگریس ایشیائی ممالک میں ''سروراجیہ توافق ایشیائی'' کے مراکز اور یورپ امریکہ میں سروراجیہ دفاتر استخبارات (انفرمیشن بیوروز) کھولے گی۔

مرکزی مہابھارت سروراجیہ کمیٹی

(۱۵)

مہابھارت سروراجیہ کمیٹی مرکزی میں ایک سو (۱۰۰) پارٹی ممبر ہوں گے۔اس کی مختلف انجمنوں میں پارٹی ممبروں کے سوااور کوئی شریک نہ ہو سکے گا۔

اس مرکزی کمیٹی میں ہر ایک سروراجی ملک کے ممبر' اس ملک کی تعداد نفوس کے لحاظ سے منتخب ہوں گے۔

کانگریس کمیٹی کابل کی عارضی ذمہ داری

(۱۶)

جس وقت تک ''مہابھارت سروراجیہ مرکزی کمیٹی'' منتخب نہیں ہوتی، عارضی طور پر کانگریس (سروراجیہ) کمیٹی کابل اس کے تمام فرائض انجام دے گی۔

(الف) کانگریس سروراجیہ کمیٹی کابل جب تک ''مہابھارت سروراجیہ مرکزی کمیٹی'' کی باقاعدہ نمائندگی نہیں حاصل کرتی، اس وقت تک کسی خارجی اقتصادی معاملہ کی تکمیل نہیں کرسکتی۔

(ب) کانگریس سروراجیہ کمیٹی کابل اپنی ضرورت کے موافق ایشیائی ممالک میں اپنا مرکز تبدیل کرسکتی ہے۔

لازمی اور مفت تعلیم

(۱۷)

ہر ایک سروراجیہ جمہوریہ میں تمام ایسے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے، جو مدرسے جانے کی عمر رکھتے ہیں، ابتدائی مفت اور لازمی تعلیم کا اور ثانوی مفت تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کا فرض ہوگا۔

(الف) یہ بھی ضروری ہے کہ مکتب نہ جانے والے مرد و عورت کے لیے تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے۔

(ب) م، س، پارٹی اردو رسم الخط کو ایسے لوگوں کی آسانی کے لیے مقطوع (الگ الگ)

حروف میں لکھنے کی تائید کرتی ہے۔

کاشتکاروں مزدوروں کو انجمن سازی کا حق

(۱۸)

ہر ایک سروراجیہ جمہوریہ میں:-

(الف) کسانوں اور ان سے تعلق رکھنے والے پیشہ وروں کی ''کسان سبھائیں''

(ب) فیکٹری اور کارخانہ میں کام کرنے والے مزدوروں کی ''انجمن ہائے مزدوران''

(ج) دفتروں اور تعلیم گاہوں میں کام کرنے والوں کی ''محافل محنت کشان دماغی''

بنانے کا ناقابل تنسیخ حق محنت کش طبقہ کو حاصل ہوگا۔ جن مجالس کے توسط سے وہ لوگ اپنے مطالبات پیش کریں گے۔ اور انتخابات میں حصہ لیں گے۔ محنت کش طبقہ کو حکومت سے ناراض ہونے کی صورت میں بھی ان مجالس کے فیصلے پر اسٹرائک کا حق حاصل ہوگا۔

سروراجیہ جمہوریہ پارلیمنٹ

(۱۹)

سروراجیہ جمہوریہ کی پنچایت (پارلیمنٹ) کو تمام قانونی' مالی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوں گے۔ اس کے انتخابات مندرجہ ذیل طریقہ پر عمل میں آئیں گے:

(الف) ہر عاقل بالغ مرد و عورت کو جو کسی اخلاقی جرم میں سزایاب نہ ہو چکا ہو' اس پنچایت کے انتخابات میں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا۔

(ب) کسانوں، مزدوروں اور دماغی محنت کشوں کو اپنی سبھاؤں، انجمنوں اور محفلوں کے توسط سے اپنے تناسب آبادی کے مطابق نمائندے بھیجنے کا حق حاصل ہوگا۔

(ج) سوسائٹی کی دوسری جماعتوں یعنی زمیندار، ساہوکار، سرمایہ دار اور تاجر کو ان کی تعدادِ نفوس کے مطابق حق نمائندگی ملے گا۔ کسی صورت میں بھی ان کی اہمیت کی بنا پر ان کو تعدادِ نفوس سے زیادہ حق نمائندگی نہیں دیا جائے گا۔

(د) ان مالدار جماعتوں میں سے اگر کوئی صنف (جماعت) سروراجیہ جمہوریہ کے اقتصادی و سیاسی اصول اساسیہ کی مخالفت کرے گی تو ایک محدود وقت تک اس کا حق نمائندگی سلب کیا جاسکتا ہے، جس کے لیے علیحدہ قانون بنایا جائے گا۔

(پارٹی کے اقتصادی اُصول)

قومی ملکیت کا دائرہ

(۲۰)

فوائد عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت قرار دیئے جائیں گے۔

انفرادی ملکیت کی تحدید

(۲۱)

انفرادی ملکیت (منقولہ وغیر منقولہ) محدود کردی جائے گی۔ معین حد سے زیادہ جائداد قومی ملکیت قرار دی جائے گی۔

(الف) ادنیٰ درجہ ملکیت کی تشخیص ''سروراجیہ کانفرنس'' کا کام ہے۔

(ب) مالداروں پر متزائد ٹیکس لگایا جائے گا' جس کی آخری حد (۵۰) فی صد تک ہوگی۔

نظام زمینداری کا خاتمہ

(۲۲)

ملک کی اراضی قومی ملکیت قرار دی جائے گی۔ اور نظام زمینداری منسوخ کر دیا جائے گا۔ کسان اور گورنمنٹ کے سوا کسی کو اراضی سے تعلق نہ ہوگا۔

(الف) سرو راجیہ ہند کی ان جمہوریتوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے' م' س' پارٹی فاروق اعظمؓ کے فیصلہ کے مطابق زمینداروں کو ملکیتِ اراضی چھوڑنے اور امام ابوحنیفہؒ کے فیصلہ کے مطابق مزارعت چھوڑنے پر مجبور کرے گی۔ زمینداروں کو فقط گورنمنٹ ایجنٹ کے طور پر کام کرنے کا موقعہ دیا جائے گا۔

(ب) ایسا ہی طرز عمل "سرو راجیہ ہند" کی ان تمام جمہوریتوں میں اختیار کیا جائے گا' جہاں اکثریت آبادی کا مذہب اس اصول کی تائید کرتا ہے یا سیاسی بیداری عام ہو چکی ہے۔

(ج) جن جمہوریتوں میں اکثریت آبادی کا مذہب اس کی تائید نہیں کرتا۔ اور وہاں سیاسی بیداری بھی عام نہیں ہے تو ان جمہوریتوں میں اولاً ملکیتِ زمین محدود کرنے پر اکتفا کیا جائے گا۔ اور سیاسی بیداری عام ہونے پر اراضی کی انفرادی ملکیت منسوخ کر دی جائے گی۔

(د) ہر کاشت کار خاندان کو اس قدر اراضی ضرور دی جائے گی' جس قدر وہ خود کاشت کر سکے۔ اس زمین پر اس خاندان کا دوامی حق کاشت ایسے قانون کے ماتحت محفوظ کر دیا جائے گا جو کسان سبھاؤں کی کونسل کے مشورے سے بنایا جائے گا۔

(ھ) کاشت کار سے گورنمنٹ کُل پیداوار کا 1/5 حصہ کسان سبھاؤں کے توسط سے بطور خراج وصول کرے گی۔

(و) قومی ملکیت میں دی ہوئی اراضی کا انتظام گورنمنٹ کسان سبھاؤں کی کونسلوں کے زیر اہتمام رکھے گی۔

(ز) کسان سبھاؤں کو سرکاری امداد بہ صورت قرض بلا سود دی جائے گی۔ اور ان کے لیے زراعتی مشینری نرم شرائط ادائیگی پر مہیا کی جائے گی۔

(ح) کسان آبادی کے لیے حکومت مفت طبی امداد کا انتظام کرے گی۔

بلا سودی نظام

(۲۳)

سودی لین دین قطعاً بند کر دیا جائے گا۔ محنت کش طبقہ کے پرانے قرض بے باق کر دیئے جائیں گے۔ حاجت مندوں کو امداد یا قرض بلا سود دینے کا مستقل انتظام ہوگا۔

تجارتی اصول

(۲۴)

داخلی تجارت سروراجیہ کوآپریٹو بنک سوسائیٹوں کے ذریعہ اور خارجی تجارت ''حکومت متوافق'' جمہوریات ہند کے توسط سے عمل میں آئیں گی۔ تجارت پیشہ افراد کو ان سوسائیٹیوں میں شرکت کا موقع دیا جائے گا۔

صنعتی اصول

(۲۵)

قومی ملکیت میں دیئے ہوئے کارخانے اور فیکٹریاں انجمن مزدوران کی کونسلوں کے زیر اہتمام چلائی جائیں گی۔ اور مزدوروں کو نفع میں حصہ دیا جائے گا۔

(الف) مزدوروں کے کام کا ایک دن (٦) گھنٹے سمجھا جائے گا۔ ہندوستانی مزدور کو سرد ملکوں کے مزدوروں کی طرح ٦ گھنٹے سے زیادہ کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ م' س' پارٹی دماغی محنت کشوں اور جسمانی محنت کشوں میں تفریق کو سوسائٹی کے لیے بھی مضر سمجھتی ہے۔

(ب) مزدوروں کی ادنیٰ شرحِ مزدوری حکومت کے قانون سے مقرر ہوگی۔ اور اسی طرح بچوں اور عورتوں کے اوقاتِ محنت اور بڑھاپے' بیماری' حادثہ' حمل اور بے کاری کے لئے الاؤنس خاص قانون میں تعین کیے جائیں گے۔ ان قوانین پر انجمن مزدوران کے مطالبہ پر نظر ثانی ہوتی رہے گی۔

(ج) مزدوروں کے خاندان کیلئے حکومت مفت طبّی امداد مہیا کرے گی اور ان کیلئے ستھرے گھروں کا انتظام کرے گی۔

ناجائز محصولات کا خاتمہ

(۲٦)

غیر مستقیم محصولات مثلاً ریل کا کرایہ' ڈاک کا محصول' نمک کا محصول وغیرہ مستقل

طور پر محدود کر دیئے جائیں گے۔ ضرویات زندگی اور اعلیٰ تعلیم سستا رکھنا حکومت کا اہم فرض ہوگا۔

ٹیکسِ آزادی کا نفاذ

(۲۷)

برطانوی قرضہ ء ہند سے اپنی اقتصادی آزادی حاصل کرنے کے لیے ٹیکسِ آزادی ہر ایک متنفس کو ادا کرنا ہوگا۔

سرورِاجیہ سے کسی اقلیتی قومیت کی علیحدگی

(۲۸)

اگر کسی سرو راجیہ جمہوریہ میں ایک اہم اقلیت آباد ہے، جو اپنی علیٰحدہ قومیت قائم رکھنا ضروری سمجھتی ہے تو ''مہابھارت سرو راجیہ مرکزی کمیٹی'' اس اقلیت کو اپنی علیحدہ جمہوریت کے بنانے کا اختیار دے سکتی ہے۔

اس صورت میں اس جمہوریت کو اس قوم کی اصل آبادی سے زیادہ اس قدر علاقہ ضرور دیا جائے گا، جس سے وہ اپنی اقتصادی اور تمدنی ضرورتوں کی حفاظت کر سکے۔ اس قسم کی اقلیت کی مثال پنجاب میں سکھ قوم ہے جس کے لیے ''کانگریس کمیٹی کابل'' نے امرت سر کی جمہوریہ علیحدہ کر دی ہے۔

سیاسی نظام میں مذہب کی اہمیت

(۲۹)

ہر ایک سرو راجیہ جمہوریہ اپنی اکثریت والی آبادی کے مذہب کو اپنا سٹیٹ مذہب بنا سکتی ہے۔ اگر اس مذہب کے رہنما اپنے مذہب کا ایسا مجموعۂ احکام پیش کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو مہا بھارت سرو راجیہ کمیٹی کے فیصلہ میں "سرو راجیہ جمہوریہ کے سیاسی و اقتصادی اصول اساسیہ" کے خلاف ارتجاعی مواد سے پاک ہو۔ اس صورت میں لازمی طور پر اس جمہوریت کا پریزیڈنٹ اس مذہب کے پیروکاروں سے منتخب ہو گا۔

(الف) جس صورت میں اکثریت والی آبادی کا مذہب سرکاری مذہب بن گیا' اس صورت میں اگر کسی اقلیت کا مذہب بھی "مہا بھارت سرو راجیہ مرکزی کمیٹی" کے فیصلہ میں اس شرط کو پورا کرتا ہے تو اسے بھی اپنے پیرووٗں کی تناسب آبادی کے لحاظ سے مذہبی معاملات میں سرکاری امداد حاصل کرنے کا حق ہو گا۔

(ب) ایسے مذاہب کو جو پارٹی پروگرام کا سرو راجیہ جمہوریہ کی سیاسی و اقتصادی اصول اساسیہ میں ساتھ نہیں دے سکتے' فقط اسی صورت میں مذہبی تعلیم کی آزادی دی جائے گی' جب کہ اس کے پیروکار مہا بھارت سرو راجیہ مرکزی کمیٹی کو اطمینان دلا دیں کہ وہ سیاسی معاملات میں حصہ نہیں لیں گے۔

(ج) بلا استثناء تمام مذاہب کے مقدس مقامات قانوناً متبرک سمجھے جائیں گے۔ ان محدود رقبوں کے لیے مہا بھارت سرو راجیہ مرکزی کمیٹی خاص قانون بنائے گی۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی مرکزی تعلیم گاہ دوسری قوم کے احاطے میں واقع ہے تو وہ

بھی خاص قانون کے ذریعہ محترم قرار دی جائے گی۔

جمہوریہ کے سرکاری مذہب بنانے کے ذیلی قوانین

(۳۰)

ایک سرو راجیہ جمہوریہ اگر کسی مذہب کو سرکاری مذہب بناتی ہے۔ یا اگر کسی مذہب کو تسلیم کر لیتی ہے تو وہ:

(الف) ان مذاہب کی تعلیم گاہوں اور مذہبی مقدس مقامات کو ان کی تعداد نفوس کے تناسب سے سرکاری امداد دے گی۔

(ب) ان مذاہب کے تہواروں پر سرکاری تعطیل منائی جائے گی۔

(ج) اگر ان میں سے کسی مذہب کے پیرو کار اپنی مرضی سے کسی خاص ضرورت کے لیے اپنے اوپر کوئی خاص ٹیکس عائد کریں تو حکومت اس ٹیکس کے جمع کرنے میں مدد دے گی۔

(د) اشاعت مذہب کے لیے کسی مذہب کو سرکاری امداد نہ دی جائے گی۔

مذاہب کے تنازعہ کی ثالثی پنچایت

(۳۱)

ہندوستانی مذاہب کے باہمی تنازعات فیصل کرنے کے لیے ''م س مرکزی کمیٹی'' ہر ایک سرو راجیہ جمہوریہ میں عدالتی قانون کے موافق ایک ''ثالثی پنچایت'' بنائے گی۔

(الف) اگر ایک خاندان میں سے ایک عورت باپ یا خاوند یا بیٹی (بیٹے) کی رفاقت کے

بغیر اپنا مذہب تبدیل کرتی ہے تو اس عورت کا اس پنچایت کے سامنے امتحان ہوگا اور وہ اس پنچایت کی اجازت کے سوا اپنے خاندان سے جدا نہ ہو سکے گی۔

(ب) اگر اس پنچایت کے سامنے کسی مذہب کے پیرو کاروں پر مذہب کے نام سے عورتوں کے اغوا کا الزام کئی بار ثابت ہو چکا ہو تو اس مذہب کی سرکاری امداد (اگر اس کو امداد ملتی ہے) بند کردی جائے گی۔ جب تک اس مذہب کے پیرو کار مرکزی کمیٹی کو مطمئن نہ کردیں۔

حکومت متوافق سرو راجیہ جمہوریات ہند

(انڈین فیڈرل سرو راجیہ ری پبلکن سٹیٹ)

(۳۲)

ہر ایک 'سرو راجیہ جمہوریہ' اپنی اقتصادی، تمدنی، اور سیاسی آزادی کو محفوظ رکھتے ہوئے ''حکومت متوافق سرو راجیہ جمہوریات ہند'' کا آزاد رکن رہے گا۔

(الف) حکومت متوافق سرو راجیہ جمہوریات ہند کا دارالصدر دہلی ہوگا۔ اوّلاً سرو راجیہ ہند میں اس حکومت کے دو ثانوی مراکز لاہور اور آگرہ بنائے جاتے ہیں تاکہ اسی نمونہ پر شمال مشرقی ہند اور دکن میں اس فیڈریشن کے ثانوی مراکز بنانے میں آسانی ہو۔

(ب) سرو راجیہ ہند کی جمہوریات ''کشمیر'' شمال مغربی پنجاب'' شمال مشرقی پنجاب'' جنوب مغربی پنجاب'' پشتانیہ' بلوچستان'' اور سندھ جن کی آبادی ۳ کروڑ ہے' لاہور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی مشترک زبان ہندوستانی اردو ہوگی۔ اور

جمہوریات بھارت' راجپوتانہ'' گجرات' آگرہ کے حلقہ میں داخل ہیں۔ ان کی مشترک زبان ہندوستانی (اردو' ہندی) ہوگی۔

(ج) اس فیڈریشن کے مراکز مقامی جمہوریتوں سے علیحدہ رکھے جائیں گے۔ ان کی حکومت کے لیے خاص قانون بنایا جائے گا۔

فیڈریشن میں حقِ نمائندگی

(۳۳)

اس فیڈریشن میں ہر ایک سروراجیہ جمہوریہ کو اس کے تناسب آبادی' اقتصادی' تمدنی اور فوجی اہمیت کے لحاظ سے حق نمائندگی دیا جائے گا۔ حکومت متوافق جمہوریات ہند اور سروراجیہ جمہوریتوں کے باہمی تعلقات معین کرنے کے لیے'' مہابھارت سروراجیہ کانگریس'' ایک خاص قانون بنائے گی۔

فیڈریشن کا کسی خاص مذہب سے عدم تعلق

(۳۴)

حکومت متوافق '' سروراجیہ جمہوریات ہند'' میں مذہب کو حکومت سے جدا کر دیا جائے گا اور اس حکومت کو نہ تو کسی خاص مذہب سے تعلق ہوگا اور نہ اسے اپنی مشتملہ جمہوریتوں کے مذاہب میں دخل ہوگا جو ان شرائط کو پورا کرتی رہیں جن پر ان کو '' م' س' پارٹی نے تسلیم کیا ہے۔

فیڈریشن اور ریاستوں کے تعلقات

(۳۵)

ایک خاص وقت تک ہندوستانی ریاستیں بھی ''حکومت متوافق جمہوریات ہند'' میں شامل ہوسکتی ہیں۔ اگر ان کے حکمران اپنی حکومت کے اختیارات اپنے ملک کی سرواجیہ پارٹی کے ہاتھ میں دے دیں۔ اور اپنے لیے فقط اتنے اختیارات پر اکتفا کریں جو اس وقت ایک قانونی حکمران کو کم از کم درجہ پر حاصل ہیں۔

سروراجیہ نظام توافق ایشیائی

(سروراجیہ ایشیاٹک فیڈریشن)

(۳۶)

م۔س۔ پارٹی یقین رکھتی ہے کہ آزاد ہندوستان میں کوئی نظام حکومت کامیاب نہیں ہوسکتا' جب تک ایشیائی اقوام عموماً اسی نظام کو منظور نہ کرلیں۔ اسی لیے م'س' پارٹی ایشیائی ممالک کا ایمپراطوری اور سرمایہ داری کے خلاف توافق پیدا کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ م'س' پارٹی اس تحریک میں مرکزی جماعت کا کام کرے گی۔

(الف) م۔س۔ پارٹی روس کو نیم ایشیائی ممالک میں شمار کر کے ایشیاٹک فیڈریشن کا ممبر تسلیم کرتی ہے۔

(ب) غیر ایشیائی پس ماندہ ممالک مصر و مراکش بھی سروراجیہ پارٹیوں کے توسط سے

جو ایمپر اطوری اور سرمایہ داری کی مخالفت میں پیدا ہوں، ایشیا ٹک فیڈ ریشن میں شامل ہو سکتے ہیں۔

(ج) جن ایشیائی ممالک میں اس وقت شاہی حکومت قائم ہے، اگر وہاں کی مخالف ایمپر اطوری و سرمایہ داری پارٹیاں برسر حکومت آ جائیں۔ تو اس حالت میں وہ بھی ایشیا ٹک فیڈ ریشن میں شامل ہو سکتی ہیں۔

ایشیائی ممالک کی قومی جمہوری پارٹیوں پر اعتماد

(۳۷)

م۔س۔(مہا بھارت سرور اجیہ) پارٹی اس مقصد کی تکمیل میں ایشیائی ممالک کی سوشلسٹ پارٹیوں پر اعتماد کرے گی (یا ایسی پارٹیوں پر جو کاشتکار، مزدور اور دماغی محنت کش صنفوں کے صنفی مفاد کی محافظ ہوں)۔

(الف) مہا بھارت سرور اجیہ کانگریس کے جو اجلاس ''ایشیا ٹک فیڈ ریشن کے لیے مخصوص ہونگے، ان میں جس طرح ان ہندوستانی پارٹیوں کے نمائندے بطور ممبر شریک ہو سکیں گے، جن سے پارٹی اشتراک عمل کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اسی طرح ایشیائی ممالک کے مخالف ایمپر اطوری و سرمایہ داری، پارٹیوں کے نمائندے بھی بطور ممبر شریک ہو سکیں گے۔

(ب) مہا بھارت سرور اجیہ کانگریس کے جو اجلاس ایشیا ٹک فیڈ ریشن کے لیے مخصوص ہونگے، ان میں یورپ و امریکہ کی سوشلسٹ پارٹیوں یا محافظ محنت کش پارٹیوں کے نمائندے بطور مشیر شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن انھیں رائے دینے کا حق نہ ہوگا۔

ایشیاٹک فیڈریشن کا ثانوی مرکز

(۳۸)

م ۔س۔ پارٹی اپنے ثانوی مرکز ''لاہور'' کو ایشیاٹک فیڈریشن کا مستقل مرکز قرار دیتی ہے۔ اگر افغانستان ''سروراجیہ ایشیاٹک فیڈریشن'' تحریک کو منظور کرے تو لاہور کا کام ایک خاص وقت تک کابل میں ہوا کرے گا۔

(الف) م۔س۔ مرکزی کمیٹی تمام ایشیائی ممالک میں اپنے ''سروراجیہ مراکز'' بنانے کے لیے جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھے گی، جس سے وہ ان ممالک کی سوشلسٹ پارٹیوں یا محافظ محنت کش پارٹیوں سے اتصال پیدا کرے گی۔

(ب) م۔س۔ مرکزی کمیٹی یورپ اور امریکہ میں سروراجیہ دفتر استخبارات (انفرمیشن بیوروز) کھولے گی۔ جس سے وہ ان ممالک کی سوشلسٹ پارٹیوں یا محافظ محنت کش پارٹیوں کی ہمدردی حاصل کرے گی۔

انٹرنیشنل ممبرشپ کیلئے اصول اساسی

(۳۹)

م۔س۔ پارٹی ایشیاٹک فیڈریشن کی باقاعدہ نمائندگی حاصل کرنے سے پہلے کسی انٹرنیشنل جماعت میں بحیثیت ممبر شریک نہ ہوگی۔

انٹرنیشنل مذہبی اجتماع کی بنیادی شرط

(۴۰)

م۔س۔ پارٹی کسی انٹرنیشنل مذہبی اجتماع مثلاً خلافت اسلامیہ کو تسلیم نہ کرے گی، جب تک اس مذہب کا رسمی مجموعہ احکام پارٹی کی انٹرنیشنل سیاست (یعنی مخالفت ایمپراطوری و سرمایہ داری) کے مخالفانہ مواد سے پاک نہ ثابت کر دیا جائے۔ فقط

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

ہندوستانی منزل	(شرح دستخط) عبیداللہ	ظفر حسن
آق سرائے استانبول	پریذیڈنٹ کانگریس	سیکرٹری کانگریس
	سروراجیہ کمیٹی کابل	سروراجیہ کمیٹی کابل
۲ میزان ۱۳۴۴ء		۱۵ ستمبر ۱۹۲۴ء

ضمیمہ

سرو راجی پروگرام کی بعض دفعات کی وضاحت

مولانا سندھیؒ کے چند خطوط

(۱)

برادر گرامی قدر سلمہ

سلام مسنون ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پروگرام آپ کو سلامت مل گیا ۔ آپ کا اسے قابل غور سمجھنا، اس کی پوری داد ہے ۔ جزاکم اللہ ۔

کامریڈ اور توارش کی بے رحمانہ تنقید سے جو تکدر پیدا ہوا تھا، رفع ہو گیا ۔ مجھے یقین ہے کہ (ڈاکٹر سیف الدین) کچلو، ظفر علی (اور) حسرت (موھانی) اسے اچھی نگاہ سے دیکھیں گے ۔ محمد علی (اور) شوکت علی ان تینوں کی تائید کے بعد مان جائیں گے ۔ جمعیۃ العلماء (ھند) پورے طور پر قبول کرے گی ۔

گذشتہ سال مختلف طور پر پروگرام کے اساسی نکتے لکھ چکا ہوں ۔ وہ نہایت خوبی

سے مانے گئے۔ خلافت کانفرنس میں "تنظیم" کا پروگرام اسی کا عکس ہے اگر آپ میرا خط اور ظفر علی خان کا امرتسر خلافت کانفرنس کا خطبہ ملا کر پڑھیں تو آپ حیران ہوں گے۔

تقسیم ہند سے ہندو ناراض ہونگے۔ آپ کی رائے یقیناً صحیح ہے، مگر افتراق کی پہل انہوں نے کی۔ سوامی شردھانند، مالوی (اور) راجہ مہندر پرتاپ علیحدہ ہو گئے۔ اس کی تفصیل پھر سناؤں گا۔ انہیں بھی سمجھا چکا ہوں، ہندو مہا سبھا (اور) سنگھٹن اسی کا نتیجہ ہے۔ ہم پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے اور ہمارے لئے کوئی چارہ کار نہیں رہا۔

سید سجاد حیدر، رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایک مہینہ استانبول میں رہے۔ میں تمام تفصیلات ان سے بھی کہہ چکا ہوں۔ وہ پوری طرح پر مؤید تھے۔ آپ دیکھیں گے۔ علی گڑھ پارٹی (اور) مسلم لیگ سب مان جائیں گے اور کوآپریٹر (اور) نان کوآپریٹر سب مل جائیں گے۔ سب سے پہلے مسئلہ تقسیم کا نظریہ میں نے کابل میں ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا۔ مولوی احمد علی کو اس کی پوری تعلیم دے کر واپس بھیجا تھا۔ ڈاکٹر اقبال (اور) فضل حسین پہلے یہ نظریہ قبول کر چکے ہیں۔

کامریڈ (این۔ایم) رائے اس تقسیم پر ناراض ہے لیکن ہمارے پروگرام میں انقلابی روح اس کے نیشنل پروگرام سے بہت زیادہ ہے۔ اس لیے مجبوراً قطعی مخالفت نہیں کرتا۔ اس کی تنقید کا جواب اور توارش کا جواب لکھ دیا تھا۔ فراغت میں اس کی نقل آپ پڑھ سکیں گے۔

پروگرام ہندوستان بھی کئی راستوں سے بھیج دیا ہے، افغانستان بھی (اور)، روس کو دیا ہے، ترکی (اور) مصری اہل الرائے بھی دیکھ چکے ہیں۔ ایرانیوں کو بھی دیا ہے۔ جاپان بھی دیکھ لے گا۔

یہاں کے روسی تائید کرتے ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس۔ مصری و ترک احباب (اور)

ماسکو سے بھی امید ہے' تائید ہو گی۔ مگر ذرا محنت اور مقابلہ کے بعد۔ جاپان بہت مسرت سے قبول کرے گا۔ افغان گورنمنٹ الٹی میٹم سمجھے گی۔ ہندوستان' دیکھیں! کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔

آپ کو خوشی ہو گی۔ لالہ لاجپت رائے خود پنجاب کو تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ مولانا محمد علی نے کہا ہے کہ "استانبول سے سہارنپور تک یا مسلم آبادی ہے یا مسلم اکثریت"۔

آپ کے خط میں یو پی میں مسلم آبادی کی نسبت تخمینہ صحیح نہیں۔ وہاں ۱۳ فیصد مسلم ہیں۔ سرور اجیہ ہند کا مرکز لاہور مسلمانوں کا ہے اور آگرہ ہندوؤں کا۔ یو پی' راجپوتانہ (اور) گجرات میں ہندو آبادی زیادہ ہے۔ اسی امتزاج سے ہندوستانیت محفوظ رہتی ہے۔

انڈین ایئر بک ۱۹۲۳ء میں صوبہ سرحدی کے حدود اربعہ لکھتے ہوئے شمال میں ہندوکش' قرہ قورم (اور) ہمالیہ لکھا ہے۔ افغانی شہزادہ کا خیال خواب میں بھی نہیں۔ مسلمانوں کی عمومی فلاح چند شخصیتوں پر قربان نہیں کی جا سکتی اور پھر روس سے اتحاد ایسی حالت میں ناممکن ہو جاتا ہے۔ مسدس کے بند تو اسی خیال چھوڑنے کے ثبوت میں نقل کیے تھے۔ آپ نے شاید اس حصہ کو معمولی طور پر پڑھا ہے۔

خدا کا نام یاد کرنے کیلئے جس قدر عبادت گاہیں ہوں' اگرچہ جہالت سے وہ لوگ مشرکانہ رسوم و بت پرستی کے مرتکب ہو رہے ہوں' میں ان پر حملہ اپنی تحقیق میں اسلام کی تعلیم کے مخالف سمجھتا ہوں۔ میں سلطان محمود غزنوی انار اللہ برہانہ' کے بعض اعمال ان کی اجتہادی خطا مانتا ہوں۔ اسلئے "رضا کار" کیلئے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ اپنی سمجھ میں اسلام کی تعلیم کے اندر ہندوستان میں مسلمانوں کو انسانیت کے بلند پایہ پہ ثابت کرنے کیلئے لکھا ہے۔

سرور اجی رضا کار مسلم جب دیکھے کہ ایک مندر کو مسلمان منہدم کر رہے ہیں تو اس

کی مدافعت میں اسے شہید ہونا چاہیے' علیٰ ہذا القیاس ایک ہندو عورت کی حفاظت کیلئے (بھی)۔ ہندوؤں کو اگر کوئی چیز ہمارے پروگرام میں دلکش نظر آئے گی تو یہی رضا کاروں کے فرائض ہونگے۔

شیدائی! میں آپ کا انٹرنیشنل سیاست میں مطالعہ پڑھ کر بہت مسرور ہوا۔ انشاء اللہ ہمارے نوجوان دنیا میں اپنا وجود عزت سے ثابت کرلیں گے۔ شیدائی! میں آپ کی طبیعت کو اپنے اوپر قیاس کر کے جلدی سمجھ سکتا ہوں۔ آپ اگر کسی کے دوست ہیں تو آپ پر بدگمانی کرنا جرم ہے۔ مسعود کے متعلق میں اس لیے واقعات آپ کو لکھتا رہتا ہوں کہ اس کی طرف سے آئندہ کسی غلط بیانی سے دوستی میں فرق نہ آئے۔

پروگرام کی کاپی اور بھیج رہا ہوں۔ مولانا برکت اللہ کی خدمت میں بھیج دیں۔ ان کی رائے کیا ہوگی؟ مگر ہمیں ان کے مطالعہ کیلئے بھیجنا ضروری ہے۔ اس پروگرام کی تمہید میں مجھے نرم لفظوں میں افغانستان سے علیحدگی کا اعلان منظور ہے اور کانگریس کمیٹی کابل کا پریذیڈنٹ بن کر میں لطافت کے ساتھ ''پروویژنل گورنمنٹ'' کے سلسلہ سے بھی اپنے آپ کو علیحدہ بتلانا چاہتا ہوں۔ اگرچہ کانگریس کمیٹی کابل کو ایک معنی میں پروویژنل گورنمنٹ کا ہم معنی لکھ دیا ہے۔ ان تصریحات کی ضرورت نہیں۔ عقلمند خود سمجھ جائیں گے۔ پروگرام کی کاپی راجہ مہندر پرتاب صاحب کو امریکہ بھیج دی ہے۔

اس کے بعد جب کبھی خط لکھوں گا' ارادہ ہے کہ ایک ایک کاپی آپ کو بھیجتا رہوں۔ والسلام۔

۲۸ جنوری ۱۹۲۵ء — عبیداللہ

ظفر حسن ناراض نہیں۔ اس کا ایک خط آپ کو نہیں ملا۔ دوسرا اس سے پہلے مل چکا ہوگا۔ چندروز ذرا کفایت شعاری بھی پیش نظر تھی۔ والسلام۔

(۴)

محترمی!

سلام مسنون۔ کل آپ کے خط کا جواب لکھا۔ آج ایک خیال آیا۔ آپ کے جواب سے پہلے آپ کو لکھ دیتا ہوں۔ اگرچہ آپ کے مفصل خیالات سننے کے بعد زیادہ موزوں ہوتا۔ مگر چونکہ یہ کام میرا شخصی نہیں اور آپ اصولاً اسے زیادہ غلط نہیں دیکھتے۔ ساری تفصیلات وفروع ایک مسودہ کا حکم رکھتے ہیں۔ خیال مکمل سامنے آجائے' اس لیے سب کچھ لکھ ڈالا۔

آپ نے روما میں مستقل کام (کا) ارادہ کرلیا ہے اور برلن و پیرس میں بھی آتے جاتے رہیں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس کا لحاظ بھی ساتھ ہی رکھیں کہ روما' برلن (اور) پیرس میں سرورا جی انفرمیشن بیورو کھول سکیں۔

میرا جہاں تک تجربہ ہے میں اسے نہیں مانتا کہ ایک سمجھدار تعلیم یافتہ نوجوان ہندوستانی مسلمان محض اشاعت اسلام میں اپنی زندگی وقف کرسکتا ہے۔ جب تک اسے ایک سیاسی پروگرام بھی ساتھ ہی نہ سمجھا دیا جائے اور وہ اس پر مطمئن نہ ہولے۔

میں نے اس پروگرام میں اسلام کی انقلابی اسپرٹ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور میں بحیثیت ایک ہندوستانی مسلم انقلابی کے اسے شرق میں منوانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ آثار ایسے ہیں جس سے کامیابی کی توقع ہوسکتی ہے۔ میں نے لاہور کو ایشیاٹک فیڈریشن کا سنٹر پورے غور اور سمجھ کے بعد مقرر کیا ہے ورنہ میری شیفتگی دہلی کے سوا اور کوئی نام نہ لینے دیتی......

میں اسے اپنے نام سے شائع نہ کرتا تو اندرون ہند کام میں بہت آسانی ہوتی مگر آپ جانتے ہیں کہ اس صورت میں بیرونی کام میرے لیے مشکل ہو جاتا' پروگرام کے اصول لے لیں' اور اپنے طرز سے اپنے ہاں رائج کریں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ حقیقی

مسلمان اس تحریک کے مالک رہیں گے۔

جہاں ایک شہر میں اشاعت اسلام کا مرکز ہوگا اگر وہیں سروراجی مرکز بھی بن سکا تو ان کا آپس میں اتحاد ہوگا اور نہایت خوبی سے ایک دوسرے کی معاونت کر سکیں گے۔ اگر اس طرح متحد کام کی بنیاد پڑ جائے تو میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ جب تک نیشنل کانگریس بیرونی کام کا فیصلہ کرے اس سے پہلے ہم دنیا کے اہم مراکز پر قبضہ کر چکے ہوں گے اور انقلاب کے بعد ہماری پوزیشن ہند میں کمزور نہیں ہوگی۔

خیال کا دوسرا حصہ: میں یہاں کبھی کبھی اہل علم سے ملتا ہوں۔ بعض مضامین بھی دوسروں کے نام سے شائع کرائے۔ مسلمانوں میں اشاعت اسلام آپ جانتے ہیں میرا خاص کام رہا ہے اس سے مجھے از حد دلچسپی ہے۔ استانبول دنیا کا ایک مرکز ہے۔ میرا جی چاہتا ہے یہاں سے اشاعت قرآن کا مستقل سلسلہ قائم ہو جائے۔ اس کے متعلق میں نے بعض اہل الرائے (اور) اہل العلم سے تذکرہ شروع کر دیا ہے۔ قرآن کا ترجمہ تمام اسلامی زبانوں میں ایک محقق مستند جماعت اہل علم کی طرف سے شائع ہو۔ یہ مقصد ہوگا۔ چونکہ استانبول میں ابھی اتنی جان ہے کہ یہاں قرآن کو اس کی اصلی سیاست سے معرا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کیلئے یہ کام مبارک ہوگا............

آج اجمالی طور پر اپنا خیال لکھ رہا ہوں۔ آپ اسے صحیح معنی میں سمجھیں گے اور اپنے خیال سے مطلع کریں گے۔ اس بات کی سخت تاکید سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے تمام خطوط پڑھ کر فوراً جلا دیے جائیں۔ والسلام

میں نے آج آپ کو برادر گرامی قدر مثل سابق نہیں لکھا۔ وہ جملہ میں ذرا تکلف سے لکھا کرتا تھا۔ اس لیے اسے حذف کر دیا۔ امید ہے آپ اس تغیر کو پسند کریں گے۔

والسلام

۲۹۔ جنوری ۱۹۲۵ء　　　　عبید اللہ

(۳)

مکرمی المحترم!

سلام مسنون۔اس سے پہلے ایک خط لکھ چکا ہوں جس میں ''پیام مشرق'' بھیجنے کا شکریہ وممنونیت اور خط نہ لکھنے کی معذرت پر اکتفا کیا تھا۔

سنتا ہوں کہ افغانی سیاسی حلقوں میں پروگرام کے مطابق ایک غلط فہمی پھیل رہی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے افغانستان کو تقسیم کر دیا ہے اس پر آج چند کلمات لکھتا ہوں۔ آپ ہمارے بزرگوں کو مطمئن کر سکیں گے۔

صفحہ ۲۷۔غلط فہمی اس سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم نے سرور اجیہ ہند کی تحدید میں شمالی حد ہمالیہ' قراقورم' ہندوکش مقرر کی ہے۔ ہندوکش چونکہ افغانستان کا ایک مشہور پہاڑ ہے۔ فوراً خیال پیدا ہوجاتا ہے کہ افغانستان کا کوئی حصہ ہم نے سرور اجیہ ہند میں لے لیا ہے۔

لیکن حقیقت میں ہندوکش صوبہ سرحدی کے شمال میں بھی آتا ہے اور چترال کے شمال مشرق میں کشمیر کی سرحد پر ہمالیہ قراقورم سے ملتا ہے۔انڈین ائیر بک **(Indian year Book)** کی عبارتیں حاشیہ میں نقل کراتا ہوں۔ (1)

صوبہ سرحد کے متعلق افغان ناراض ہو سکتے ہیں۔مگر اس صوبہ کے متعلق جو مباحث آج کل ہندوستان کے سرکاری اور قومی حلقوں میں ہو رہے ہیں۔اس سے غالباً انہیں واقف ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

صوبہ سرحدی کے متعلق اس حقیقت نفس الامری سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اس کی اکثریت افغان آبادی ہے اور وہ پشتو بولتی ہے اور انگریزوں نے یہ صوبہ سکھوں کو شکست دے کر حاصل کیا ہے۔

پچھلے سالوں میں اسمبلی کا کمیشن اس پر غور کر چکا ہے کہ اسے پنجاب سے ملا دینا چاہیے۔ گورنمنٹ کے ممبروں کی رائے اس کے خلاف تھی اور یہی فیصلہ قائم رہا' مگر نیشنل ممبروں (یا ہندو ممبروں) نے اس کے خلاف رپورٹ لکھی۔

کوکناڈا[۲] کانگریس میں ایک پشاوری ہندو لیڈر کی تجویز پر کانگریس نے اس کا الحاق پنجاب سے منظور کر لیا' اگرچہ پریذیڈنٹ کی خواہش تھی کہ اس مسئلہ پر بحث ملتوی کر دی جائے۔ اس میں کانگریس کے لئے آسانی اس طرح پیدا ہو گئی کہ کانگریس نے پہلے تقسیم صوبہ جات میں اس صوبہ کی زبان مقرر نہیں کی تھی۔

آپ خوب جانتے ہیں کہ سرحدی افغان پشتو پر کس قدر فدائیت ظاہر کرتا ہے' اس لئے ہم نے اس صوبہ کا نام اس کی زبان پر بدل دیا[۳] اور ہم کانگریس کے الحاق پنجاب کی پالیسی سے انکار کرتے ہیں۔

ہم نے صوبہ سرحدی کو ہندوستان کا جز ولاینفک نہیں بنایا کیونکہ سرو راجیہ ہند کی تمام جمہوریتوں کو جس میں پشتانیہ بھی ایک ہے' سیاسی (و) تمدنی آزادی کا حق دیتے ہیں۔

اگر افغان اس لیے بُرا مناتے ہیں کہ ہم نے صوبہ سرحد میں جمہوریت کا پروگرام کیوں پیش کیا' تو اس کا ہم کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ موجودہ صورت میں سرحدی صوبہ ہندوستان کی آزادی میں رکاوٹ ہے اور ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اسے ہندوستان کے مسلم حصہ کیلئے مفید طور پر کام کرنے والا صوبہ بنا دیں۔

جب تک افغانستان اس کی آزادی کیلئے سیدھی (براہ راست) کوئی کوشش نہیں کرتا' اس وقت تک ہم کو خاموش نہیں رہنا چاہیے۔

صفحہ ۲۷۔ موجودہ سلطنت افغانستان کو ہم نے سرو راجیہ ہند کے مغرب میں لکھا

ہے اور اس کے مقبوضہ حصص کا احترام ملحوظ رکھتے رہے۔

صفحہ ۱۵۔ تمہید میں جہاں ہمیں ہندوستان و روس کا اتصال دکھلانا تھا اس میں بھی ہم نے قرہ قورم' ہمالیہ' ہندوکش کے مقام اتصال یعنی چترال اور کشمیر کی مشترک حدود سے چند قدم (ایک باریک خط افغانی جو پامیر اور چترال میں حائل ہے) آگے روس کا ذکر کیا ہے۔

صفحہ ۴۷۔ لاہور میں جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں' اگر افغانستان منظور کر لے تو ہم کابل اس کیلئے موزوں خیال کرتے ہیں' مگر اسکے لئے افغانستان کی رضامندی شرط ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ پروگرام کے ان حصص کو پھر مطالعہ کر کے ہماری وکالت کر سکیں گے۔ والسلام

عبیداللہ

۲۲' جون ۱۹۲۵ء

(1)"To the North it (N.W.F.Province) extends to the Mountains c Hindu Kush". (Indian Year Book, 1923, P.110)

(۲) کوکناڈا میں کانگریس کا اجلاس مولانا محمد علی کی صدارت میں ۲۳ء میں ہوا تھا۔

(۳) مولانا سندھی نے صوبہ سرحدی کا نام ''پشتانیہ یا پشتونیہ'' تجویز کیا تھا۔

(۴)

مکرمی سلمہ اللہ!

سلام مسنون۔ آپ کا دوسرا خط پہنچا۔ جس وقت سے آپ نے پروگرام کا مطالعہ کیا وہ میری محنت کا پورا معاوضہ ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں سے ایک تعلیم یافتہ نوجوان مستقل کام کرنے والا اور پھر عزیز اور بھائی جب کام میں ہم خیال ہو جائے تو اس مسرت کا کاغذ پر اظہار نہیں ہوسکتا......

یو پی کی شہری آبادی میں مسلمانوں کی نسبت ۳۰ فیصد ہے اور تمام آبادی میں ۱۳-۱۴ فیصد سے زیادہ نہیں۔ یہ اعداد علی گڑھ پارٹی اور لکھنؤ کانگریس کی رپورٹوں سے یاد ہیں۔

سارے ہند کی مکمل اسکیم لکھنے سے ہم شردھانند پارٹی پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتے۔ اس وقت ہمیں جرأت سے علیحدہ فیصلہ کر کے اس پر عمل کرنا چاہیے۔ فقط یہی ایک طریق ہے، جس سے مسلمانوں کی بیرونی شکست سے جو جرأت ان لوگوں میں پیدا ہوئی ہے اسے دبا سکتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ روس سے مل کر کام کرنے کا اعلان ہو۔ ہندو سرمایہ داری کو بچانے کیلئے ساری چالیں چلیں گے۔ انگریزوں سے ملیں گے۔ ہمیں اس سے بالکل نہیں گھبرانا چاہیے۔ موجودہ لیڈر اس ہمت کے نظر آتے (ہیں)۔ عموماً علی گڑھ (اور) دیوبند کے لوگوں کو میجارٹی (Majority) حاصل نہ ہونے سے وہ اعلیٰ ہمتی پیدا نہیں ہوسکتی جو اُسی خطہ کا مسلمان طبعی طور پر دکھلا سکتا، جہاں عموم آبادی مسلمانوں کی ہو۔

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت ہند میں میرے لیے ذاتی فائدہ کی کیا توقع ہوسکتی ہے؟ مگر مسلمانوں کا اس طرح دریا کی رو میں بہہ جانا طبیعت برداشت نہیں کرتی......

نوجوانوں کو چند اصول بتا دیے جائیں جو قرآن شریف اور سنت صحیحہ میں ثابت ہیں۔ مثلاً ربا قطعی طور پر ممنوع ہے۔ ایسے بینک جاری کرنا اور اس قسم کی شرکتیں معاملات میں پیدا کرنا

ہر ایک مسلمان کیلئے ضروری ہے اور موجودہ ترقی کے زمانہ میں' جہاں سود لینا جائز ہو' یہ امر بجز اشتراکین کے نظریات کے اور کہیں نہیں ملتا۔

زمین کے متعلق فاروق اعظم کا اجماعی فیصلہ ہے جو انہوں نے ایران کی مفتوحہ زمین کے متعلق سال بھر کے مشورہ کے بعد سورہ حشر کی آیت سے استنباط کر کے صادر کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں میں اس فیصلہ کی بہت لنبی (لمبی) تفصیل ملتی ہے۔ ازالتہ الخفا اور قرۃ العینین (میں)۔

ربا کی تحریم کیلئے جو مصلحتیں شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں بتاتے ہیں' اس ذیل میں سرمایہ داری اور ایمپر اطوری کی تمام خرابیاں وضاحت سے لکھ کر فرماتے ہیں کہ اسلام کا قصد ہے کہ یہ کسرویت اور قیصریت دنیا سے ناس کر دی جائے۔

احادیث صحیحہ میں مزارعت کی ممانعت موجود ہے مگر اکثر اہل علم اس کی تاویلیں کر لیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ ان کو بلا تاویل مانتے ہیں۔ ان مثالوں سے میرا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ مبلغین اسلام اگر ان مسائل پر محققانہ نظر رکھتے ہیں اور اسلام کی یہ اسپرٹ نمایاں کر سکیں تو انہیں اپنے مطلب میں زیادہ کامیابی ہو گی۔

عبدالرحمان استانبول میں رہتے ہیں۔ ہفتہ عشرہ میں ملنے آیا کرتے ہیں۔ میں نے شروع سے جس طرح پروگرام بنانے میں تدریجی ارتقا طے کیا' ہمیشہ انہیں ساتھ ساتھ با خبر کرتا رہا۔ اس وقت پروگرام انہوں نے پسند کر لیا ہے' مگر کچھ عرصہ تک وہ کوئی عملی کام نہیں کریں گے۔ عبدالرحمان کو آپ کے الفاظ سنا دیئے وہ مسرور ہوئے۔

یہاں کی علمی کیفیتیں پھر کسی وقت لکھوں گا۔ ظفر حسن اور عزیز احمد سلام کہتے ہیں۔ والسلام

۱۶۔ جنوری ۱۹۲۵ء عبیداللہ

مقالہ نمبر ۳

انڈین نیشنل کانگریس اور انڈین مسلم لیگ

۷/اگست ۱۹۳۸ء

بلد اللہ الحرام۔ جبال الصولتیہ

پس منظر

[حضرت مولانا سندھیؒ ابھی مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے' اور ہندوستان کے سیاسی' معاشی مسائل آپ کے زیرِ غور رہتے تھے۔ تحریکاتِ آزادی میں کام کرنے والی مختلف جماعتوں کے تاریخی کردار کا گہرا مطالعہ آپ کی زندگی کا ایک اہم حصہ تھا۔ خود آپ نے پورے تسلسل کے ساتھ ایک طویل عرصہ تک جدوجہد آزادی میں بھرپور کردار ادا کیا تھا۔

ہندوستان آمد سے پہلے آپ نے مناسب جانا کہ ایک دفعہ اس صدی کے ابتدائی چار عشروں کی سیاست کا تجزیہ رقم کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے ہندوستان کی آزادی کے حوالے سے کام کرنے والی مختلف جماعتوں کے کردار اور ان کے نتائج کا ایک بھرپور جائزہ لیا۔ زیرِ نظر مضمون میں آپؒ نے انتہائی جامعیت کے ساتھ اس صدی کے ابتدائی چار عشروں کی سیاسی تاریخ بیان کر دی ہے۔ اور واضح کر دیا ہے کہ دیوبند کی حریت کیمش سیاسی پارٹی کا بنیادی رُخ کیا ہے۔ اور قومی کردار کے حوالے سے اس کی ذمہ داری کیا ہے۔ ایسی ذمہ داری جو قوم اور ملک کا اساسی تقاضہ ہے۔

مولانا کا یہ مضمون اس سے قبل غیر مطبوعہ تھا۔ ہمیں مولانا سندھیؒ کے اپنے قلم سے تحریر کردہ یہ مضمون مولانا عزیز اللہ جروار سے دستیاب ہوا ہے۔ ہم ان کے شکریہ کے ساتھ مولانا کے مقالات کے مجموعہ میں شامل کر رہے ہیں۔ آزاد]

انڈین نیشنل کانگریس اور انڈین مسلم لیگ

ہندوستانی قوم کے اس حصہ کو چھوڑ کر جو کامل آزادی کے تخیل سے نیچے ٹھہرنا پسند نہیں کرتے، اکثر آبادی برٹش گورنمنٹ سے اشتراکِ عمل کی حامی ہے۔

کامل آزادی کا صحیح تخیل رکھنے والے ہندوستانی ابتداء میں محض مسلمانوں کی ایک جماعت ہے، جو مجاہدین آزادی اور استقلال کے متبع ہے۔ وہ شہادت یا آزادی کے درمیان کوئی مرتبہ تجویز نہیں کرتی۔ جہادِ استقلال میں شکست کھانے پر ان میں سے بقیۃ السیف پھر مناسب وقت کے پروگرام پر تیاری میں مصروف رہتی ہیں۔ اس سعی کو جاری رکھنے کیلئے اگر انہیں گورنمنٹ سے وفاداری کے اقرار و اظہار کی ضرورت ہوتی ہے تو اپنی جماعت کے مرکزی فیصلہ کے موافق اضطراری حالت کے احکام شرعیہ پر قیاس کر کے وفاداری کا فتوی دیتے ہیں۔ ان کا کام عام طور پر پریس میں نہیں آتا۔

دراصل اس جماعت کے دو مرکز تھے۔(۱) دہلی۔(۲) عظیم آباد۔ دہلی سے دیوبند پیدا ہوا اور عظیم آبادی یاغستان میں پہنچے اس حرب عمومی (جنگِ عظیم اوّل) میں جب دیوبندی کابل پہنچے تو سب مل گئے اس میں ہندو آزادی پسند بھی افغان گورنمنٹ کی اجازت سے شامل ہو گئے۔ صرف کابل اس جماعت کا ایک مستقل مرکز بن گیا۔ یہ لوگ اصل میں کابل کو ہندوستان اور دہلی کا مرکزِ ثانوی مانتے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد ہندو سوسائٹی میں یوروپین تعلیم پھیلنے پر اپنی قومی ہستی کا احساس غالب آیا۔ اور نوجوان ہندو میں کامل آزادی کا ذہن اور نظریہ پیدا ہوا۔

ان لوگوں کی سیاسی تربیت انڈین نیشنل کانگریس میں ہوئی۔ بنگال و مہاراشٹر کے تجربہ کار استاد ان کے رہنما تھے۔ ان کا اثر یوپی۔ مدراس اور پنجاب میں بھی پھیلا اور

کانگریس میں ایکسٹری مسٹ پارٹی پیدا ہوئی ہے۔ تقسیم بنگال کو منسوخ کرانے میں اس جماعت نے کافی جہاد کیا۔ اور کامیاب ہوئی۔ گورنمنٹ نے ہندوستان کو اصلاحات دینے کا فیصلہ کیا' یہ تمام تر کانگریس کے اس تیز رو گروپ کی محنت کا نتیجہ تھا۔

اس موقعہ پر گورنمنٹ برطانیہ سے وفاداری کا عہد کرنے والے ہندوستانی مسلمان جن کا مرکز علی گڑھ کالج تھا۔ (جیسا کہ ہندوستانی مسلمان جہاد پسند کا مرکز دارالعلوم دیوبند رہا ہے) آگے بڑھا اور اصلاحات میں مسلمانوں کا حق ہندوؤں کے برابر ہونے کا دعویدار بنا۔

علی گڑھ پارٹی پہلے وائسرائے کے پاس وفد لے گئی۔ اور پھر اس وفد کو انڈین مسلم لیگ کی شکل میں منظّم کر لیا' انگریز مسلم لیگ کو نیشنل کانگریس کے مساوی تو کیا مانتے۔ انہوں نے ایکسٹری مسٹ کانگریس مین کے خلاف برٹش گورنمنٹ کی تائید کا ایک محاذ بنالیا۔ اور اس کی قوت کو آزادی (کے حصول) کو کمزور کرنے میں استعمال کیا۔

ترکی گورنمنٹ مسلمانوں کی مذہبی مرکز کی نمائندہ تھی۔ نوجوان ترک جرمن سے دوستی کرتے ہیں اور اتحاد اسلام کا پروپیگنڈا ہندوستانی مسلمان' انگلستان کے مرکز سے پھیلاتے ہیں۔ اس سے مسلم لیگ میں بھی انگریزوں سے متنفر گروپ پیدا ہو گیا۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کا نیا حصہ ہے جو آزادی و استقلال کا حامی ہے۔ اس کا مرکز پہلے علی گڑھ (جامعہ ملّیہ) رہا۔ بعد میں دہلی منتقل ہو گیا۔ یہاں پر دیوبند پارٹی (یعنی پرانے مسلمان آزادی و استقلال پسند مجاہدین و شہداء کی پسماندہ یادگاریں) اس نوجوان پارٹی سے مل کر خاص آزادی پسند مسلمانوں کی ایک تنظیم بناتی ہے۔

اس کا تعلق بظاہر ترکی و خلافت سے زیادہ ہے' یہ نوجوان مسلم کی ذہنیت کا اثر تھا جو سب پر غالب آیا' ورنہ اصلی دیوبند پارٹی سوائے آزادئ ہند کے اور کوئی مقصد نہیں رکھتی۔

وہ اپنے مقصد پورا کرنے کے لئے اپنے وسائل میں رہتے ہوئے ترکی سے ایک قسم کا تعلق ہمیشہ رکھتے ہیں۔ مگر اپنی مرکزی طاقت کسی حالت میں ترکوں کے سپرد کرنے کی قائل نہیں۔

دیوبندی پارٹی کابل گورنمنٹ سرحدی افغانی اقوام کو اپنی ہندوستانی تحریک کا مرکز ثانوی مانتی ہے۔

ترکی کی شکست پر ہندوستان میں مسلمانوں پر بہت گہرا اثر آیا۔ ان کے کابل کے مرکز نے اپنی تحریک کو ختم نہیں کیا۔ بلکہ دیوبند پارٹی کے توسط سے افغانستان کی ایک چھوٹی سی لڑائی انگریزی حکومت سے ہوگئی' اس کے خاتمہ پر ہندوستانی مسلمان میں' دہلی کے مرکز سے ایک طوفان پیدا کر دیا۔ کانگریس کا تیز رو حصہ اس سے متحد ہو گیا۔ یہاں خالص ہندوستانی آزادی پسند جماعت پہلی دفعہ نمودار ہوئی' جو اس سے پہلے کابل میں جمع ہو چکے تھے۔

کچھ مدت' امید و بیم میں گذری۔ ترکی میں نئی جمہوریت نے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ نوجوان ہندوستانی مسلمانوں کا حصہ افسردہ ہو گیا۔ اس میں آزادئ ہند کا خیال مستحکم نہیں ہوا تھا۔ نہ اسے کوئی پروگرام ایسا سمجھ میں آتا ہے جس سے اکثریت کے غلبہ سے محفوظ رہ سکے۔

اس کے برخلاف ہندوستانی مسلمانوں کا جہاد پسند طبقہ یا دیوبند پارٹی تحریک آزادی کو مسلسل چلانے کیلئے جدوجہد کرتی رہی۔ اپنے نوجوان حصہ کو مطمئن کرنے کیلئے پروگرام (سرور اجیہ پروگرام ۱۹۲۴ء آزاد) بھی تجویز کر دیا جسے علی گڑھ کی پرانی ذہنیت ہضم نہیں کر سکی۔ اس لئے اس میں ارتجاعی حرکت (Riactionry) پیدا ہوئی۔

دیوبند پارٹی کے رہنما حکیم اجمل خان۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولانا کفایت اللہ۔ مولانا حسین احمد جو حضرت مولانا شیخ الہندؒ سے انتساب رکھتے ہیں۔ کانگریس میں شامل

رہے۔ ارتجاع روکنے کی پوری کوشش کرتے رہے۔ بالآخر نیا اصلاحی دور آیا' اس وقت مسلمانوں کا اکثر حصہ کانگریس سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ دیوبندی پارٹی کی مرکزی جماعت اور اسکی اول درجہ پر اتباع کرنے والے ساتھی جو مسلمانوں میں ایک اقلیت کا درجہ رکھتے ہیں کانگریس میں رہے۔

.اصلاح کی تنفیذ (انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء) شروع ہوئی۔ ہندوستان کے ۱۱۔صوبوں میں سے سات پر کانگریس حاکم ہوگئی' بنگال۔آسام۔ پنجاب۔سندھ پر مخلوط حکومت قائم ہوئی۔جس میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ بالتدریج یہ حکومتیں مسلم لیگ میں برائے نام شامل ہونے لگیں۔

مسلمان عام طور پر معترض ہیں۔کہ کانگریسی صوبوں میں ہندومہاسبھا کے لوگ اپنا پروگرام چلا رہے ہیں۔مسلمانوں کے قومی' مذہبی' سیاسی وجود کے پورے مخالف ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنا چاہیئے۔

جہاں تک ہماری سمجھ اور سیاسی واقفیت مدد دے سکتی ہے۔ہم اس اعتراض کو صحیح مانتے ہیں۔اوران صوبوں کے کانگریس اور ہندومہاسبھا کا اتحاد ایک امر واقعہ تسلیم کرتے ہیں۔

لیکن ہمارے پاس اس کو رد کرنے کی کوئی طاقت نہیں۔ برٹش گورنمنٹ اس معاملہ میں مسلمانوں کی مدد کرے گی نہ مسلمانوں کی اقلیت کانگریس یا ہندومہاسبھا کو مجبور کر سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہونا چاہیے تھا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی کثرت ہے جیسے پنجاب و بنگال' یہاں پر مسلمانوں کا کانگریس کے صوبہ وار نظام پر قبضہ ہونا چاہیئے تھا۔اوران صوبوں میں مسلم لیگ اور کانگریس اس طرح متحد ہو جاتے۔ جیسے ہندوسبھا اور کانگریس ۱۱۔صوبوں میں متحد ہو سکتے ہیں۔(اور سات صوبوں میں متحد ہو چکے ہیں۔)

ہمارا خیال ہے کہ صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ میں ہمارے تخیل کا نمونہ موجود ہو جائے۔ مگر علی گڑھ پارٹی کے قلب میں انگریزوں کی وفاداری اور ہندوؤں سے نفرت اور ساتھ ہی ہندوستان میں علیگڑھ پارٹی کی ڈیکٹیٹر شپ (یعنی انگریزوں کی امداد سے) اس قدر گہرا اثر پیدا کر چکے ہیں۔ کہ وہ ہندوستان میں اپنا استقلالی وجود اور اس کا تخیل فنا کر چکے ہیں۔ اور اس کا ظاہری سبب یہ ہے۔ کہ وہ اپنے مرکز میں ہندو اکثریت کا مقابلہ نہیں کر سکتے 'اسلئے اسے یو۔ پی میں اپنی مرکزی قوت بحال رکھنے کیلئے ہمیشہ برٹش طاقت کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

یہ حالت نوجوان ہندوستانی مسلم کیلئے جذام وتپ دق ہے' جس سے بہت جلد اسے شفا حاصل کرنی چاہیئے۔ بلکہ مسلمانوں کو اس ناپاک مرکز سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک جہاد کرنا پڑے گا۔

آج کل ہندوستانی مسلمان کی آزادی پسند جماعت اشتر کی خیالات کا میلان رکھتی ہے۔ اور چونکہ امام ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ اس کی تائید کرتا ہے۔ جو آزادی پسند مسلمانان ہند کا پہلا باپ ہے اس لئے وہ امام ولی اللہ کی اشتراکیت کو اپنے اسلام کا مخالف نہیں مانتے اور کانگریس کا سوشلسٹ گروپ اس کی تائید کرتا ہے۔ مسلم لیگ آج کل اس اشتراکی مسلمان کے فنا کرنے کیلئے جہاد کر رہی ہے۔ اور تمام ارتجاعی طاقتیں اس کی مدد کر رہی ہیں۔ اگر خدا کو منظور ہے تو امام ولی اللہؒ کے اَتباع غالب ومنصور ہونگے۔ مسلمانوں کی اس آزادی پسند جماعت کا قریبی امام مولانا محمد قاسم دیوبندی ہیں۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ' ۱۱۔ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ

۷ اگست ۹۳۸ ہندی

عبیداللہ السندی الدیوبندی' بلداللہ الحرام۔ جبال الصولتیہ

مقالہ نمبر ۴

سندھ ساگر پارٹی کے اصول

اور پروگرام کا مسودہ

۱۴ نومبر ۱۹۳۸ء

مکہ مکرمہ

پس منظر

[حضرت سندھیؒ مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران ہندوستان میں سیاسی کام اور دین کے غلبہ کے حوالے سے مسلسل غور وفکر کرتے رہے تھے'اس حوالے سے ''جمعیۃ الانصار'' کی 'قائمقام ''جمعیۃ العلماء ھند'' کو کس نہج پر مستقبل میں کام کرنا چاہیئے۔ مولانا سندھیؒ نے برسوں اس پر غور وفکر کر کے امام ولی اللہ دہلویؒ کی فلاسفی کی روشنی میں ایک مفصل پروگرام تشکیل دیا۔ اور ہندوستان آنے سے تقریباً ۵ ماہ قبل اسے تحریری طور پر قلمبند فرمایا۔ چنانچہ خطبہء جمعیۃ العلماء سندھ (محررہ اکتوبر ۱۹۳۹ء) میں تحریر فرماتے ہیں:

"حضرات! میرا فرض ہے کہ جمعیۃ علماء سندھ کو نیشنل کانگریس کے اندر عدم تشدد کی پابندی سے کامل آزادی حاصل کرنے کیلئے پروگرام بنانے میں مدد دوں'میں اس سے کبھی غافل نہیں ہوا'جس قدر سوچ سکتا ہوں'بطور مشورہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

گذشتہ رمضان کے ہفتہ اخیرہ (۱۴ نومبر ۱۹۳۸ء) کا واقعہ ہے' جب میں مکہ معظّمہ میں مقیم تھا' اور واپسیٔ وطن کی تیاری کر رہا تھا' آپ کو مشورہ دینے کیلئے میں نے اس وقت پارٹی پروگرام کا مسودہ تیار کیا' اور اس کی ایک نقل بذریعہ ڈاک اپنے پہنچنے سے پہلے جامعہ ملّیہ دہلی میں بھیج دی تھی' وہ جامعہ میں محفوظ ہے' جب ضرورت ہوگی' وہ مفصل پروگرام

آپ کے سامنے پیش کردوں گا۔"

حضرت سندھیؒ نے اس پیراگراف میں پروگرام کے جس مسودہ کا تذکرہ کیا ہے وہ یہی مسودہ ہے جو نذرِ قارئین کیا جارہا ہے۔ اس مسودہ کے مضامین کا خلاصہ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے خطبہء جمعیۃ العلماء سندھ میں آ گیا ہے۔ اور اس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ "جب ضرورت ہوگی، وہ مفصل پروگرام آپ کے سامنے پیش کردونگا"

چنانچہ ۱۰۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو آپ نے "جمنا' نربدا' سندھ ساگر پارٹی کا اساسی پروگرام" کے عنوان سے مفصل تحریر لکھی، جو آئندہ اپنی جگہ پر آرہی ہے۔ آزاد]

سندھ ساگر پارٹی کے اصول اور پروگرام کا مسودہ

عبیداللہ السندھی　　　　　　۲۲ رمضان ۱۳۵۷ھ / ۱۴ نومبر ۱۹۳۸ ہندی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والعاقبة للمتقین وصلی اللہ علی سیدنا محمد و آلہ وصحبہ وبارک وسلم ' امابعد:۔

یہ چند اصول ہیں جو کہ ایک ہندوستانی مسافر مستقبلِ ہند کے متعلق ارضِ حرم میں بیٹھ کر تجویز کرتا ہے حسبنا اللہ ونعم الوکیل.

(۱) ہماری تمام کوششوں کا مرجع یہ ہے کہ ہم اپنے وطن میں اعلیٰ اصول ترقی پر ایک نیشنل پارٹی قائم کرنے کا راستہ صاف کریں۔

(الف) اس پارٹی کا نام ''سندھ ساگر پارٹی'' ہوگا۔

(ب) اس پارٹی کا میدان عمل نارتھ ویسٹرن انڈیا ہے، جس کی مشرقی اور جنوبی حد اُس خط سے متعین ہوتی (ہے)، جو جھیل مانسرور سے شروع ہو کر الہ آباد سے گذرتا ہوا نربدا سے جا ملتا ہے اور اسی کے متوازی بحر عرب پر ختم ہوتا ہے۔

تشریح: یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دریائے سندھ مانسرور سے نکلتا ہے اور بحر عرب میں گرتا ہے۔

(۲) اس پارٹی کے میدان عمل کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(الف) پہلا حصہ آج کا صوبہ سندھ ہے، جس کا دارالصدر کراچی (جو تاریخی شہر دیبل کا دوسرا نام ہے) اس پارٹی کا مرکز ہوگا۔

(ب) دوسرا حصہ وہ ممالک ہیں جن کے سرچشموں کا پانی دریائے سندھ میں آتا ہے، ہزار سال پہلے یہ سارا علاقہ کشمیر و کابل و غزنی سمیت سندھ کہلاتا تھا جس کا ثبوت عربی تاریخوں میں ملتا ہے۔ ہم لاہور کو اس حصہ کا مرکز مانتے ہیں۔

(ج) تیسرا حصہ وہ متصلہ ممالک ہیں جن کا سندھ ساگر میں شامل رہنا اہم سیاسی مصالح کے اعتبار سے ضروری ہے۔ اس حصہ کا مرکز دہلی ہے۔ دہلی تمام سندھ ساگر کیلئے انٹرنیشنل مرکز ہوگا۔

تشریح: پارٹی کا سیاسی حلقہ مشرق کی طرف جمنا اور راجستھان پر ختم ہوتا ہے، مانسرور، نربدا خطہء دہلی کیلئے اُردو کے لسانی حلقہ کا تعین کرتا ہے۔

(۳) اس پارٹی کی تشکیل اقتصادی اصول پر ہوگی۔ متوسط درجہ کے ترقی یافتہ انسان کی ضروریاتِ زندگی کے معیار پر اپنے سیاسی حلقہ اثر کے ہر فرد کیلئے اس کی ضروریات مہیا کرنا پارٹی کا اہم مقصد ہے۔

(الف) پارٹی، قوموں کی سیاسی نمائندگی کیلئے ان کی تقسیم صنعتی اقتصادی اصول پر کرے گی۔ مشترک المفاد اصناف (مشترکہ مفاد والے تمام طبقوں) کے حلقے علیحدہ علیحدہ بنائے جائیں گے مثلاً

(۱) سرمایہ دار (۲) کاریگر (۳) زمیندار (۴) کاشتکار

(ب) سیاسی نظام ایسا منضبط کر دیا جائے گا کہ ایک حلقہ دوسرے حلقہ پر تعدی (ظلم) نہیں کر سکے گا۔ پارٹی تمام اصناف کے (طبقات) مفاد کی حفاظت کرے گی۔

(۴) سندھ ساگر پارٹی ہر ایک مذہب کو پوری آزادی دیتی ہے اور ہر ایک مذہب کے مقدسات کا احترام کرتی ہے۔

(الف) پارٹی ہر ایک مذہب کی نمائندگی اس مذہب کے اصلاح پسند ترقی کن فرقہ کے لئے تسلیم کرے گی۔

(ب) متصادم رسوم مذاہب کے حدود مقرر کرنے کا حق اس کانفرنس کو حاصل ہوگا۔ جو تسلیم شدہ مذہبی فرقوں کے اشتراک سے منعقد ہوگی اگر وہ کانفرنس فیصلہ نہ کر سکے تو سندھ ساگر پارٹی کی مرکزی جماعت نیشنل کانگریس کا فیصلہ واجب التسلیم ہوگا۔

(۵) سندھ ساگر پارٹی حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی کے ہندوستانی فلسفہ کو اپنا عقلی اساسی اصول قرار دیتی ہے' پارٹی کی مرکزی جماعت کی تشکیل اسی ذہنیت کے ممبروں سے ہوگی یعنی مختلف ذہنیات کے متشککین کو اس کی مرکزی مجلس میں شرکت کا حق نہیں دیا جائیگا۔

(الف) یہ فلسفہ ہندوستانی ذہنیت کی تدریجی ترقی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں بیرونی ہندو فلاسفی کے تمام فوری اصول تسلیم شدہ ہیں اور اس کے متوازی اسلامی دور کے ذہنی ارتقاء کی تکمیلی شکل موجود ہے۔ اس میں فلسفہ کے دو مختلف اسکولوں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا پرانا تاریخی تخالف دور کر دیا گیا ہے۔

(ب) اس کے فلسفہ الٰہیات کی تعلیم ریاضی کی مثالوں سے واضح ہو سکتی ہے۔ جس کا نمونہ اس فلسفہ کے تیسرے شارح مولانا محمد قاسمؒ موسس دار العلوم دیوبند کی تالیفات میں موجود ہے۔

تشریح: اس فلسفہ کے پہلے شارح امام عبد العزیز دہلوی اور دوسرے شارح مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی ہیں۔

(ج) اس کا اجتماعی فلسفہ ایسا مکمل ہے کہ انسانی عقل آج تک اس سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

(د) اس فلسفہ سے تمام مذاہب عالم کی عقلی تشریح و تطبیق ہو جاتی ہے۔

(۶) اس پارٹی کے آخری فیصلہ کن سیاسی اجتماع کا نام سندھ ساگر نیشنل کانگریس ہو گا۔ اس کے تمام فیصلے قطعی ہونگے۔

(الف) اس کانگریس میں شرکت کا حق ہر ایک ممبر کو فقط اس کے اقتصادی صنفی (طبقاتی) حلقہ کی نمائندگی کے اصول پر حاصل ہو گا۔ کسی مذہبی جماعت کو مذہبی حیثیت سے نمائندگی نہیں دی جائے گی۔

(ب) ساگر پاٹی ''آل انڈیا نیشنل کانگریس'' کو آل انڈیا انٹرنیشنل کانگریس کے درجہ پر مانتی ہے۔

تشریح: پورا ہندوستان ایک براعظم ہے۔ مختلف اقوام وممالک کا مجموعہ۔ اگر روس کو علیحدہ فرض کیا جائے تو رقبہ اور آبادی میں یورپ سے متقارب ہے اس لئے کسی آل انڈیا سیاسی مجمع کو نیشنل مجمع ماننا ایک اصطلاحی غلطی ہے۔ پورے ہندوستان کے انٹرنیشنل فیڈریشن میں سندھ ساگر پارٹی کا سیاسی حلقہ اثر اور اس کی نیشنل کانگریس ایک تسلیم شدہ وحدت اور ایک اکائی مانی جائے گی۔

(۷) سندھ ساگر پارٹی کے عمومی حلقہ اثر میں ہر فرد کیلئے اس کی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا ضروری ہے۔

(الف) میدانِ عمل کے پہلے حصہ میں سندھی زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔حکومت سندھ کی اس تجویز کو پارٹی تسلیم کرتی ہے اور بالغوں کی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کیلئے اسے مقطّع ابجد میں لکھنا تجویز کرتی ہے۔

(ب) رسم الخط کے بارے میں ہندوستانی قوموں کے نزاع و جدال کو ختم کرنے کیلئے پارٹی ہر فرد کیلئے ضروری قرار دیتی ہے کہ ہندی کیریکٹر اور رومن کیریکٹر میں بھی سندھی لکھنا سیکھے۔

(ج) پارٹی اپنے حلقہ اثر کے دوسرے دو حصوں میں بھی مقامی زبان کو تسلیم کرتی ہے اور اسے ان تین رسم الخط میں لکھنا ضروری قرار دیتی ہے۔

تشریح: پنجابی کیلئے ہندی کیریکٹر گورمکھی اور اردو کیلئے ناگری۔

(۸) پارٹی کے عمومی حلقہ اثر میں ایسی اقوام بستی ہیں، جن کے عظیم الشان تاریخی انٹرنیشنل اجتماع نے اردو جیسی شستہ اور ترقی کن زبان یادگار چھوڑی ہے۔اس اجتماع میں ہندی، فارسی، ترکی قومیں شریک تھیں۔اور (یہ زبان) ہندوستان کے انٹرنیشنل اجتماع کیلئے مشترک زبان بننے کی پوری استعداد رکھتی ہے۔اسی لیے انگریزی حکومت نے اپنے پہلے دَور میں اس (اردو، ہندوستانی) کو شمالی ہند کی بین الاقوامی زبان مان لیا تھا، دہلی اور کلکتہ اس کے مرکزی مرکز تھے۔اس کے بعد دوسرے دور میں دہلی کے عوض لاہور کو مرکز بنایا اور دہلی کی دو یا تین شاخیں پہلے دور میں پیدا ہو چکی تھیں۔لکھنؤ، رام پور، حیدرآباد، آخر میں حکومت انگریزی

پھر دہلی کی مرکزیت پیدا کر رہی ہے۔ پارٹی ہندوستان کی اس نادر خصوصیت کی حامل زبان ''اردو، ہندوستانی'' کی حفاظت اور ترقی کو ضروری سمجھتی ہے۔

(الف) پارٹی اسے اپنے عمومی حلقہ اثر کیلئے انٹرنیشنل زبان مانتی ہے۔

(ب) پارٹی کے حلقہ اثر کی مقامی زبانیں فقط ابتدائی اور وسطی درجہ تک تعلیم کا ذریعہ بہ مشکل بن سکتی ہیں۔ اس زمانہ میں ''اردو ہندوستانی'' بطور زبان کے لازمی ہوگی اور جہاں مقامی زبان کی حد ختم ہوئی، تمام تعلیم اس ''اردو، ہندوستانی'' کے ذریعے دی جائے گی اور جامعہ ملیہ، دہلی اس طرح کی تعلیم کا مرکز ہوگی۔

(ج) اردو کی ترقی کیلئے پارٹی اپنے تعلیمی مرکزوں میں ان چار زبانوں کی تعلیم جاری رکھے گی:

(۱) فارسی (۲) عربی (۳) ناگری (۴) انگریزی۔

(۹) ہند کے دوسرے حصوں سے ملنے کیلئے جہاں اردو بین الاقوامی فائدہ نہیں دے سکتی۔ ان ممالک ہند کیلئے پارٹی انگریزی زبان کو اپنی انٹرنیشنل زبان مانتی ہے۔

(الف) اور اس طرح بیرونی ممالک کیلئے بھی اسے اپنی بین الاقوامی زبان بناتی ہے۔

تشریح: انگریزی زبان تخمیناً دو سو برس سے ہند میں بالتدریج حکومت کر رہی ہے۔ جنوبی ہند کے بعض حصے اسے اپنی زبان کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے اسے نیم ہندوستانی زبان کا درجہ دینا انصافاً و مصلحتاً ضروری ہے۔

(ب) پارٹی کے حلقہ اثر میں انگریزی زبان کی تعلیم ہر فرد کیلئے حسب المدراج ضروری ہے۔

تشریح: سندھ ساگر پارٹی اپنے پہلے دور میں مصلحت خارجیہ کے لئے انگریزی کو اوّل درجہ پر رکھے گی اور اردو، ہندوستانی کو دوسرے درجہ پر اس کے بعد دوسرے دور میں اردو ہندوستانی کو اوّل درجے پر رکھے گی اور انگریزی کو دوسرے درجہ پر۔ مگر انگریزی کو اپنے حلقہ اثر سے نہ تو خارج کرے گی، نہ اس کی اہمیت کم کرے گی۔

(۱۰) سندھ ساگر پارٹی انڈین نیشنل کانگریس کے اندر ایک مستقل پارٹی ہے۔ اس لیے اس کا نصب العین وہی انڈین نیشنل کانگریس کا نصب العین ہے۔ یعنی پورے ہندوستان کی کامل و مکمل آزادی اور استقلال۔

(الف) سندھ ساگر پارٹی آزادی حاصل کرنے میں اسلامی ممالک کی انفرادی ذمہ داری کو مجموعی ہند کی ذمہ داری پر مقدم مانتی ہے۔

(ب) تکمیل آزادی کے دور میں سلطنت ہند کی مصلحت حربیہ اور مصلحت خارجیہ پر بالتدریج جس قدر ہندوستانی قبضہ ہوگا۔ اس میں بھی پارٹی ممالک ہند کا انفرادی حق پورے ہند کے حق پر مقدم قرار دیتی ہے۔

تشریح: اگر ہند کے جنوبی اور وسطی ممالک، تحصیل آزادی میں تساہل برتیں تو نارتھ ویسٹرن انڈیا کو اپنی پیش قدمی جاری رکھنا چاہیئے۔ پارٹی آنکھوں دیکھی بات کی طرح یقین رکھتی ہے کہ بیرونی انقلاب کی لہریں پہلے اسی حصہ سے ٹکرائیں گی۔ انقلاب اعلانِ جنگ کی شکل میں ہو یا تخریبی پروپیگنڈہ، اس لئے دوسرے حصوں کے پیچھے چلنا اپنی موت کے فیصلے پر دستخط کرنے کے برابر ہے۔ اسی طرح سندھ ساگر پارٹی کے حلقہ اثر کی مصلحت حربیہ اور خارجیہ پہلے سندساگر نیشنل کانگریس کے قبضے میں ہوگی، اس کے بعد آل انڈیا نیشنل (یا انٹرنیشنل) کانگریس کے ہاتھ میں۔ کیونکہ ہم اپنا مستقبل وسطی اور جنوبی ممالک کے فیصلے پر نہیں چھوڑ سکتے۔

(ج)۔ سندھ ساگر پارٹی فیصلہ کرتی ہے کہ کافی زمانے تک ہمیں برٹش کامن ویلتھ کے اندر رہنا ہوگا۔ تاکہ باہمی سمجھوتہ سے حربیہ اور خارجیہ مصلحتوں پر قبضہ کیا جاسکے۔

(د) سندھ ساگر پارٹی فیصلہ کرتی ہے کہ حربیہ اور خارجیہ پر قبضہ کرنے کے بعد بھی کافی زمانہ تک ہمیں برطانیہ کے ساتھ رہ کر اس کی دوستی سے استفادہ کی ضرورت ہوگی۔

(ہ) سندھ ساگر پارٹی مستقل مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ ہند کی آزادی پسند اور انقلابی جماعتیں عام نظر میں جس قدر برطانیہ کی محتاج نظر آتی ہیں۔ فی الحقیقت برطانیہ کو اس سے کہیں زیادہ ان ہندوستانی جماعتوں کے اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ اس لئے پارٹی کی نظر میں ناممکن نہیں کہ عدم تشدد کے اصول پر حزم و احتیاط سے عمل کرنے کا نتیجہ استقلال کامل نکل آئے۔ اس احتمال پر پارٹی نے عدم تشدد کا مسلک اپنے سیاسی پروگرام میں داخل کرلیا ہے۔ ہندوستان کے وسطی ممالک کی طرح ہم اسے ایک مذہبی عقیدہ نہیں مانتے۔

حسبی اللہ لا الہ الا اللہ علیہ توکلت و ھو رب العرش العظیم.

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین.

مقالہ نمبر ۵

ایک نومسلم کی انقلابی زندگی کا سادہ خاکہ

(خودنوشت حالات زندگی)

۲۴۔جنوری ۱۹۳۹ء

جبال الصولتیہ۔بلداللہ الحرام مکہ مکرمہ

پس منظر

[امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں قریباً ۲۴ برس (از اگست ۱۹۱۵ء تا ۷ مارچ ۱۹۳۹ء) ہندوستان سے باہر جلاوطن رہے۔ انڈین گورنمنٹ نے تاج برطانیہ کا بڑا دشمن سمجھتے ہوئے آپ پر ہندوستان میں داخلہ پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ ایسے میں ملک بھر کی قومی، سیاسی اور مذہبی جماعتوں اور سربرآوردہ شخصیات نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو ہندوستان واپس آنے کی اجازت دینے کا مطالبہ بڑی شدت سے کیا، پہلی مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر روزنامہ انقلاب لاہور، اور سر عبداللہ ہارون کراچی نے مولانا کی واپسی کے لئے کوشش کی۔ دوسری دفعہ انڈین نیشنل کانگریس کے تمام راہنماؤں مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو صدر کانگریس نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور دیگر علمائے دارالعلوم دیوبند نے جمعیۃ العلماء اور دارالعلوم کے جانب سے، نیز سندھ کانگریس کمیٹی نے سندھ سے حضرت مولانا سندھیؒ کو ہندوستان واپس آنے کی اجازت دیئے جانے کے حوالے سے قراردادیں اور تجاویز منظور کیں۔

جب یہ سب کچھ اخبارات میں چھپا، تو قدرتی طور پر قارئین میں حضرت مولانا سندھیؒ کے حالات زندگی معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اخبارات ورسائل نے اپنے طور پر

آپ کے حالات معلوم کر کے شائع کرنا شروع کر دیئے، جن میں تحسین وتوصیف میں مبالغہ آمیزی اور بعض سُنے سُنائے واقعات کا عنصر غالب تھا۔

حضرت سندھیؒ نے جب مکہ مکرمہ میں لاہور کے یہ اخبارات دیکھے تو آپ کو خیال ہوا کہ ان کی تصحیح کی جائے، اور یہ چاہا کہ میرے حالات زندگی درست طور پر ملک وقوم کے سامنے آنے چاہئیں، اس تناظر میں آپ نے اپنی انقلابی زندگی کا ایک سادہ خاکہ مرتب کر کے روزنامہ ''انقلاب'' کے ایڈیٹر مولانا غلام رسول مہرؔ کے نام ارسال کر دیا اور ایک خط الگ سے بھی مولانا مہرؔ کے نام لکھا جس پر ۲۔ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ/ ۲۴ جنوری ۱۹۳۹ء کی تاریخ درج ہے۔ اس خط میں حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں:

> ''ایک سیالکوٹی نومسلم کی انقلابی زندگی کا سادہ خاکہ پہلے ''انقلاب'' میں چھپنا چاہیئے۔ اس لئے آپ کو بھیج رہا ہوں۔ محترم مدیر ''زمیندار'' اور ''احسان'' جب اس تصحیح کو چھاپ دیں گے، تو میری طرف سے شکریہ کے مستحق ہوں گے۔''

حضرت مولانا سندھیؒ کا یہ خط ۲۵۔ فروری ۱۹۳۹ء کے ''انقلاب'' میں شائع ہوا تھا۔ اور ۲۸۔ فروری ۱۹۳۹ء کے ''انقلاب'' کے ہفتہ وار ایڈیشن میں ''خودنوشتہ حالات زندگی'' کے عنوان سے یہ خاکہ طبع ہوا تھا۔ لیکن مولانا سندھیؒ نے اپنے خط میں اس تحریر کو جو عنوان دیا ہے۔ ہم نے بھی اسی کو قائم رکھا ہے۔ آزاد]

حالات زندگی کے بارے میں تصحیح

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

لاہور کے اخبارات میں میرے متعلق محبت آمیز مقالات شائع ہو رہے ہیں۔ میں مقالہ نگار عزیزوں کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن میری شخصیت اور ابتدائی تعلیم اور عام حالات میں اس قدر فاش غلطیاں موجود ہیں کہ میں بدون شرم محسوس کیے پڑھ نہیں سکتا۔ اس لیے تصحیح کے لیے چند واقعات مختصراً لکھنے پر مجبور ہوں۔

میرا خاندان اور مولد

میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (چیاں والی) میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زرگری ہے۔ لیکن عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے رہے۔

میں عموماً حضرت سلمان فارسیؓ کے اتباع میں اپنا نام عبید اللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں۔ مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا تو عبید اللہ بن ابی عائشہ لکھا، میری بڑی ہمشیرہ کا نام ''جیونی'' تھا میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر کسی نے

اس سے زیادہ تشریح کے لیے کہا تو عبیداللہ بن راما بن رائے لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

پیدائش اور یتیمی

میں بشب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ (۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء) میں پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا تو میری والدہ مجھے ننھال میں لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔ میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوا تو ہم ان کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اردو مڈل اسکول میں شروع ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لیے گھر چھوڑ دیا' اس دوران میں دو سال کے لیے میں ضلع سیالکوٹ میں رہا' اس لیے اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا ورنہ اپنے اسکول میں شروع سے ممتاز طالبعلم مانا جاتا تھا۔

مطالعہ اسلام

۱۸۸۴ء میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماجی لڑکے کے ہاتھ سے ''تحفۃ الھند'' ملی۔ اس کے مسلسل مطالعہ میں مصروف رہا اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے قریب کے پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلان) سے چند دوست بھی مل گئے جو میری طرح ''تحفۃ الہند'' کے گرویدہ تھے۔ انھیں کے توسط سے مجھے مولانا اسماعیل شہید کی ''تقویۃ الایمان'' ملی۔ اس کے مطالعہ پر اسلامی توحید اور ''پرانک شرک'' اچھی طرح سمجھ

میں آ گیا۔اس کے بعد مولوی محمد صاحب لکھوی کی کتاب احوال الآخرت (پنجابی) ایک مولوی صاحب سے ملی۔اب میں نے نماز سیکھ لی اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر عبیداللہ خود تجویز کیا۔

''احوال الآخرت'' کا بار بار مطالعہ اور ''تحفۃ الھند'' کا وہ حصہ جس میں نو مسلموں کے حالات لکھے ہیں، یہی دو چیزیں جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں۔ ورنہ اصلی ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی اسکول میں اگلے سال تعلیم کے لیے جاؤں گا تو اس وقت اظہار اسلام کروں گا۔

اظہارِ اسلام

۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو توکلاً علی اللہ نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کوٹلہ مغلان کا ایک رفیق عبدالقادر تھا۔ ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالبعلم کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ میں پہنچے ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۴ء (۲۹۔اگست ۱۸۸۷ء) کو میری سنتِ تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چندروز بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہوگیا۔عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اس طالبعلم سے پڑھنا شروع کردی تھیں۔

سیّدالعارفین کی صحبت

اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہوگئی۔ اسی طرح کی خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہے کہ سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحبِ بھرچونڈی والے کی خدمت میں پہنچ گیا، جو اپنے وقت کے جنید اور سیدالعارفین تھے چند ماہ مَیں ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لیے طبیعت ثانیہ

بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا (غالباً مولانا ابوالحسن امروٹی جن کا ذکر آگے آئے گا اس مجمع میں موجود تھے) کہ عبیداللہ نے اللہ کے لیے اپنے ماں باپ کو چھوڑا اس لیے اب اس کے ماں باپ ہم ہیں، اس کلمۂ مبارک کی تاثیر خاص میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انھیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور اسی لیے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا میں نے قادری راشدی طریقہ میں ان سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس ہوا کہ بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔ تین چار ماہ بعد میں طالبعلمی کے لیے رخصت ہوا مجھے بتایا گیا کہ حضرت نے میرے لیے خاص دعا فرمائی ''خدا کرے عبیداللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے'' میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی۔ اور اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی خدمت میں پہنچا دیا۔

سید العارفین کے خلیفہ

بھرچونڈی سے رخصت ہو کر میں اس طالبعلم کے ساتھ ریاست بہاول پور کی دیہاتی مسجد میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نقل و حرکت میں دین پور پہنچا جہاں سید العارفین کے خلیفہ اوّل مولانا ابوالسراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ھدایۃ النحو تک کتابیں میں نے یہیں مولانا عبدالقادر صاحب سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا وہ آ گئی اور واپس لے جانے کے لیے بہت زیادہ زور لگایا مگر میں بحمداللہ ثابت قدم رہا، یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچی شوال ۱۳۰۵ھ (جون ۱۸۸۸ء) میں دین پور متصل خان پور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا۔ اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھا۔

یہیں ایک نو وارد طالبعلم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا اور میں اسٹیشن مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیو بند پہنچا۔

دارالعلوم دیو بند

صفر ۱۳۰۶ھ (اکتوبر ۱۸۸۸ء) کو میں دارالعلوم دیو بند میں داخل ہوا۔ تخمیناً پانچ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقہء مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔

حکمت و منطق کی کتابیں جلدی ختم کرنے کے لیے چند ماہ مولانا احمد حسن صاحب کان پوری کے مدرسہ میں چلا گیا اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رام پور میں رہ کر مولوی ناظر الدین صاحب سے کتابیں پڑھ لیں۔ اسی طرح صفر ۱۳۰۷ھ (اکتوبر ۱۸۸۹ء) کو پھر دیو بند واپس آ گیا۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی خدمت میں

دیو بند میں دو تین مہینے تک مولانا حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہندؒ کے دروس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ کو ہدایہ' تلویح' مطوّل' شرح عقائد اور مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اوّل نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ اور فرمایا اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہوگا چند دوستوں نے مبشرا خواب دیکھے۔ میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کو بھی خواب میں دیکھا۔ رمضان شریف میں

اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا' جسے حضرت شیخ الہندؒ نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح پیش کیے کہ جہاں اہل علم محققین کی رائے کو ترجیح دی تھی مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن الحصول نہیں بلکہ راسخین فی العلم وہبی علم سے جانتے ہیں۔

شوال ۱۳۰۷ھ (مئی ۱۸۹۰ء) سے تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی حضرت مولانا شیخ الہندؒ سے پڑھی اور سنن ابی داؤد کے لیے حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ (گنگوہی) کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔

شاہ جہان آباد دہلی

بیمار ہوکر گنگوہ سے دہلی آیا۔ حکیم محمود خان کے علاج سے افاقہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلد جلد ختم کرلیں۔ مجھے یاد ہے کہ ''سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ'' میں نے چار چار دن میں پڑھی ہیں اور ''سراجی'' دو گھنٹہ میں ختم کی۔ مولوی (عبدالکریم) صاحب' حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے غیر معروف مگر محقق شاگرد تھے۔ اثناء قیام دہلی میں دو دفعہ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب کی زیارت کے لیے بھی گیا۔ ''صحیح بخاری'' اور ''جامع ترمذی'' کے دو سبق بھی سُنے۔

معاودتِ سندھ

(سندھ واپسی)

۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۰۸ھ (فروری ۱۸۹۱ء) کو دہلی سے سیدھا بھرچونڈی ضلع سکھر پہنچا (اس تمام سفر میں ایاباً و ذہاباً لاہور نہیں اترا اور چینیاں والی مسجد نہیں گیا۔ میرے

مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۱ء) میں حضرت شیخ الہندؒ نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد پڑھی۔

سیدُ العارفین کے دوسرے خلیفہ

شوال ۱۳۰۸ھ (مئی ۱۸۹۱ء) سے سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب کے پاس امروٹ ضلع سکھر میں چلا گیا۔ انہوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ وہ میرے لیے بمنزلہ باپ تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ اسکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خان یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔ میری والدہ کو بلایا۔ وہ میرے پاس آخر وقت تک اپنے طرز پر رہی۔ میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے ظلِ عاطفت میں ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) تک باطمینان مطالعہ کرتا رہا۔

کتب خانہ پیر صاحب العلم

گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد میں راشدی طریقہ کے پیر صاحب العَلم کے پاس علومِ دینیہ کا بے نظیر کتب خانہ تھا۔ میں دوران مطالعہ وہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار بھی لاتا رہا۔ میری تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانے کے فیض کو بڑا دخل تھا۔

حضرت پیر صاحب العَلم کی صحبت

اس کے علاوہ حضرت مولانا رشید الدین صاحب العَلم الثالث کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی کرامتیں دیکھیں۔ ذکر اسماء الحسنیٰ میں نے انھیں سے سیکھا۔ وہ

دعوتِ توحید و جہاد کے ایک مجدّد تھے۔ حضرت مولانا ابوالتراب راشد اللہ صاحب العَلَم الرابع سے علمی صحبتیں رہیں۔ وہ علم حدیث کے بڑے جید عالم اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کے ساتھ قاضی فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

میری علمی تحقیقات کا مرکز

اللہ کی رحمتوں میں سے ایک نعمتِ عظمیٰ جس کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا' یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق و تطبیق میں اور ایسا ہی قرآن عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی سے شروع کر کے امام ولی اللہ دہلوی تک سلسلہ علماء میرا رہبر بنا اور میں نے ان کو اپنا امام بنالیا۔ مجھے اپنی علمی اور سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے باہر کسی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس سے میری تمام کوششیں اصولی طور پر منظّم ہوگئیں۔ اور میں اسلام کی فلاسفی کو سمجھنے کے قابل ہوگیا۔ میں نے دہلی میں قبلہ نما (مصنفہ حضرت نانوتویؒ) کا مطالعہ کیا۔ اس کے معارف میری روح سے پیوستہ ہوگئے۔ حدیث کی تحقیق میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا تعارف مولانا شیخ الہند نے کرایا تھا۔ آخر میں اسی کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہوا۔ میں نے علماء کی ایک جماعت کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھائی اور کافی عرصہ بعد حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھی۔

طریقہ قادریہ

اس عرصہ میں طریقہ قادریہ اور نقشبندیہ مجدّدیہ کے اشغال و اذکار بھی حسب الاستطاعت حضرت سید العارفین کے خلیفہ اعظم مولانا ابوالسراج دین پوری سے سیکھتا رہا۔ اگر میری کوئی دنیاوی ضرورت امروٹ میں پوری نہ ہوتی تو دین پور سے حاصل کرلیتا۔ اس طرح مجھے اپنے مرشد کی جماعت سے باہر جانے کی ضروت نہیں ہوئی۔

میرا سیاسی میلان

دورانِ مطالعہ میں نے مولانا محمد اسماعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتداء سے میرا قلبی تعلق مولانا مرحوم سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالبعلمی نے بہت سے واقعات اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوطِ دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتا دی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب (پنجاب پر انگریزوں کے تسلط) کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا پہلے جو کچھ لاہور کے لیے سوچتا تھا' اب دہلی کے لیے سوچنے لگا۔ مولانا شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا سیاسی پروگرام بنا لیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہیں تھا' میں نے حجۃ اللہ البالغہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا۔ اس طرح اپنے خیالات کے موافق آہستہ آہستہ کام شروع کر دیا۔

معاودتِ دیوبند

(دیوبند واپسی)

۱۳۱۵ھ (نومبر ۱۸۹۷ء) میں دیوبند پہنچا۔ اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گیا۔ ایک علم حدیث میں' دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا شیخ الہند نے دونوں رسالے پسند فرمائے۔ اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سُنا کر دوبارہ شفہاً اجازت حاصل کی۔

بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا ذکر آ گیا۔ حضرت مولانا

نے اسے بہت پسند فرمایا اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اس کو اتحادِ اسلام کی کڑی بنا دیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ سے وابستہ ہو گئے۔

دار الرشاد گوٹھ پیر جھنڈا

امروٹ واپس آ کر میں نے مطبع قائم کیا۔ اور دو سال تک چلایا۔ بعض عربی اور سندھی کتابیں جو نایاب تھیں، طبع ہوئیں۔ اس کے بعد ایک ماہوار رسالہ "ہدایت الاخوان" چھپتا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش کی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسہ کے چل نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ حضرت مولانا راشد اللہ صاحب العَلم الرابع نے ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا۔ مدرسہ کا نام بھی میری تجویز سے مقرر ہوا۔ میں اس میں شریک ہوا۔ سات سال تک علمی اور انتظامی کامل اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اکابر علماء میں سے حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی امتحان کے لیے تشریف لائے۔ اس مدرسہ میں بھی میں نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت خواب میں کی اور امام مالکؒ کو بھی خواب میں دیکھا۔

جمعیۃ الانصار دیوبند

۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند طلب فرمایا۔ اور مفصّل حالات سُن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لیے حکم دیا۔ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس جمعیۃ کی تحریک تاسیس میں مولانا

محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابومحمد محمد احمد لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی (لاہوری) میرے ساتھ شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی

حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیو بند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۳ء) میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حکیم اجمل خاں صاحب اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح پر شریک تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال دیو بند میں رہ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا اور ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت (قیادت) سے واقف رہا۔

ہجرتِ کابل

۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا۔ اور میں افغانستان پہنچ گیا۔

دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتلایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انہوں نے بھی اگرچہ مجھے اپنا نمائندہ بنایا۔ مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہیں بتلا سکے۔

کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہ' جس جماعت کے نمایندہ تھے'اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظّم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہے۔اس میں میرے جیسے ایک خادم کی شیخ الہندؒ کو اشد ضرورت تھی۔اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔۱۹۱۶ء میں امیر حبیب اللہ نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔اس کی تعمیل میرے لیے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہو گی کہ امیر صاحب مرحوم اتحادِ اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریزیڈنٹ ہوں۔

سیاحتِ روس

۱۹۲۲ء میں ترکی جانا ہوا۔سات مہینے ماسکو میں رہا۔سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوانوں رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا۔اس لیے سویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا۔کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا)۔

میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ کے فلسفہ کی

ایک شاخ ہے' اس زمانہ کے لادینی حملہ سے محفوظ کرنے کیلئے تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔

میں اس کامیابی پر اول انڈین نیشنل کانگریس' دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقاء جن میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی۔ سوشلسٹ اور نیشنلسٹ بھی' سوم سویٹ روس کا ہمیشہ ہمیشہ ممنون ہوں اور شکرگزار رہوں گا۔ اگر ان تینوں طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی بھی حاصل نہ کرسکتا تھا۔ (للہِ الحَمد وَ حدہ')۔

نئی ترکیا

۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا۔ میرے لیے سفیر ترکیہ متعین ماسکو اور وزارت خارجہ ماسکو نے مل کر سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا۔ اور برطانوی کارندے اس کا پتہ نہیں لگا سکے (یہ غلط ہے کہ میں استنبول اس زمانہ میں پہنچا جب برطانیہ اور فرانس اس پر قابض تھے) تخمیناً تین سال میں ترکی میں رہا ہوں۔ میں نے تحریک اتحادِ اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا ہے۔ مستقبل قریب میں اس کے لیے کوئی مرکز نظر نہ آیا۔ اس لیے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا۔ اور کانگریس میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا۔ جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

ہمارا پروگرام

یورپ کو اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے کہ میں اپنے استاذ الاستاذ اور امام مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہنا تا رہا ہوں۔

اس پروگرام کو ترکی پریس سے شائع کرانے کیلئے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔وزارتِ خارجہ نے دو مترجموں سے ترجمہ کرا کے جب تک اس کا حرف حرف نہیں پڑھ لیا' اجازت نہیں دی۔ بعض ہندو دوست اردو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ان کی سہولت کے لیے میں نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا۔استنبول میں لالہ لاجپت رائے سے تبادلۂ افکار ہوا اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں ہوئیں' ہمارے بزرگ نہ اسے مان سکتے ہیں۔ نہ اس کا اچھا بدل بتلا سکتے ہیں۔اور کوشش کریں گے کہ ہمیں ہزار دو ہزار سال پہلے کے زمانہ میں لے جا کر کھڑا کر دیں۔البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اسکی پسندیدگی پر لکھا ہے۔وہ میرے لیے باعث سرور ہے۔

میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا۔لیکن اس بناء پر پولیٹکل پروگرام کی تشکیل اور اس کی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یاد دلا دی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام کے پہلے دور میں اسی اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔

''کلمة الحکمة ضالة المومن حیث وجد ھا فھو اَحق بھا''۔

ترجمہ: دانائی کی بات مومن کی گم شدہ متاع ہے' جہاں بھی اسے پائے' وہ اسے لینے کا حقدار ہے۔

مکہ معظّمہ پہنچنا

۱۳۴۴ھ (۱۹۲۶ء) میں موسم حج پر مکہ معظّمہ میں موتمر خلافت منعقد ہوئی۔ میرے تمام دوست اس میں آ رہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستے سے مکہ معظّمہ پہنچنے کی کوشش کی مگر میں موتمر ختم ہونے کے بعد صفر ۱۳۴۵ھ (اگست

۱۹۲۶ء) میں پہنچا۔ میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا تھا۔ میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں میں کوئی سیاسی پراپیگنڈہ نہیں کروں گا۔ اس نے مجھے نیشنلسٹ تسلیم کرلیا۔ اس وجہ سے ایک طرح میں محفوظ ہو گیا۔ اگر کبھی جزوی امداد کی میں نے درخواست کی تو حکومت نے اسے پورا کر دیا۔ میرے اپنے طور پر رہنے میں اولیاء امور حارج نہیں ہوئے۔ اس لیے میری طرف سے بہت بہت شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں۔ جزاھم اللہ خیرا.

علماء مکہ سے استفادہ

مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی۔ سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی حاجی علی جان والے۔ دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب دہلوی مرحوم۔ تیسرے ابوالشرف مجددی۔ ان کے کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے میری مراد شیخ محمد بن عبدالرزاق بن حمزہ شیخ دارالحدیث مکہ اور شیخ ابوالسمح عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ

میں تقریباً ۱۳۔۱۴ سال سے ''قرآن عظیم'' اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے اس زمانہ میں انھیں امام ولی اللہ دہلوی کے اصول پر بالاطمینان حل کرلیا۔ جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دہلوی کو نہیں مان سکتے۔ ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کرسکتا۔ لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانہ میں قابل عمل تعلیم کا ایک اعلیٰ نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے۔ میں نے امام ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا مثلاً ''بدور بازغہ''۔ ''خیر کثیر''۔ ''تفہیمات الٰہیہ''۔

''سطعات''۔ ''لمعات''۔ ''الطاف القدس'' وغیرہ۔

ان کی کتابوں کے لیے بطور مفتاح (کنجی) میں نے مولانا رفیع الدینؒ دہلوی کی تکمیل الاذہان اور مولانا اسماعیل شہید کی ''عبقات'' اور مولانا محمد قاسم کی ''قاسم العلوم'' اور ''تقریر دل پذیر'' اور ''آب حیات'' کو استعمال کیا۔ مجھے ان کتابوں کے پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا اور ساتھ ہی مدارسہ قرآن عظیم بھی جاری رہا۔ اس سے میرے نظریات بہت وسیع ہو گئے۔ للہ الحمد۔

امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا مدرسہ

اگر مجھے موقع دیا جائے کہ میں امام ولی اللہ دہلوی کو حکمت کا مجتہد مستقل فرض کر لوں۔ اور امام عبدالعزیز دہلوی اور مولانا رفیع الدین دہلوی کو اس حکمت کا (مجتہد) منتسب اور مولانا اسماعیل شہید اور مولانا محمد قاسم کو مجتہد فی المذہب کے رتبہ پر تسلیم کر لوں تو میں اس حکمت کا ایسا اسکول قائم کر سکتا ہوں جس میں:۔

(الف) قرآن عظیم

(ب) سنت رسول ﷺ و سنت الخلفاء الراشدین۔

(ج) تاریخ اسلام

کی پوری عقلی تشریح ممکن ہو۔

اس کے بعد تمام مذاہب عالم اور ان کی کتب مقدسہ کی تحقیق و تطبیق اسی اصول پر آسان ہو جائے گی۔ ذلک من فضل اللہ' واللہ ذوالفضل العظیم.

مراجعت وطن

۱۹۳۶ء سے انڈین نیشنل کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کی۔

اور میرے تمام دوست اس کی تائید میں کام کرتے رہے اس میں سیاسی مسلک کے اتحاد و اختلاف کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس طرح کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ مجھے یکم نومبر ۱۹۳۸ء کو اجازت واپسیٔ وطن کی اطلاع ملی اور یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ ہوا۔ حج کا موسم قریب آ گیا۔ اس لیے ادائے مناسک سے فراغت پر واپسی کا ارادہ ہے۔ (واللہ الموفق)۔

ہندوستان میں میرا پروگرام

ہندوستان میں میرا پروگرام اس کے قریب قریب ہوگا۔

(۱) انڈین نیشنل کانگریس کا معمولی ممبر تو ہمیشہ رہونگا تاکہ عدم تشدد کے متعلق میری ذمہ داری میرے قومی قانون کے اندر منضبط رہے۔ اور میں پریشان دوستوں کی مشوش حرکات سے محفوظ رہ سکوں۔ لیکن کانگریس کی کسی پارٹی کے عملی حصہ میں شرکت نہیں کروں گا۔

(۲) میرا محبوب مشغلہ فلسفہ امام ولی اللہ کی تعلیم و اشاعت ہوگا۔ میں اعلیٰ طبقہ اہل علم کو اس طرف متوجہ کروں گا۔ اس میں دینی عالم اور دانشمند لوگ مخاطب ہوں گے۔ اگر کوئی غیر مسلم ہندو۔ مسیحی، آزاد منش اس فلسفہ کا مطالعہ پسند کرے گا تو اس کی پوری امداد کروں گا۔

(۳) جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوئے تو میں نیشنل کانگریس میں فلسفہ امام ولی اللہ کی روشنی میں اقتصادی اصول پر اپنی مستقل پارٹی تشکیل کروں گا۔

واللہ المستعان وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

جبال الصولتیة بلد اللہ الحرام

(۲۴۔ جنوری ۱۹۳۹ء)

مقالہ نمبر ٦

دینی فکر کی اساس پر انقلاب کی اہمیت

ایک معرکۃ الآراء خطاب

مارچ ۱۹۳۹ء

پس منظر

[تحریک ریشمی رومال کے حوالے سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ' کے حکم پر مولانا عبیداللہ سندھیؒ ۱۹۱۵ء میں ہندوستان سے کابل تشریف لے گئے' اور ہندوستان کی آزادی کیلئے انتھک جدوجہد وکوشش کی' اس سلسلہ میں آپ نے جو صعوبتیں برداشت کیں' ان میں سب سے اہم آپ کی ۲۴۔سالہ جلاوطنی ہے' جس میں آپ کو ناگفتہ بہ حالات سے گذر کر مختلف ممالک میں جدوجہد آزادی کیلئے جانا پڑا۔ آخر میں آپ مکہ مکرمہ پہنچے' ۱۲۔سال تک تقریباً جوار حرم میں قیام فرمایا' اور حرم کی تجلیات وانوار سے فیضیاب ہوئے۔ اس دوران آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر اور تشکیل نو کیلئے جو کچھ سوچا تھا' اسے لے کر ہندوستان آئے۔ اور اہل وطن کو اس کی دعوت دی۔ حضرت مولانا نے کراچی کے ساحل پر اترنے کے بعد اہم ترین خطاب فرمایا............ جو نذر قارئین ہے۔ آزاد]

دینی فکر کی اساس پر انقلاب کی اہمیت

ایک معرکتہ الآراء خطاب

۲۴ سالہ جلاوطنی کے بعد مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا ایک معرکتہ الآرا تاریخی خطاب

حضرات!

محض وطن اور خاندان کی محبت مجھے اس عمر میں ہندوستان کھینچ کر نہیں لائی۔ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں زندگی کے معلوم نہیں کتنے دن اور ہیں، مجھے اگر آرام اور سکون کی خواہش ہوتی تو عمر کے یہ آخری دن حرم پاک ہی میں اطمینان سے گزارتا اور اس مقدس سر زمین میں سپرد خاک ہونا پسند کرتا۔ میں اس بڑھاپے میں اور اس قدر ضعف اور کمزوری کے باوجود آپ لوگوں کے پاس اس لئے پہنچا ہوں کہ آپ سے کچھ کہنا ہے:

آپ کے بزرگوں نے مجھے باہر بھیجا تھا۔ باہر رہ کر جو کچھ بھی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کر سکتا تھا۔ میں نے کی۔ اسی اثنا میں مَیں نے بہت کچھ دیکھا اور عجیب عجیب حالات سے مجھے گزرنا پڑا۔ میں جو کچھ تم سے کہنا چاہتا ہوں اسے غور سے سنو:۔

میں نے اپنی زندگی کے چوبیس برس ہندوستان سے باہر گزارے ہیں۔ اس طویل مدت میں مَیں نے محض ملکوں کی سیاحت نہیں کی اور چیزوں کو صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھا، بلکہ بڑی بڑی مہموں میں خود شریک رہا ہوں۔ اس جدوجہد میں کبھی اپنے ارادوں میں کامیاب رہا، تو اکثر بڑی تلخ اور جاں گداز ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔

مجھے سلاطین اسلام کے مشوروں میں شریک ہونے کا بھی موقع ملا اور میں ان سپہ سالاروں کا رفیق بھی رہا جو بڑی بڑی سلطنتوں کے رکن رکین تھے اور جن کے ہاتھوں دنیا کے عظیم الشان معرکے سر ہوئے۔ بادشاہوں اور سپہ سالاروں کے علاوہ میں جس ملک میں گیا اور جہاں بھی رہا۔ میں نے وہاں کی ہر چیز آنکھیں کھول کر دیکھی۔ میں نے ان ملکوں کی پچھلی تاریخ کا مطالعہ بھی کیا اور وہاں کے رہنے والوں کے موجودہ حالات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ میرا یہ مطالعہ سرسری نہیں اور میری باتوں کو تم وقتی تاثرات اور عارضی ہیجانات کا نتیجہ نہ سمجھنا میرے پیچھے تجربات اور مشاہدات کی ایک وسیع دنیا ہے اور میں نے اقوام کی تاریخ کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کی ہے۔ میرے حالات مجھ سے کرید کرید کر پوچھو اور میرے اخذ کردہ نتائج کو توجہ سے سنو اور ان پر غور کرو، میں کوئی بات تم سے چھپانا نہیں چاہتا، میرا علم، میرا مطالعہ، میرے تجربات اور میرے افکار وقف عام ہیں۔

میری آنکھوں نے زندگی کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ میرے سامنے بڑی بڑی سلطنتیں تباہ ہوئیں، بادشاہ، سپہ سالار اور امراء بری طرح قتل کیے گئے۔ وہ طبقے جو علم و حکمت اور عزت و دولت کے نشے میں ذہنی مسرتوں اور جسمانی آسودگیوں میں مست تھے۔ زمانے کی ایک ٹھوکر میں ذلت کے عمیق گڑھوں میں گرے ہوئے نظر آئے، نہ کوئی ان کے علم کا قدردان رہا اور نہ ان کی عزت کا پرسان حال، میں نے پرانے تمدنوں کی بنیادوں کو اپنی نظروں سے کھدتے دیکھا اور وہ نظام فکر جن کو ان کے ماننے والے لازوال جانتے تھے اور ان میں ایک ذرا سی تبدیلی ان پر گراں گزرتی تھی۔ میں نے ان نظاموں کے محترم و مقتدر علمبرداروں کو اپنے وطنوں سے دور محرومی و بے کسی میں دربدر خاک چھانتے دیکھا ہے۔ میں نے انسانی نسلوں کو فنا ہوتے، بستیوں کو اجڑتے، تمدنوں کو مٹتے اور مذہب اور اہل مذہب کو بڑی سفا کی سے کچلے جاتے دیکھا ہے۔

خدا جانتا ہے کہ وہ چیزیں جو مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز تھیں اور جن کے لئے میں نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا ہے ان چیزوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ختم ہوتے دیکھ کر مجھے کتنا دکھ ہوا اور ان دردناک مناظر سے میرے دل و دماغ پر کیا گزری۔ بہر حال خدا تعالیٰ کی خاص عنایت تھی کہ اس قدر کرب اور اتنی اذیت جھیلنے کے بعد بھی میرے ہوش و حواس بجا رہے۔ میں زندگی کے ان انقلابات کو برابر دیکھا کیا' اور ان پر غور و خوض بھی کرتا رہا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ جلاوطنی کے آخری ایام میں توفیق الٰہی مجھے دیار حرم میں لے آئی اور وہاں مَیں تقریباً ۱۲ سال تک رہا۔ اس طویل مدت میں مجھے اپنے تجربات' تاثرات اور جو کچھ اس وقت تک دیکھا' پڑھا اور سنا تھا۔ ان پر یکسوئی سے غور کرنے کا موقع ملا۔ آپ لوگ یقین کریں کہ جہاں تک میری عقل اور سمجھ کی پہنچ تھی۔ میں نے اپنے افکار کو اس طویل مدت میں خوب جانچا' پرکھا اور ان کے حسن و قبح میں تمیز کی۔ میں نے اپنے افکار کو جتنی بھی تاریخ میں جانتا تھا' اس کسوٹی پر کسا' خود اپنے تجربات کی روشنی میں ان کی صوابدید کی اور جو کچھ علم دین' حکمت اور تقویٰ مجھے میسر تھا اور اپنے مرشدوں اور استادوں کے فیض سے جو بھی بصیرت عطا ہوئی تھی۔ اپنے افکار کو ان کے روبرو پیش کر کے اپنے نفس کا بھی محاسبہ کیا اور ان افکار کا بھی پورا پورا جائزہ لیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جنہیں ہندوستان کے مسلمانوں کے اہل علم کا ایک بہت بڑا طبقہ اپنا امام اور استاد مانتا ہے۔ ان جیسے عظیم المرتبت عالم' حکیم' محدث' مجتہد اور خدا شناس بزرگ کے علم و حکمت کے ترازو میں اپنے افکار کو تولا۔

چنانچہ حرمِ اقدس کی برکتوں اور رحمتوں سے بھری ہوئی سرزمین میں ایک طویل عرصہ تک غور و تامل کرنے کے بعد جب مجھے اس بات پر پورا اطمینان ہو گیا کہ جن افکار و

خیالات اور طریق کار کی طرف میری جستجو نے میری راہنمائی کی ہے۔ اس سے نہ تو خدانخواستہ میرے اسلام کو گزند پہنچے گا اور نہ میری قوم کو اس کی وجہ سے کسی نقصان کا اندیشہ ہے' بلکہ مجھے اس پر پورا یقین تھا کہ اگر میرے وطن والے اُن ہی راہوں پر چلتے رہے جن پر وہ اب تک چلتے رہے ہیں اور جس عالم بے خبری میں وہ اب تک پڑے ہوئے ہیں' اسی عالم میں مست رہے تو نہ ان کا اسلام بچ سکے گا اور نہ ان کی قومی حمیت اور ملی حیثیت برقرار رہ سکے گی۔ جب مجھے اس حقیقت پر پورا یقین حاصل ہو گیا اور اس یقین نے کچھ کرنے اور فکر کو عمل میں لانے پر مجبور کر دیا' تو میں نے وطن واپس آنے کا تہیہ کر لیا۔

بے شک مجھے واپس وطن آنے کے لئے اپنے دشمنوں کی سامنے جھکنا پڑا' لیکن میں نے اپنی طبیعت کے خلاف اس اعترافِ شکست کے صدمے کو برداشت کیا' کیونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو کبھی بھی آپ لوگوں سے آج یوں باتیں نہ کر سکتا تھا' جو کچھ میرے دل و دماغ میں تھا' اسے میں ایک سربستہ راز کی طرح اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا اور آپ لوگوں کو ان حقائق سے آشنا نہ کر پاتا' جن تک خدا معلوم مَیں کیسی جسمانی مشقتوں' دماغی کاوشوں اور جاں کاہیوں کے بعد پہنچا تھا' جن میں میرے خیال میں آپ لوگوں کے لئے دنیا و آخرت دونوں کی فلاح تھی۔

میں ایک عالمگیر انقلاب کے سیلاب کو اپنی آنکھوں سے اٹھتا دیکھ آیا ہوں' انقلاب کے اس سیلاب نے کئی ایک ملکوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے جو اب تک بچے ہوئے تھے' اور جو بچے ہوئے ہیں وہ بھی اس سیلاب کی ریلے سے زیادہ عرصہ تک محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ یہ سیلاب موسمی جھکڑ نہیں کہ آیا اور نکل گیا۔ یہ عصر حاضر کے تاریخی تقاضوں کا قدرتی نتیجہ ہے۔ انقلاب کا یہ سیلاب پیچھے ہٹنے والا نہیں' دیوارِ چین ہو یا سد مآرب' یہ سیلاب سب کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا' دنیا ایک نئے طوفان نوح سے

دوچار ہوا چاہتی ہے' بادل گھر چکے ہیں' گھٹائیں برسنے ہی کو ہیں' طوفان اٹھتے اب زیادہ دیر نہیں لگے گی' لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں نہ تو ان طوفانوں کی خبر ہے اور نہ تم یہ جانتے ہو کہ اگر یہ طوفان بہہ نکلے' تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔

تمہارے علماء ہیں کہ ان کی نظریں محض پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔ وہ اپنے گردوپیش کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اگر کبھی دیکھتے ہیں تو بس' کتابی نظر سے' وہ زندگی سے کٹ چکے ہیں۔ اس لئے جن علوم کو وہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں' ان علوم میں اس بناء پر نہ تو خود میں کوئی زندگی کی رمق باقی ہے اور نہ وہ علوم پڑھانے اور پڑھنے والوں میں زندگی کی حرارت وتڑپ پیدا کر سکتے ہیں۔

تمہارے سیاستدان' بڑی بڑی اسکیمیں بناتے ہیں' لیکن ان کی نظر خاص طبقوں سے آگے نہیں بڑھتی' وہ قوم اور وطن کا نام لیتے ہیں' مذہب اور کلچر پر زور دیتے ہیں' لیکن ان کی قوم' وطن' مذہب اور کلچر کا تصور یا تو سرے سے موہوم ہے یا ان کا اطلاق ایک خاص طبقے کے اغراض اور مصالح پر ہوتا ہے۔ یہ لوگ صرف اپنے آپ کی طرف دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ زمانہ ان کے اشاروں پر سدا حرکت کرتا رہے گا اور لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان کی طرف ہی تکتے رہیں گے۔

قوم کے متوسط طبقے ہیں کہ وہ روزمرہ کی مادی ضرورتوں اور رسمی مذہب کے چند معمولات کے سوا جن سے انہیں تھوڑا بہت اطمینان مل جاتا ہے کسی اور چیز سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے' باقی رہے عوام' قوم کا غالب حصہ' قوم کے جسم کے ہاتھ اور پاؤں' ان کو تم نے ''عوام کالانعام'' کہہ کر صدیوں سے چوپاؤں کے درجہ پر رکھ چھوڑا ہے۔

تم نے اپنی ایک محدود دنیا بنا رکھی ہے۔ اس دنیا میں تم شاداں وفرحاں ہو اور کسی دوسرے طبقے' قوم اور فکر اور خیال کو خاطر میں نہیں لاتے' تمہیں ساون کے اندھے کی طرح

خیر سے اپنے اہل قلم ''مجدد دین'' اور ''اصحاب امر'' کے طفیل ہر طرف خزاں میں بھی ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ بہار کا عہد کبھی کا گزر چکا' تم خوش اعتقادی میں اپنے ہاں اب تک بہار ہی کا عمل دخل دیکھ رہے ہو۔

دنیا میں زلزلے آ رہے ہیں' لیکن تم گھروں کے اندر آنکھیں بند کئے بیٹھے ہو' زندگی کی قہرمانی قوتیں اپنی پوری شدت میں انسانیت کے بطن سے کوہ آتش فشاں کی طرح پھوٹ نکلی ہیں' ان کے ہاتھوں پرانی دنیا پر جو کچھ بھی گزرے کم ہے۔ جس آنے والے انقلاب کی میں تمہیں خبر دے رہا ہوں۔ میں یورپ کے ایک بڑے حصے میں اس انقلاب کو بروئے کار آتا دیکھ آیا ہوں' اس انقلاب نے اس سرزمین کی جس طرح کایا پلٹ کی اور غالب گروہ نے جس سفا کی سے اپنے حکمرانوں کو تہہ تیغ کیا' میں اس کے اسباب اور نتائج خوب سمجھ چکا ہوں' لیکن یہ انقلاب بس اسی ملک تک محدود نہیں رہے گا۔ یہ عالمگیر انقلاب ہے اور یہ ساری انسانیت کو ایک نہ ایک دن اپنی لپیٹ میں لے کر رہے گا۔ تم اس انقلاب کی قوت' وسعت' شدت اور سفا کی اپنی موجودہ زندگی میں محسوس تک نہیں کر سکتے' اس انقلاب کو قیامت سے کم نہ سمجھو' یقیناً یہ ایک حشر برپا کر کے رہے گا' تا کہ انسانیت کے لئے خدائے ذوالجلال کی طرف سے ایک نئے ''نشر'' کا سامان ہو سکے۔

ہوا یہ کہ انسانیت کی بڑی تعداد کو اب تک ایک گروہ نے دبائے رکھا یہ مختصر گروہ کُل قوت اور اقبال کا مالک تھا' انسانیت کی یہ بڑی تعداد کسان اور مزدور کماتے اور اوپر کا یہ مختصر گروہ ان کی کمائی کو اپنا حق سمجھتا رہا اور جو کماتے تھے ان کو کھانے کو نہ ملتا تھا اور جو ان کی کمائی پر رہتے تھے' وہ کمانا ''ذلت کا نشان سمجھتے تھے' نتیجہ یہ نکلا کہ کماؤ طبقے پسماندہ اور ذلیل ہوتے گئے اور کھاؤ طبقے دولت اور اقتدار کے نشے میں انسانی اخلاق سے گر گئے اور مجموعی طور پر ساری انسانیت کو گھن لگ گیا' غضب یہ ہوا کہ اس دور میں علم' لٹریچر اور مذہب کے جو

معیار بنے ان کے پیش نظر بھی بس اسی مختصر گروہ کی خوشنودی رہی۔ ان کے رویہ سے اگر سکون واطمینان ملتا تو زیادہ تر ان لوگوں کو، اور ذہن کو جلا ہوتی تو ان کی، تہذیب وتمدن کی برکتیں پھیلتیں، تو صرف ان کے گھروں یا محلوں تک جو مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے، کسانوں اور مزدوروں کو اتنی مشقت کرنی پڑتی کہ انہیں کسی بات کا بھی ہوش نہ رہتا، اور کبھی کبھار ان کے شعور کی آنکھیں کھل جاتیں، تو انہیں سلانے کے لئے خواب آور دواؤں کی کمی نہ تھی۔

زمانہ مدتوں اسی طرح چلتا گیا اور محنت کش طبقے نسل در نسل اپنے بھائیوں کے ہاتھوں سے یہی دکھ اٹھاتے رہے، لیکن ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آئی اور اس سے اپنے بندوں کی یہ بُری حالت زیادہ دیر نہ دیکھی گئی، چنانچہ انسانی ذہن کو یہ توفیق عطا ہوئی کہ وہ مشین ایجاد کرے، اس مشین سے صنعت وحرفت کا دور شروع ہوتا ہے، بے شک یہ دور بھی اپنے ساتھ بہت سی مصیبتیں لایا اور مشینوں کے چلانے والوں پر سالہا سال تک مشینوں کے مالکوں نے بڑے بڑے ستم توڑے، لیکن اب یہ مشینیں مزدوروں کے ہاتھوں میں ایک بے پناہ قوت کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ مزدور متحد اور منظم ہو رہے ہیں اور آگے چل کر یہ ہوگا کہ زمین پر کام کرنے والے کسان بھی ان کے ساتھ مل جائیں گے۔

یہ انقلاب جسے میں اپنی آنکھوں سے برسرِ کار دیکھ کر آیا ہوں۔ انسانیت کے ان پس ماندہ طبقوں کو للکار رہا ہے۔ کہ اٹھو! غاصبوں سے اپنا حق چھینو اور جو ظلم پر جی رہے ہیں انہیں نیست ونابود کر دو۔ اس انقلاب کا نعرہ یہ ہے کہ مزدورو! کسانو! محنت کشو! مستقبل تمہارا ہے، تم محنت کرتے ہو اور تمہاری محنت ہی کا نتیجہ ہیں، یہ سر بفلک عمارتیں، رزق کی یہ فراوانی، آرام وآرائش کے یہ ذرائع اور دنیا کی یہ ساری ثروت اور دولت تمہاری ہے، جس

سے تم اب تک محروم رکھے گئے ہو دراصل یہ کل متاع تمہاری ہے۔ اٹھو! اپنے آپ کو منظّم کرو آگے بڑھو اور جو تمہارا حق ہے اس پر قبضہ کرلو۔ اس میں جو شخص آڑے آئے اسے مٹا دو جو علم کلچر مذہب اور اخلاق تمہارا سدراہ ہو اس کا انکار کردو وہ علم ناقابل اعتبار ہے وہ کلچر بے کار اور فرسودہ ہے وہ مذہب غلط ہے'' اور اخلاق کا وہ نظام بے معنی ہے۔

اس انقلاب نے اپنا ایک فلسفہ بھی وضع کیا ہے۔ اس فلسفہ سے محنت کشوں کو ایک ایسا حربہ ہاتھ آ گیا ہے جس کا توڑ بڑے بڑوں سے بھی مشکل سے بن آتا ہے اس فلسفے کی نظری حیثیت جو کچھ بھی ہے وہ ہے ہی لیکن عملاً اس کا مقابلہ اس لئے بھی مشکل ہے کہ گو انقلاب کا یہ فلسفہ خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے لیکن اس کا دعویٰ اور کوشش یہ ہے کہ ساری کی ساری خلق خدا بغیر کسی رنگ نسل ملک یا مذہب کی تمیز کے آزادی مساوات اور اقتصادی خوشحالی کی نعمتوں سے یکساں فیض یاب ہو۔ یہ فلسفہ مظلوموں کو انصاف کی امید دلاتا ہے۔ اس سے ذلیل اور پس ماندہ انسان عزت اور اقبال کے خواب دیکھنے لگتے ہیں کم ہمتوں میں جرأت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور اتفاق یہ ہے کہ آج اس زمانے میں ان مظلوموں پس ماندوں اور کم ہمتوں ہی کی کثرت ہے اور خدا کی بیشتر مخلوق دکھوں اور روگوں ہی میں گرفتار ہے۔

لہٰذا اگر تم نے اپنے ملک کے تباہ حال اور بے کس طبقوں کی خبر نہ لی اور انہیں اسی حال میں رہنے دیا جس میں کہ وہ صدیوں سے جان توڑ محنت کر رہے ہیں اور تمہارے اوپر کے طبقے حسب سابق جونک بن کر ان کا خون چوستے رہے اور ان کو تم نے اب بھی اسی بھوک جہالت ذلت اور عفونت کی دلدلوں میں بدستور مرنے سڑنے دیا تو یاد رکھو کہ انقلاب کا یہ لادینی فلسفہ جو آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ تمہارے ملک کے ان بد نصیب طبقوں کو دوسرے ملکوں کی طرح تمہارا جانی دشمن بنا دے گا اور اگر تمہاری غفلت سے

ان کی دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی' تو اس کے شعلے تمہیں تو جلا کر خاک سیاہ کریں گے ہی' لیکن اس کے ساتھ تمہارے علم' کلچر اور مذہب کی بھی خیر نہ ہوگی۔

اس قسم کا انقلاب اور اس کے لادینی فلسفے کے ہولناک نتائج سے بچنا چاہتے ہو تو انقلاب کے کسی ایسے دینی فلسفے کو اختیار کرو جس کے ذریعے تم خدا کو مانتے ہوئے خدا کی مظلوم مخلوق کو خوش حال بنا سکو' انسانیت اب زیادہ دیر تک ظلم نہیں سہ سکتی' اس کا پیمانہء صبر لبریز ہو چکا ہے اگر لادینی فلسفہء انقلاب کے علمبردار اپنے بلند بانگ دعوٰی کے ساتھ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی کی دعوت دیتے ہیں تو تم ساری انسانیت کو ایک خدا کی مخلوق ماننے والے اور اسے ہر ذی روح کا رازق اور رب جاننے والے کوئی ایسا فکر کیوں پیش نہیں کرتے جس سے اس کی ساری مخلوق کی بھلائی ہو' ہر ظلم مٹ جائے' ہر حقدار کو اس کا حق ملے' ذلت و نکبت کا خاتمہ ہو اور کوئی بندہ اپنے رب کے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ کیا جا سکے اور جس طرح ایک خاندان کے سب افراد آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ اسی طرح مجموعی انسانیت' جس کی حیثیت فی الواقع ''عیال اللہ'' (اللہ کا کنبہ) کی ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے یکساں متمتع ہو۔

چنانچہ میں انقلاب کے اس قسم کے دینی فلسفے کا پیغام لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ انقلاب کا میرا یہ پیغام تمہیں لادینی انقلاب کے مضرت رساں اثرات سے محفوظ رکھ سکے گا۔ محنت کش طبقوں کے ہاتھ میں قوت اور اقتدار کا آنا یقینی ہے تم نے اگر محنت کشوں کے اس انقلاب کو دینی نہ بنایا تو پھر یہ انقلاب حتمی طور پر لادینی فلسفے کے ذریعے ہوگا!

مقالہ نمبر ۷

جمعیۃ علماءہند کے فرائض

(ایک غیر مطبوعہ تحریر)

اکتوبر ۱۹۳۹ء

پس منظر

[مارچ ۱۹۳۹ء میں حضرت سندھیؒ ہندوستان واپس تشریف لائے' تو حالات ایسے تھے کہ دورِ جدید کے سیاسی' اقتصادی اور فکری چیلنج پوری دنیا کو جھنجوڑ رہے تھے' اور سامراجی غلبہ نے اپنے مفادات پورا کرنے کیلئے نیا فلسفہ اور نئے نظام تشکیل دے لئے تھے' ایسے میں ضرورت تھی کہ وہ جماعت جس کے فکر و عمل کا تاریخی تسلسل انسانی خدمت' اور دینِ اسلام کے غلبہ کا تھا' دورِ جدید کے ان چیلنجز کا مقابلہ کرنے کیلئے نئی صف بندی کرے۔

اسی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت سندھیؒ نے ''جمعیتہ العلماء ہند'' کو زیادہ جامع اور ٹھوس انداز میں کام کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اور اسکے لئے یہ جامع تحریر لکھنا شروع کی۔ ہم تک یہ تحریر موجودہ شکل میں پہنچی ہے' اب یہ معلوم نہ ہوسکا کہ حضرت سندھیؒ ہی کسی وجہ سے اس کو مکمل نہ فرما سکے۔ یا اس کے آخری اوراق دست بُردِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔

اس تحریر کے اوّل آخر میں کہیں تاریخ تحریر بھی درج نہیں ہے لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان واپسی کے فوراً بعد کی یہ تحریر ہے۔ اور غالباً جمعیتہ علماء صوبہ بنگال کے خطبہ صدارت سے پہلے لکھی گئی ہے۔ اس تحریر کے آخری حصہ کے نہ ہونے سے جو تشنگی کا احساس ہوتا ہے' مذکورہ خطبہ صدارت کے مطالعہ سے وہ دُور ہو جاتا ہے۔

یہ غیر مطبوعہ تحریر ہمیں آپ کے عزیز ترین شاگردوں کے ذریعہ دستیاب ہوئی جو نذرِ قارئین ہے۔ آزاد]

بسمِ اللہِ الرّحمٰنِ الرّحیمِ

الحمد للّٰہ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

امابعد: جمعیہ علماء ہند میرے خیال میں مسلمانوں کی اجتماعی انقلابی مرکزی جماعت ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ:

۱- وہ صحیح تعلیم کی رہنمائی کرے۔

۲- تبدیلی حالات پر جو نتائج مرتب ہوتے ہیں اس پر علمی نقطۂ نظر سے احکام صادر کرے۔

۳- اس کی اپنی پارٹی سیاسی نمائندگی کے لیے قومی مجلس میں ہو۔

۴- اس کے اثر پھیلانے کے لیے ایک جماعت خدام خلق اللہ کے طرز کی اس کے تابع ہو۔

اسمبلی اور کونسل میں انتخابی مہمات میں سیدھا حصہ لینا اس کے فرائض میں داخل نہیں ہونا چاہیئے۔

(ا) امر اوّل کے متعلق میری سوچی ہوئی رائے ہے کہ اسے امام ولی اللہ دہلوی کے اصولی نظریہءفقہ، حدیث، تفسیر (افکار) وحکمۃ سے باہر نہیں جانا چاہیئے اس لیے اس خاص صنفِ علم کی مخالف کسی جماعت کو جمعیت علماء ہند میں داخل کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اسی لیے میں موجودہ نصابِ دار العلوم کا حامی ہوں اس سے استعداد پیدا ہوتی ہے کہ امام ولی اللہ کے معارف سمجھ میں آ سکیں۔ اَتباع امام الائمہ ولی اللہ (محدث دہلوی) میں امام عبدالعزیز اور مولانا رفیع الدینؒ ان کے بعد مولانا محمد اسمٰعیل شہید اور مولانا (شاہ) محمد اسحاقؒ ان کے بعد مولانا محمد قاسم (نانوتوی) اور مولانا رشید احمد (گنگوہیؒ) اس جماعت کے امام مانے جاسکتے ہیں۔

موجودہ نصاب تعلیم فقط استعداد پیدا کرتا ہے۔ تحقیق نہیں سکھاتا صرف صحاح ستہ کا درس، علم حدیث کا وہ خصوصی درس ہے جس سے متوسط درجے کی علمی لیاقت پیدا ہو جاتی ہے اس کے علاوہ باقی کتابیں کسی خاص علم کی تحقیق نہیں سکھلاتیں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ تحقیق فنون کے لیے تکمیلی مدارج کھولنے چاہئیں مگر یہ مرکزی استعداد کا نصاب حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ کتابوں کے اضافہ سے مکمل کیا جائے۔ اسے چھوڑ دینا بالکل ناجائز ہے۔

آج کل عربی زبان خود یورپین سائنس کی نقل کا آلہ بن رہی ہے۔ نئی عربی کے نام سے اس نصاب میں ترمیم کرنا اور بالآخر یورپ کی سائنس، عربی میں سکھلانا کوئی بہت بڑا کمال نہیں، ہندوستانیوں کے لیے آسانی اسی میں رہے گی کہ جب تک اردو اتنی ترقی نہیں کرتی کہ تمام فنون عصریہ کے لیے ذریعۂ تعلیم بن سکے۔ اس وقت تک انگریزی پڑھ کر سائینس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ عربی کو اس کا ذریعہ بنانا تقلید در تقلید اور ناقص کو کامل سمجھنے کا مغالطہ پیدا کرے گا۔

ہم کو امام ولی اللہ کی حدیث وفقہ میں جس قدر ضرورت ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ میرا تجربہ اس کی رہبری کرتا ہے کہ یورپ کا فلسفہ اور سیاست سمجھنے کے لیے، یا اس کے زہر آلودہ اثر سے بچنے کے لیے یا اپنی قومی اور مذہبی خودی برقرار رکھنے کے لیے بھی امام ولی اللہ کی کتابیں بے حد ضروری ہیں۔

موجودہ نصاب چونکہ ان کے لیے امدادیہ اسکول کا مرتبہ رکھتا ہے اس لیے اسے اسی شکل میں قائم رہنا ضروری ہے۔ آج کل عربی مضامین لکھنے یا عربی بولنے کے لیے نئی عربی ایک مستقل مضمون کے طور پر سکھلائی جاسکتی ہے اس کو علوم حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا۔

۱۔ فنونِ عصریہ کی تعلیم انگریزی اور اس کے بعد اردو کے ذریعے حاصل کرنی چاہیے۔ فلسفہ، سائنس، سیاست کے لیے بھی دار العلوم میں مستقل شعبے کھول دیے جائیں۔

۲۔ دوسرے مقصد کے لیے امام ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ اقتصادیات ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کی تکمیل کے لیے فلسفہ الہیات بھی ساتھ رہے۔

۳۔ تیسرے مقصد کے حاصل کرنے کے (سلسلے میں) میری رائے میں ایک مستقل نیشنل پارٹی کانگریس کے اندر ہونی چاہیے۔

۴۔ عام طلبہ کو خدمتِ خلق سکھلانا اور جمعیت علما کے معاونین پیدا کرنا ان کا کام ہوگا۔

(۲) دوسرا اہم مسئلہ اجتماعی انقلاب کی رہنمائی کا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ اسلام عمومی انٹرنیشنل انقلاب کا دوسرا نام ہے، مگر اس انقلاب کے شارحین مختلف ذہنیتیں رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض فلاسفر اسلامی اصول اور مسلم ذہنیت سے متناقض مانے جاتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ہیگل فلاسفی کے اتباع میں کارل مارکس کا انقلابی اقتصادی فلسفہ تمام عالم میں شائع ہو رہا ہے اس کے اتباع میں کامریڈ لینن نے ماسکو میں ایک عالم گیر انقلاب کا مرکز پیدا کر دیا۔

اب جمعیت علمائے ہند جیسی جماعت کو میں زور سے دعوت دیتا ہوں کہ وہ امام الائمہ (شاہ) ولی اللہ دہلوی کے فلسفے پر استقلالی نظر ڈالے اور اپنے مدارس اور مجالس میں اس کو رواج دے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے متعدد ابواب میں اقتصادی فلسفے کے تمام اصول بالوضاحت تحریر کر دیے گئے ہیں ''ازالۃ الخفاء'' اور ''بدورِ بازغہ'' میں ان کی تشریح موجود ہے اگر وہ عبارتیں نقل کی جائیں تو ایک مستقل رسالہ بن جائے گا جو کسی وقت آپ کے سامنے آنا چاہیے۔........(ناقص الآخر)

مقالہ نمبر ۸

خطبہ صدارت

جمعیت علمائے صوبہ بنگال کے اجلاس منعقدہ
کلکتہ میں ۳ جون ۱۹۳۹ء کو پڑھا گیا

پس منظر

[حضرت سندھیؒ ۷۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو کراچی کے ساحل پر اُترے۔ پورے ملک میں آپ کا زبردست استقبال ہوا، جمعیت علماء ہند، مجلس احرار اسلامؒ وغیرہ تمام سیاسی جماعتوں نے تہنیتی اجتماعات منعقد کیے۔

آپ کی واپسی کے بعد پہلا باقاعدہ سیاسی اجتماع جمعیۃ علماء صوبہ بنگال نے ۳۔ جون ۱۹۳۹ء کو کلکتہ میں کیا۔ اور اس اجلاس کی صدارت کیلئے حضرت سندھیؒ کا نام تجویز ہوا۔

آپ نے اس موقع پر اپنے فکر و عمل اور تجربہ و مشاہدہ کے بنیادی نکات قوم کے سامنے رکھ دیئے۔ خاص طور پر جمعیۃ علماء ہند کا بنیادی کردار کیا ہونا چاہیئے اور اسے کس سلیقہ و ترتیب سے دین کی سمجھ اور اس کے غلبہ کا کام کرنا چاہیئے۔ حضرت سندھیؒ نے اسے بڑی خوبصورتی سے واضح کر دیا۔ معروضی حقائق و واقعات کو سامنے رکھ کر دینی افکار کی بہتر سمجھ کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا۔ آزاد]

خطبہء صدارت

اجلاس جمعیۃ علماء بنگال

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفے !

امّا بعد۔ مسلمانانِ ہند نے اس زمانہ میں اپنے اجتماع کی مختلف شکلیں بنا رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک خاص اجتماع جمعیۃ علماء ہند ہے۔ اس خاص صورت کی ابتدا کیسے ہوئی اور کس طرح یہ جمعیۃ آج تک اپنی ہستی کا ثبوت دیتی رہی۔ اس کی تاریخ سے آپ حضرات اس قدر واقف ہیں، جس پر میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔

اسی قسم کے اجتماع کی ایک دوسری صورت اس سے پہلے ظاہر ہو چکی ہے جسے جمعیۃ الانصار کہا جاتا تھا۔ اب سنتا ہوں کہ یہ نام کسی دوسرے اجتماع نے اپنے لیے پسند کر لیا ہے۔ لیکن میری نظر میں اسی نوعیت کے اس اجتماع کا عام پسندیدہ نام جمعیۃ علماء ہند ہے۔

اس سے پہلے اجتماع سے میرا خصوصی تعلق تھا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہٗ العزیز و اعلی اللہ فی العالمین مقامہٗ کے خدام کے ساتھ میں بھی شریک عمل رہا ہوں۔ اس قسم کے اجتماع میں شکل و صورت کے بدلنے کا اصل مقصد پر زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے میں اس اجتماع کے مطمح نظر سے اجنبی نہیں ہوں۔

میں نے حضرت شیخ الہند کے حکم سے ۴ شوال ۱۳۳۳ھ کو ہندوستان چھوڑا۔ اور حضرت مولانا حسین احمد مدظلہ کی خواہش پر اوائل ۱۳۵۸ھ میں واپس آیا۔ اس عرصہ میں ایسے حالات سے دوچار ہوتا رہا ہوں کہ کبھی موت کے منہ میں جا کر بچ نکلا۔ اور کبھی غلبہء

یاس کے بُرے اثرات سے بچنے لیے ایسی جماعتوں سے متحد ہو کر کام کرنے کے بارے میں سوچتا رہا، جن سے بحالت اطمینان شاید معمولی طور پر ملنا بھی جائز نہ سمجھتا۔

یہاں پر مثنوی کے چند اشعار لکھ دوں۔ تو میری کیفیت زیادہ وضاحت سے سمجھ میں آسکے گی۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت خوشحالاں وبدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من — وز درون من نجُست اسرار من
سّر من از نالہء من دور نیست — لیک گوش وچشم را آن نور نیست

ترجمہ: (۱) میں نے ہر طرح کے لوگوں سے فریاد کی۔ امیروں کی محفلوں میں بھی پہنچا۔ غریبوں کے ساتھ بھی بیٹھا۔

(۲) ہر شخص نے اپنی ذہنی سطح کے مطابق میری باتوں کو پسند کیا۔ لیکن میرے بنیادی مقصد کو کوئی نہ سمجھ سکا۔

(۳) میرے دل کی بات وہی ہے جو میں زبان سے کہہ رہا ہوں۔ لیکن اکثر لوگ اسے سمجھ نہیں رہے۔

اس بیان میں مَیں اپنے خاص دوستوں کو دعوت دے رہا ہوں کہ وہ ہمارے شخصی حالات کُرید کُرید کر معلوم کریں۔ ان فی ذلک عبرة لاولی الالباب (اس میں اہل دانش کے لئے بڑی عبرت ہے)۔

مجھے وطن آنے کی اجازت ملی۔ میں اسے رحمت الٰہی کا خاص کرشمہ مانتا ہوں۔ آہستہ آہستہ میرے دماغ سے وحشت دور ہو رہی ہے۔ واپسی کی امید منقطع ہونے یا قریب انقطاع پہنچنے سے بہت برے اثرات دل و دماغ پر حاوی ہو رہے تھے۔ رحمت الٰہی نے اس مشکل میں دست گیری فرمائی اور اس نا قابل برداشت مصیبت سے نجات ملی۔ احمد ربی

علیٰ ذلک حمد الشاکرین ! (میں اس مہربانی پر خداوند تعالیٰ کا شکر گذار ہوں)۔

میرے بعض محترم دوست یہ بھی خیال کرتے رہے اور انھیں اس پر اصرار تھا کہ مجھے واپس نہیں آنا چاہیے۔ غالباً وہ ایسے اوہام میں مبتلا تھے کہ میں آزاد زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اس لیے یہاں کی غلامی میں آ کر گھیرا جاؤں گا۔ اس وہم نے ان کے دماغ میں مختلف شکلیں اختیار کر لی تھیں مگر میں نے اسے سختی سے ناپسند کیا۔ میری اس سرگزشت کا معاملہ ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔

کجا دانند حالِ ما، سبکسارانِ ساحلہا

ترجمہ: یہ ساحل سمندر پر کھڑے ہو کر موجوں کا تماشہ دیکھنے والے ہم طوفان میں پھنسے ہوؤں کا حال کیا جانیں۔

پھر میں اللہ رب العزت کا شکر کرتا ہوں کہ ساحل پر قدم رکھنے کے وقت سے آج تک میں نے ڈرانے والوں کے اوہام کا کوئی اثر نہیں دیکھا۔ فللّٰہ الحمد اولاً و آخراً۔

محسنین کا شکریہ

"لم یشکر اللہ من لم یشکر الناس" کے اصول پر آپ مجھے اجازت دیں کہ جن لوگوں نے میری واپسی کے لیے سعی کی ہے ان کا شکریہ ادا کروں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے میرے محترم دوست چودھری غلام رسول مہر اور میرے قدیم مہربان سر عبداللہ ہارون نے میرے لیے کوشش شروع کی۔ وہ تحریک اس وقت بعض عارضی وجوہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ مگر کوشش کرنے والوں کی داد نہ دینا ایک طرح کی پست ہمتی اور کفرانِ نعمت ہے اس لیے میں اس اجلاس میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔ جزاھم اللہ احسن الجزا۔

دوسری دفعہ اس تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں چلایا۔ اور میرے دوستوں نے ہند کے ہر گوشہ سے تائید کی جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ گورنمنٹ ہند نے مجھے واپسی کی اجازت دی۔ اس تحریک کی تائید میں ہر ہندوستانی نے حصہ لیا' مسلکِ سیاسی کے اختلاف کا ان پر کوئی اثر نہیں آیا۔ پھر بھی مجھ سے خصوصی تعلق رکھنے والی جماعتیں مثلاً دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کی شاخیں اور سندھ کی سیاسی اور غیر سیاسی جماعتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس اجازت کے مسئلہ کو اگر بہ نظرِ عمیق دیکھا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس فیصلہ میں ہز امپیریل میجسٹی کے وزیر ہند کی فوری منظوری حاصل کی گئی ہے اور یہ بھی صاف طور پر سامنے آجائے گا کہ اگر سندھ گورنمنٹ اپنی ضمانت نہ پیش کرتی تو یہ معاملہ شاید صورت پذیر ہی نہ ہوتا۔ ذرا آگے دیکھا جائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ سندھ گورنمنٹ کو اس ضمانت پر تیار کرنے کے لیے برطانوی وزارت مختار مقیم جدہ اور اس کے معاون انڈین وائس قونصل نے خاص حصہ لیا ہو۔

اس لیے میں (۱) ہز امپیریل میجسٹی اور برٹش کیبنٹ (۲) پھر ہز ایکسی لینسی وائسرائے اور انڈین گورنمنٹ (۳) پھر ہز ایکسلینسی گورنر سندھ اور اس کی گورنمنٹ کے معزز اراکین مثل سر غلام حسین ہدایت اللہ (۴) پھر برٹش قائم مقام جدّہ اور اپنے محترم دوست سید لال شاہ انڈین وائس قونصل جدہ کا صمیم دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اسی طرح اس کے ساتھ ساتھ بلکہ ایک حیثیت سے پہلے اپنے وطن کے بہت بڑے فلاسفر مہاتما گاندھی اور اپنی قومی جماعت انڈین نیشنل کانگریس جس کا میں سولہ سال سے ممبر ہوں۔ اور اپنی بیرونی زندگی میں اس کے لیے خاص طور پر کام کرتا رہا ہوں۔ اور کانگریس کے سرکردہ ممبروں کا عموماً اور اپنے معزز دوست شری یت برج لال بیانی ممبر کونسل

آف سٹیٹ اور ڈاکٹر چوئتھ رام سابق پریزیڈنٹ سندھ کانگریس کمیٹی کا خصوصاً اور پھر عام مسلمانوں کی جماعتوں کا اور عام ہندوستانیوں کا شکریہ اسی قدر صمیم قلب سے ادا کرتا ہوں۔

جن حضرات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں' ان کی یہ ترتیب فقط ظاہری حیثیت سے ہے۔ یہاں میں اس کے بطن کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس معنوی لحاظ سے سب سے پہلے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ العالی کا نام آتا ہے۔ جو میرے استاد شیخ الہند قدس سرہ' کے قائم مقام یعنی ثانی شیخ الہند ہیں۔ اگر مولانا حسین احمد میری واپسی کی خواہش ظاہر نہ کرتے تو میں بہ مشکل اس امر پر راضی ہوتا کہ گورنمنٹ ہند سے واپسی میں سہولت پہنچانے کے لیے درخواست کروں۔

میری نظر میں اس درخواست کو بھیجنے کی کیوں ضرورت تھی۔ اس کی وضاحت کے لیے میں چند فقرات عرض کرتا ہوں۔

میرے خیال میں جب تک میرے محترم رفیق مولانا منصور انصاری مقیم کابل اور میرے محترم دوست راجہ مہندر پرتاب اسی طرح کی درخواست گورنمنٹ ہند کی خدمت میں نہیں بھیجیں گے۔ نیز مہاتما جی کے مسئلہ عدم تشدد کی پابندی کا یقین نہیں دلائیں گے۔ اور اس کے ساتھ اپنے فیصلے سے میری طرح بیرونی تحریکات سے قطع تعلق نہیں کر لیں گے۔ اس وقت تک گورنمنٹ ہند کسی معاملہ میں نظر ثانی کرنا منظور نہیں کرے گی۔

آپ کا اس قدر وقت لینے کی معافی چاہتا ہوں۔ اور اس شکریہ کی داستان کو ختم کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ میں اس سے غافل نہیں ہوں کہ بہت سے میرے خیر خواہ دوست میرے اس قدر طولانی شکریہ کو خوش گواری سے نہیں سنیں گے۔ مگر میرا ادائے فرض پر مجبور ہونا ان کو تلخ باتیں سنانا ہے۔ میں ان حضرات سے دوبارہ معافی مانگتا ہوں۔ اور آگے چلتا ہوں۔

حضرات! میں اپنے فیصلہ سے کابل نہیں گیا تھا۔ مجھے حضرت مولانا شیخ الہند کا ناقابل تنسیخ حکم ملا۔ اور میرے رفقاء کی مرکزی جماعت نے بھی یہی فیصلہ کیا۔ میں اللہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے تعمیل حکم کی توفیق بخشی۔

میرا ارادہ نہیں تھا کہ میں برطانوی گورنمنٹ کے زیر سایہ پھر اس ملک میں آؤں گا۔ اس لیے کہ دارالسلطنت کابل میں مجھ پر فوق العادت اعتماد کیا گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کے فیصلہ سے کابل چھوڑنا پڑا۔

اور اس کے بعد میں سویٹ رشیا میں عارضی قیام کے لیے مجبور ہوا۔ ہماری سمجھ میں ہمارے ترکِ وطن کو اس سے پہلے اگر ھجرت کے مقدس نام سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ تو جیحوں عبور کرنے کے بعد وہ حیثیت ختم ہوگئی۔

اب میں اس حالت میں ہوں کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے

فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ "(يتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلّهم يحذرون) (ترجمہ: سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ تاکہ دین میں سمجھ پیدا کریں اور جب اپنی قوم کی طرف لوٹ کر آئیں تو انہیں اس کی خبر پہنچائیں، تاکہ وہ غلط باتوں سے بچتے رہیں)..................................

میرا فرض اس صورت میں فقط اس قدر ہے کہ میں اپنی معلومات اپنی جماعت کے سامنے پیش کروں۔ اور اگر وہ مناسب سمجھیں۔ تو اس سے فائدہ اٹھائیں۔

اس موقع پر میں جمعیۃ علمائے بنگال کا خاص شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے میرے لیے ایسا موقع بہم پہنچایا۔ جہاں سے میں اپنے اجمالی خیالات اپنی قوم اور ملک کے سامنے پیش کروں۔

حضرات! میں ایسے زمانہ میں ہند سے باہر رہا ہوں، جسے دورِ انقلاب کہنا چاہیئے۔

بڑی بڑی سلطنتیں فنا کے گھاٹ اتاری جارہی تھیں۔ ان کہ جگہ پر قوم کے بہادر مردوں کا جو دستہ عمر بھر مصیبتوں میں مبتلا رہا، اب پارٹی پالیٹیکس کے اصول پر اپنی مختصر جماعت کے زور پر نئی حکومتیں بنا رہا تھا۔ ایسے زمانے میں نئے اور پرانے چوٹی کے سیاسیین سے استفادہ کا موقع ملتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اس عالمگیر انقلاب کی حقیقت اور اس کے اساسی اسرار سمجھنے کے قابل ہو گئے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ میں کوئی یوروپین زبان نہیں جانتا۔ اس لیے اس استفادہ میں اپنے نوجوان دوستوں کی امداد کا شکر گزار ہوں۔ میرے یہ نوجوان دوست ہندوستانی تھے۔ یعنی ہندو اور مسلمان اور نیشنلسٹ اور سوشلسٹ کا کوئی فرق ان کے سامنے نہیں تھا۔ میں بنگال کا خاص شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرے محترم دوست پنڈت شب (شیو) ناتھ بینرجی بھی ان نوجوانوں کی فہرست میں شامل تھے۔

حضرات! جب کہ ہم اس عالمگیر انقلاب کی حقیقت سے آشنا ہو گئے تو اس کے بعد میں اس سے زیادہ اپنے وطن وملت کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا کہ انھیں یقین دلانے کی کوشش کروں کہ ہندوستان کا اس عالمگیر انقلاب سے متاثر نہ ہونا غیر ممکن ہے۔ اور ان جماعتوں کو جو مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں، ایسے طریقے بتلاؤں جس سے وہ نقصان کے مقابلے میں زیادہ نفع حاصل کر سکیں۔

اس وقت میں اپنے بیان کے 'اجمالی عنوانات' کا ذکر کرتا ہوں۔ میں جب سے ساحل ہند پر اترا، مجھے آرام کا کوئی موقع نہیں ملا۔ میرے طبعی ضعف اور سفر کا تقاضہ ہے کہ اس وقت میں اپنے افکار کو دل کش صورت میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہو سکا۔ اگر مجھے اچھی فرصت ملی تو میں زیادہ مدلل اور واضح شکل میں اپنے افکار آپ کو سناؤں گا۔ مگر اس وقت اس سے زیادہ کی توقع مجھ جیسے عاجز سے نہیں چاہیے۔

(اجمالی عنوانات)

ا۔(یورپین اصول پر نیشنلزم کی ترقی)

اگر میرا وطن اس انقلاب کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے تو اسے یورپین اصول پر نیشنلزم کو ترقی دینا چاہیئے۔ پچھلے زمانہ میں ہمارا ملک جس قدر نامدار رہا ہے، اسے دنیا جانتی ہے مگر اس سے ہم کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، جب تک ہم آج کی قوموں میں اپنا وقار ثابت نہ کرسکیں۔ جاننا چاہیئے کہ یہ انقلاب نئی صورت میں پیدا ہو رہا ہے۔ جس میں یورپ کی دوصد سالہ ترقی کام کررہی ہے اور اس سے ہمارے عوام قطعاً ناواقف ہیں۔

(یورپی فکر کا مدار)

ہماری ہندوستانی تہذیب کا عہد قدیم جو 'ہندو تہذیب' کہلاتا ہے اور عہد جدید جسے 'اسلامی تہذیب' سمجھا جاتا ہے۔ دونوں مذہبی اسکول ہیں۔ اور آج کل کا یورپین اسکول مذہب سے قطعاً نابلد ہے۔ اس کا مدار فقط 'سائنس اور فلسفہ' پر ہے۔ اسی لیے ہمارے وطن میں اگر اس انقلاب کے سمجھنے کی استعداد پیدا نہیں ہوئی تو سر بسر نقصان ہی نقصان ہمارے حصہ میں آئے گا۔

۲۔(انڈین نیشنل کانگرس کی سیاسی اہمیت)

اس (نیشنلزم کی ترقی کے) مقصد کی تکمیل میرے خیال میں اس صورت کے سوا ہو ہی نہیں سکتی کہ انڈین نیشنل کانگریس کو تمام سیاسیات ہند کا مرکز بنادیا جائے۔

مجھے افسوس ہے کہ میرے محترم دوستوں کا نوّے فی صدی حصہ مسلم لیگ میں شامل ہے۔ اور وہ یہ امید رکھتے ہیں کہ دنیا لیگ کو کانگریس کے برابر مان لے گی۔ اس لیے وہ پراپیگنڈہ پارٹیاں اندرون اور بیرونِ ملک بھیجنے کی تیاری کررہے ہیں۔ میں انھیں اس حقیقت سے آشنا کرنا چاہتا ہوں کہ جب سے برطانوی گورنمنٹ نے 'منٹو مارلے اسکیم اصلاحات' کے مقدمہ میں انڈین نیشنل کانگریس کا ذکر کر دیا۔ اسی وقت سے دنیا گورنمنٹ آف انڈیا کے بعد نیشنل کانگریس کو جانتی ہے۔ اس کے بعد خلافت کے دور میں جس زور سے نان کو آپریشن عمل میں آیا۔ اس نے بھی ملک کی طاقت انڈین نیشنل کانگریس کو تسلیم کرانے میں مدد دی۔ اس قدر گہرے اثرات کی موجودگی میں وہ لوگ ملک کو دھوکا دینا چاہتے ہیں جو لیگ کو کانگریس کے برابر کر کے دکھلائیں گے۔ میں اپنے دوستوں کی نیت اور خلوص پر کوئی حملہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں اپنے ملک کو ناواقف نہیں رہنے دوں گا۔ اور ان کو حقائق سے جاہل رکھ کر کسی کو فائدہ حاصل کرنے نہیں دوں گا۔

اس لیے میں سفارش کرتا ہوں کہ نیشنل کانگریس کے کرتا دھرتا یورپین نیشنلزم کو رواج دینا اپنا نصب العین بنائیں۔ وہ فقط اقتصادی ترقی کو آزادی کی بنیاد قرار دیں۔

ہمارے ملک کے محترم فلاسفر مہاتما گاندھی کی خصوصیاتِ طبعی اور اس کے ارتجاعی میلان کو قوم کا دستور العمل بنانے کی کوشش نہ کریں۔ میں مہاتما جی کا نان وائیلنس کے پولٹیکل پروگرام میں اعلیٰ درجہ پر احترام کرتا ہوں۔ مگر ان کے میلان خاطر یا ان کے فلسفہ

سے پورا متفق نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس مطمع نظر سے بے التفاقی برتنے کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری وطنی تحریک سے اولاً مولانا شوکت علی مرحوم اور ان کے ساتھی اور ثانیاً محترم سو بھاش بابو اور اس کے رفیق غیر مطمئن ہو گئے۔

یورپ نے مذہب کا استعمال سیاسیات میں چھوڑ دیا ہے۔ لیکن فلسفہ کو اساس اجتماع بنانے کے لیے مجبور ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک کے ہندو اور مسلمان اور سکھ وغیرہ طوائف میں ایسے عالموں کی کمی نہیں کہ وہ اپنی مذہبی روح (یعنی فلسفہ) سے یورپین اقتصادیات کو تطبیق دے لیں۔ اس سے وہ عوام کو جلدی بیدار کر سکیں گے۔ مگر مذہبی مراسم کو نیشنل تحریک کا جزو بنانا خواہ کسی نیک نیتی سے ہو، ملک کو تباہی سے نجات نہیں دلائے گا۔

۳۔ (جمعیۃ علماء ہند کو انقلابی جماعت بنانے کی اہمیت)

میں جمعیۃ علماء ہند کو ایک اول درجہ کی انقلابی جماعت بنانے کا مشورہ دوں گا۔ اس لیے ضروری ہوگا کہ وہ اسلام کے شارحین میں سے ہر ایک فریق کی اطاعت نہ کریں۔ کسی غیر انقلابی پر اعتماد نہ کریں، جب تک اس کی مذہبی معلومات اور اس کا طرزِ زندگی قابل اطمینان نہ ثابت ہو چکا ہو۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے میں اپنا امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو بنا چکا ہوں، جو اپنی انقلابی سیاست میں اسلام کی صورت اور معنی کا کامل محافظ ہے۔

یورپین انقلابی اس امام کے نظریات سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ اور اسلامی علوم و فنون، فقہ و حدیث، تفسیر و تصوف و حکمت میں اس کی امامت مسلّم ہے۔ اگر ہم اس کی سیاسیات کی توضیح کر سکے تو جمعیۃ علمائے ہند یورپ کے انقلاب کو سمجھنے اور چلانے کی اہلیت آسانی سے پیدا کر سکے گی۔

۴۔(برٹش گورنمنٹ کے دوسو سالہ عہد سے استفادہ)

میں سفارش کرتا ہوں کہ ہمارے اکابر مذہب وملّت و وطن، برٹش گورنمنٹ کے دو صد سالہ عہد سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی کوشش کریں۔ جس طرح ہم نے یورپ سے تنفّر (نفرت) برت کر اپنی ترقی کو محدود کرلیا ہے۔ اسے اب خیر باد کہیں۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ ہمارے کاشتکار اور مزدور کا معیارِ زندگی بھی یورپ کے باشندوں سے کم نہ رہے اور ملکی ترقی کرنے والی پارٹیاں اس کو اپنا نصب العین بنائیں۔

۵۔(معاشرتی انقلاب کی ضرورت)

میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے انٹرنیشنل اجتماعات میں ہمارا وطن ایک معزز ممبر مانا جائے۔ اس کے لیے ہمیں اپنی معاشرت میں انقلاب کی ضرورت ہوگی۔

میں کسی آل انڈیا تحریک شروع کرنے کے لیے اپنی طبیعت میں عملی استعداد نہیں دیکھتا۔ اس لیے سندھ میں بطور نمونہ اس کام کو شروع کروں گا۔ جو انقلاب مَیں پیدا کرنا چاہتا ہوں اس کی چند مثالیں سناتا ہوں۔

(الف) سندھی زبان جسے ہر ایک سندھی اپنی مادری زبان کی حیثیت میں بولتا ہے رومن حروف میں لکھے گا۔ اس سے ٹائپ رائٹر سے استفادہ کا جلدی موقع ملے گا۔ اور یورپ کے لوگ ہماری زبان آسانی سے سیکھ سکیں گے۔

(ب) سندھی اپنے وطن کا بنا ہوا کپڑا پہنے گا۔ مگر وہ کوٹ وپتلون کی شکل میں ہوگا یا کالر دار قمیض اور نکر کی صورت میں۔ مسلمان اپنے نکر گھٹنے سے

نیچے تک استعمال کر سکتے ہیں۔ ہیٹ دونوں صورتوں میں بے تکلف استعمال کرے گا۔

(ج) ہم نے افغانستان میں دیکھا ہے کہ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خان نے سپاہیوں کو بوٹ سمیت نماز پڑھنے کا حکم دے رکھا تھا۔ اس سے وہاں کے عوام مسجد کے دروازہ پر فقہی قاعدہ کے مطابق بوٹ صاف کر کے مسجد میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ سندھی عوام اس پر عمل کریں گے۔

۶۔ (جمعیۃ علماء ہند کے دو سیکشن ہوں)

میں کوشش کروں گا کہ جمعیۃ علماء ہند کے دو حصے کر دیئے جائیں۔

پہلا حصہ مسلمانوں کے علوم کا محافظ ہو۔ تمام دینی مدارس اور تبلیغ کے ادارے اس سیکشن کو رہنما بنائیں۔ اس صنف کے اہل علم کے لیے میں اپنا تجربہ اور اپنی سوچی سمجھی ہوئی رائے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ غور وفکر اور فیصلہ میں مدد دے سکوں۔

ہند کے مسلمانوں کو دینی تعلیم دینے کے تین درجہ ہیں:۔

(الف) پہلا درجہ:۔ یہ ہے کہ مقامی زبانوں میں دینی اصول عوام کے سامنے پیش کئے جائیں۔ یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ کسی قوم کی عمومی تعلیم اس کی مادری زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں ناممکن ہے۔ اس لیے جمعیۃ کے لیے ضروری ہے کہ ہند کی ہر ایک قوم کو (جو ایک مستقل زبان بولتے ہوں۔ جیسے سندھی۔ پشتون۔ کشمیری۔ بنگالی) اس کی زبان میں اسلام کے پانچ ابتدائی تعلیمات سکھلانے پر اکتفا نہ کرے۔ بلکہ قرآن عظیم کی منتخب سورتوں کا ترجمہ اور حکیمانہ

تفسیر سکھا کران کو اعلیٰ مقاصد دین سے بھی آشنا کردے۔

یہاں ضمنی طور پر ایک مسئلہ کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کی زبانیں عام طور پر عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لیے ہر ایک حرف تہجی مختلف صورتوں میں لکھنا پڑتا ہے۔ کاروباری عوام کے لیے اس رسم الخط کا سیکھنا آسان نہیں۔ ان کے لیے خاص طور پر مقطع حروف کا ایسا رسم الخط ایجاد کرنا ضروری ہے۔ جو اعراب و علامات وقفہ کی اصلاح کے بعد تمام ممالک میں رواج پذیر ہوسکتا ہے۔ وہ بہترین رسم الخط ہوگا۔ اور افغانستان، ترکستان، ایران اور عربی ممالک میں شائع ہوسکتا ہے۔

(ب) دوسرا درجہ :- ہندوستانی مسلمانوں کو دوسرے درجہ پر اُردو کے ذریعہ سے اسلامی تعلیم دینا جمعیۃ علماء ہند کا اہم کام ہے۔ اس درجہ پر فارسی اخلاق وتصوف کی کتابیں اور ابتدائی عربی سکھانا بھی ضروری ہوگا۔

تنبیہ: میں یہاں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اردو اچھی طرح کوئی نہیں لکھ سکتا۔ جب تک وہ گلستان، بوستان اور کافیہ تک پڑھا ہوا نہ ہو۔ اس لیے اردو سیکھنے والوں کو تھوڑی سی فارسی گرامر اور ادب جاننا ضروی ہے اور میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی اس زبان میں بین الملّی زبان بننے کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔ اس لیے زبان دان علماء کا فرض ہے کہ اس زبان کو سیکھنے کی تمام ضروریات ایک کتاب میں جمع کر دیں۔ تاکہ مختلف اقوام کو اس زبان سیکھنے میں آسانی ہو۔

اردو میں قرآن عظیم کی تفسیر، حدیث و فقہ و تاریخ وتصوف کے اعلیٰ مضامین مسلمانان ہند کو مشترک طریقہ سے سکھلائے جائیں۔ اور میں ان دینی خادموں کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔ جنھوں نے قرآن کا پہلے اردو ترجمہ کیا۔ مشکوٰۃ، مشارق الانوار، درمختار اور احیاء العلوم جیسی کتابوں کا گزشتہ صدی میں ترجمہ کر دیا۔

(ج) تیسرا درجہ:- تیسرے درجے پر دینی تعلیم عربی زبان کے ذریعہ سے ہو۔ دارالعلوم دیوبند کا عربی نصاب ہند کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے فقہ و حدیث وتفسیر و فلسفہ وعلم کلام کو سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے دینی علوم کا تکمیلی نصاب سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے۔

اس کے بعد اس صنفِ علماء کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ تکمیل علوم دینیہ کے دارالتکمیل کھولیں۔ دارالعلوم دیوبند میں فقط علم حدیث کی تعلیم ایک حد تک تحقیقی اور تکمیلی ہوتی رہی ہے۔ باقی فنون درجہء اعدادیہ سے آگے نہیں بڑھے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے اور جمعیۃ الانصار نے اسے قبول کرلیا تھا کہ دارالتکمیل میں امام ولی اللہ کی کتابیں پڑھائی جائیں۔ آج میں اس کی تصریح کرنے کے لیے آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ کہ امام ولی اللہ دہلوی کی حدیث وفقہ میں جس قدر ضرورت ہے۔ اس سے زیادہ ہم ان کی حکمت وفلسفہ وسیاست سمجھنے کے محتاج ہیں۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ یورپ کا فلسفہ سمجھنے کے لیے اور انقلابی سیاست پر قابلیت سے غور کرنے کے لیے یا اپنی قومی اور مذہبی خودی قائم رکھنے کے لیے اس امام کی کتابوں کی بے حد ضرورت ہے۔ اس کا جبر (بدل) کوئی دوسرا مصنف نہیں کرسکتا۔

میں سفارش کرتا ہوں کہ تفسیر میں فتح الرحمٰن اگر چہ فارسی ترجمہ ہے، ضرور پڑھایا جائے۔ وہ اس قدر فوائد پر مشتمل ہے کہ کوئی تفسیر اس کا بدل نہیں ہوسکتی۔ نحوی عالموں نے جس طرح عربی گرامر کا بے جا استعمال کر کے قرآن کو سمجھنے میں تشکیک پیدا کر دی ہے، فتح الرحمٰن اس سے نجات دلاتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا، اردو کی حفاظت کے لیے فارسی کی ضرورت ہے۔ یہ ترجمہ اگر داخل درس رہا تو وہ مطلب بھی پورا ہو جائے گا۔

اصول التفسیر میں ''الفوز الکبیر'' اور علم حدیث کی اصولی وفروعی شرح کرنے میں

''حجۃ اللہ البالغہ'' بے نظیر کتابیں ہیں۔ ایسا ہی اہل السنۃ کی فقہ مجتہدانہ کو سمجھنے میں ''مسوی'' مدد دیتی ہے۔ اس کے بعد ''ازالۃ الخفا'' دورِ اوّل کی تاریخ کا فلسفہ اور اصول سیاست سکھلاتی ہے ''البدور البازغۃ'' نیچرل حکمت سکھاتی ہے۔ اور اس اصول کی تشریح میں بے نظیر کتاب ہے کہ فطرتِ انسانیہ اَدیان الٰہیہ کا معیار بنائی گئی۔ ''الخیر الکثیر'' فلسفۂ الٰہیات کو کتاب وسنت کی شرح میں استعمال کرنے کے قابل بناتی ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ سب کتابیں دار العلوم دیوبند جیسے مرکزی مدارس میں داخل درس کر دی جائیں۔

دوشبہات کا ازالہ

یہاں پہنچ کر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوشبہات کا جواب ذکر کر دیا جائے۔

پہلا شبہ: یہ ہے کہ مصر میں عربی کی تجدید ہو رہی ہے۔ سہل التعبیر کتابیں تمام فنون کی نئی تصنیف ہو رہی ہیں۔ علمائے ہند کو اپنا عربی کورس ان کے تتبع میں تبدیل کر لینا چاہیئے۔

جواب: میں اس تبدیلی کا مخالف ہوں اور مجھ پر ارتجاعی ہونے کا الزام لگانے سے پہلے میرا جواب سُن لینا چاہیئے۔ نئی شکل میں اصلاح شدہ عربی مدارس سے جو طالبعلم نکل رہے ہیں، وہ اپنی تاریخ وفلسفہ سے ناواقف ہوتے جاتے ہیں۔ اور یورپین فلاسفی ان کے اذہان پر غالب ہو رہی ہے۔

مثال کیلئے سعودی حکومت کے طلبہ کو لیجئے۔ وہ اعتقاداً شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے متبعین میں سے ہیں۔ اور انہی کی اتباع کی دعوت کو سلفیت کا نام دیتے ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ ان میں سے ایک عالم بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ شیخ الاسلام کی 'منہاج السنۃ' یا

عقل ونقل ہکتا ہے۔ دوسرے کو سمجھانا بہت دور کی بات ہے۔

میرا خیال ہے اسی طرح اگر نیا اصلاح شدہ عربی نصاب ہمارے مدارس میں غالب آ گیا تو یقین مانیے کہ ہم ''حجۃ اللہ البالغہ'' جیسی کتاب کو سمجھنے سے عاری ہو جائیں گے اور ہمارا اپنا فلسفہ جب ذہن سے نکل گیا تو ہم ہر طرح بہکائے جا سکتے ہیں۔

دوسرا شبہ: کہا جاتا ہے کہ کیا ہم یورپین سائنس اور صنعتیں سیکھنے کے محتاج نہیں ہیں۔ اس لیے ہمیں سہل عربی سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔

جواب: میرا جواب یہ ہے کہ میں سائنس سیکھنے کا کسی صورت میں انکار نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے لیے عربی کو آلہ نہیں بنانا چاہیے۔ بلکہ انگریزی کے ذریعہ سے اس کی تکمیل ضروری ہے۔ جدید عربی لکھنے والوں میں نقل و ترجمہ کے سوا اور کوئی کمال نہیں اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کو نقل در نقل کا عادی نہ بنایا جائے۔

البتہ میں حربی علوم سیکھنے کے لیے ترکی زبان کو تمام یورپین زبانوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی گرامر بہت آسان ہے۔ ایک ہندوستانی چار مہینہ میں ایک گھنٹہ روز صرف کر کے اس قابل ہو جاتا ہے کہ کالج کے لیکچر سن سکے۔ ایسا ہی طبی فنون کے لیے بھی ترکی زبان کو ترجیح دیتا ہوں، سلاطین عثمانیہ نے حربی و طبی کالج استنبول میں بنا کر تمام مسلمانوں پر بڑا احسان کیا ہے۔

۷۔ (جمعیۃ علماء کا دوسرا سیکشن)

جمعیۃ العلماء کا دوسرا سیکشن اسلامی فلاسفی کا محافظ ہو۔ یہ اسلامی فلاسفی دراصل وہی ہند و فلاسفی ہے جسے مسلم صوفیائے کرام نے ہند میں تکمیل کے درجہ تک پہنچایا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے الفاظ عامہ سے ہماری مراد وہ علماء ربانی ہیں جو دوسری ہزار ہجری

کے دوران ہند میں پیدا ہوئے۔ اس درجہ تکمیل کا معلم و مرشد ہم امام ولی اللہ کو اس فن میں سب سے بڑا امام مانتے ہیں۔

میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ میں دہلی کے "جامعہ ملّیہ" میں اس امام کی فلاسفی سکھلانے کے لیے ایک مدرسہ بنانا چاہتا ہوں جو میرے استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کی یادگار ہوگا۔ غالباً جمعیۃ العلماء بنگال اس تحریک کو اچھی نگاہ سے دیکھے گی۔ اس مدرسہ میں امام ولی اللہ کی فلاسفی انگریزی زبان میں ترجمہ کر دی جائے گی۔ اور مسلم و غیر مسلم ہر ایک کو مساوی درجہ پر سکھلائی جائے گی۔

ترکوں نے ترکی مسلمانوں کو نیشنلسٹ بنایا۔ تو اس میں یقیناً ایک درجہ تک لادینی بھی آ گئی۔ اگر ہم اسلامی فلاسفی کا اسکول قائم کر سکے۔ تو مسلمانان ہند کو نیشنلسٹ بننے میں اسلام چھوڑنا نہیں پڑے گا۔ اور ہندو فلاسفروں سے متحد الخیال ہو کر یوروپین انقلاب معاشی میں وہ مذہب کو بہت آگے لے جائیں گے۔

۸۔ (دوسرے سیکشن کے ممبران کی ذمہ داری)

جمعیۃ علماء ہند کا یہ سیکشن جو حکمت و فلسفہ کے لیے خاص ہوگا۔ میں اس کے ہر ایک ممبر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کا ممبر ہو جائے۔

اور پہلے سیکشن کے ممبروں کو براہ راست سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیئے۔ وہ فقط اس دوسرے سیکشن کے ماتحت رہ کر ان کی تائید کے لیے عوام کو جمع کریں اور اس طرح جمعیۃ العلماء ذہنی انارکزم سے نجات پا جائے گی۔

۹۔ (پہلے سیکشن کے ممبران کا دائرہ عمل)

میں مشورہ دیتا ہوں کہ ان فلاسفروں کی ذمہ داری پر ان کی نگرانی میں پہلی قسم کے علماء اور طالب علموں کی ایک جمعیتہ قائم کی جائے جسے خدام خلق کہا جائے۔ وہ ہر ایک انسان کی حاجت روائی کر کے بغیر کسی امتیاز مذہبی کے خدمت کریں۔ اسی خدمت کے زور پر جمعیتہ علماء ہند کی سیاسی عزت قوم میں مسلّمہ رہے گی۔

۱۰۔ (قرآن حکیم کی حکیمانہ تفسیر کی اہمیت)

میں جمعیتہ علماء کو مشورہ دیتا ہوں کہ اس کے حکیم وفلاسفر اس طرف متوجہ ہوں کہ وہ قرآن عظیم کی حکیمانہ تفسیر مسلم اور غیر مسلم سب کے سامنے پیش کرنا اپنا فرض قرار دیں۔ میں اس کی اطلاع دیتا ہوں۔ کہ امام ولی اللہ کی حکمت کا وہ مدرسہ جس کا جاری کرنا ہم جامعہ ملّیہ میں تجویز کر رہے ہیں۔ اس تحریک کو چلائے گا اور اس خدمت کو ادا کرتا رہے گا۔

مقالہ نمبر ۹

خطبہء صدارت

جمعیت علماء سندھ

اکتوبر ۱۹۳۹ء

پس منظر

[حضرت سندھیؒ بنیادی طور پر حضرت شیخ الھندؒ کے فکر و عمل کے سچے وارث اور جانشین تھے' انہوں نے حضرات مشائخ دیوبند بالعموم اور حضرت شیخ الھندؒ بالخصوص کے نقش قدم پر چلتے ہوئے' ہندوستان کی غلامی اور مستقبل کی نقشہ کشی کیلئے اسلام کے غلبہ کو بنیادی اساسی اہمیت دی۔

اسی کے تناظر میں آپ نے ''جمعیۃ الانصار'' سے شروع کر کے آخر زندگی تک جہدِ مسلسل فرمائی۔ اور اپنے غور وفکر اور عملی جدوجہد کے نتائج کو پرکھ کر اس خطہ کیلئے بہترین پروگرام مرتب کیا' موجودہ خطبہ اسی تناظر میں تحریر کیا گیا ہے۔

پیش نظر خطبہ اگرچہ پڑھا نہ جاسکا لیکن اس میں آپ نے جمعیۃ علماء کے حضرات کے سامنے مربوط طور پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں اور غور وفکر کی دعوت دی ہے۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں آپ ہندوستان تشریف لائے' اس کے بعد مسلسل سفر میں رہ کر آپ نے اپنے افکار و خیالات پوری مستعدی کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیے۔

حضرت سندھیؒ کے شاگردان عزیز کے شکریہ کے ساتھ یہ خطبہ نذر قارئین ہے۔

آزاد]

جمعیت علمائے سندھ کا ایک خطبۂ صدارت

جو پڑھا نہ گیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

امابعد! جمعیت علمائے سندھ اگرچہ بظاہر جمعیت علمائے ہند کی ایک شاخ ہے' لیکن اگر علماء کی اجتماعی تحریک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اسے جمعیت علمائے ہند کے لئے ایک طرح کی مرکزیت حاصل ہے۔

1327ھ ہجری (۱۹۰۹ء) میں جمعیت الانصار قائم ہوئی' جو موجودہ جمعیت العلماء کے لئے نقش اوّل کا کام دیتی ہے' جمعیت الانصار قائم کرنے کی پہلی تحریک جس مجلس اساسی میں حضرت مولانا شیخ الہند کے سامنے پیش ہوئی' اس میں حضرت مولانا محمد صادق صاحب رئیس جمعیت علمائے سندھ شریک تھے' مجھے یاد ہے کہ جمعیت الانصار کا قانون میں نے سندھ کے دارالرشاد میں تحریر کیا اور پہلی دفعہ اسے الحق پریس سکھر میں طبع کرا کر دیوبند کی مرکزی مجلس میں پیش کیا تھا اس کے بعد جمعیت الانصار کی معاون مجلس جس کا نام قاسم المعارف تھا اس کی پہلی شاخ قاسم المعارف' کراچی میں قائم ہوئی جس کا قانون مطبع قاسمی دیوبند سے شائع ہوا۔

حضرات! ہماری جمعیت العلماء اگرچہ جمعیت الانصار کا دوسرا ایڈیشن ہے لیکن دونوں کے پروگرام میں ایک اساسی فرق موجود ہے' جس کی توضیح آپ کے سامنے پیش کرتا

ہوں۔

حضرات! جمعیت الانصار میرے استاد حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہند قدس سرہٗ کی سیاست میں ایک خاص قسم کی سیاست کا مرکز تھی اس کو اجمالاً سمجھنے کے لئے حضرت شیخ الہند کی شخصیت پر غور کرنا ہی کافی ہے آپ حضرات بہ خوبی جانتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند نور اللہ قبرہ واعلیٰ فی العلیین مقامہٗ طریقۂ امدادیہ قاسمیہ رشیدیہ کے واحد قائم مقام تھے یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ اس طریقہ امدادیہ کی نسبت طریقۂ ولی اللٰھیہ عزیزیہ کے ساتھ اسی قسم کی ہے' جو ایک فرع نامی کو اصل سامی کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

حضرات! یہ حقیقت بھی آپ سے مخفی نہیں کہ جمعیت الانصار کی فعالیت حرب عمومی میں منصۂ شہود پر آئی' اس نے دنیا کی تاریخ میں ایک اہم مقام اپنے لئے حاصل کر لیا تھا اس کے بعد کافی عرصہ گزر چکا ہے کہ اسکی فعالیت ختم ہوگئی اس وقت جمعیت الانصار کی کامیابیوں اور شکستوں کا تذکرہ مقصود نہیں' اصل مقصود یہ ہے کہ ہم دنیا کو بتلا دیں کہ اس جمعیت العلماء کا مقصد وہ نہیں جو جمعیت الانصار کا مقصد تھا' ممکن ہے بہت دور جا کر دونوں راستے مل جاتے ہوں' مگر اس وقت موجودہ نسل کے سامنے جس عملی حیثیت میں یہ معاملہ زیر بحث ہے اس میں دونوں کے پروگرام بالکل مختلف ہیں۔

حضرات! جمعیت الانصار اپنے مقصد کی تحصیل میں تشدد پر یقین رکھتی تھی اور دوسری قوموں کے منازعت (جھگڑے) میں اپنے لئے کامیابی کے موقعے تلاش کرتی تھی' بہ خلاف اس کے جمعیت العلماء اہنسا (عدم تشدد) پر یقین رکھتی ہے اسے اپنے ملک میں' اپنی قوم میں' اپنی قوت اور عقل مندی پر بفضلہٖ تعالیٰ پورا اعتماد ہے وہ جب اپنی عدم تشدد اور قوت حاکمہ کی مصلحت شناسی کا عمیق مطالعہ کرتی ہے تو اسے اپنے مقصد میں کامیابی کا جلوہ نظر آتا ہے۔

حضرات! آپ دریافت کر سکتے ہیں کہ اس قدر عظیم الشان تبدیلی کے اسباب کیا ہیں؟ ہمارے خیالات میں یہ تبدیلی کیسے پیدا ہوئی اور پھر کس طرح اب ہم اس دوسری صورت پر مستقل رہنے کا یقین دلا سکتے ہیں؟ جب تک ہم آپ کو اپنی سیاحت کی داستان نہ سنائیں۔

وہ حضر بے برگ وساماں، وہ سفر بے سنگ ومیل

حضرات! جب ہم حضرت شیخ الہند کے پروگرام کو اپنی حیثیت کے مطابق آخری منزل تک پہنچانے کے قریب ہو گئے تھے تو قدرتی اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ ہمیں پوری شکست ہو گئی اور لطف یہ ہے کہ اس کے بعد بھی ہم موت کے منہ سے بچ نکلے، اس حالت میں ایک عرصے تک ہم پریشان حالی میں مبتلا رہے، مولانا روم کا یہ شعر۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم　　　جفت خوش حالاں وبدحالاں شدم

ترجمہ: میں نے ہر طرح کے لوگوں کو اپنی داستان غم سنائی۔ امیروں کی مجلسوں میں بھی شریک ہوا اور غریبوں کے ساتھ بھی بیٹھا۔

اس حالت کی ترجمانی کے لئے کافی ہے، ہمیں اس اعتراف میں بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے کہ حضرت مولانا شیخ الہند کی صحبت سے جو تھوڑا بہت اثر ہماری طبیعت نے قبول کیا تھا، بفضلہ تعالیٰ وہی ہمارے کام آیا اور مایوسی اور خودکشی سے بچ گئے، اللہ رب العزت کا ہزار ہزار شکر ہے کہ بالآخر ہمیں راستہ نظر آ گیا اگر مختصر طور پر اسے بیان کیا جائے تو اس کا عنوان ہوگا۔

''حکمۃ امام ولی اللہ دہلوی کا اتباع''

یہ غالباً 923 ہندی کا واقعہ ہے اس کے بعد بھی ہم نے اپنی تفتیش کو ختم نہیں کیا

ہمیں جس قدر اہل الرائے مل سکے ہم ان سے تبادلہ خیالات کرتے رہے اور ہم ان سے مطالبہ کرتے رہے کہ وہ ہمیں اس سے بہتر راستہ بتلائیں؟ ہم نے جس قدر مسلم اقوام کے مفکرین سے مذاکرہ کیا مثلاً ترک، شامی، مصری وغیرہ ان میں سے کسی نے اس کا بدل ہمیں نہیں بتلایا اور وہ حضرات یہ بھی نہیں منظور کرتے کہ ان کے ملک میں ہم اس پروگرام کو جاری رکھیں، غیر مسلم اقوام میں سے بعض مفکرین تو متحیر ہو گئے کہ کیا مسلمانوں میں ایسا حکیم موجود ہے وہ کہتے ہیں اگر کوئی سوسائٹی اس حکیم کے پروگرام پر عمل کرتی ہوتی تو ہم اس کو قبول کر لیتے۔

حضرات! اب ہماری مشکلات کی دوسری منزل شروع ہوتی ہے۔

اوّل تو اس حقیقت سے کسی طرح غفلت نہیں برتی جاسکتی کہ اس فلسفے کی ہند میں اشاعت اور پھر اس کے اتباع میں کسی ہندوستانی قوم کی تنظیم کے لئے ایک لمبے زمانے کی ضرورت ہے۔

دوسرا یہ امر بھی واضح ہے کہ اس پروگرام کو چلانے کے لئے مرکزی قوت، جمعیت العلماء ہی بن سکتی ہے۔

حضرات! ہم ہندوستان میں واپس آنے کی امید نہیں کر سکتے تھے اس لئے جمعیت العلماء کو متاثر کرنے کے لئے حجاز میں بیٹھ کر عربی میں اس قسم کا مواد جمع کرنے میں مصروف رہے، جس سے امام ولی اللہ کی حکمت کا تفوق اور شیخ الہند کی جماعت کا اس سے اتصال واضح ہوتا رہے۔

ہماری اس قسم کی تحریریں چونکہ کسی خاص سیاسی پروپیگنڈے سے تعلق نہیں رکھتی تھیں اس لئے عرب اور ترک و ہند کے اہل علم میں مقبول ہوئیں اور بغیر ہماری خاص کوشش کے وہ ہند میں پہنچ گئیں ہمارا خیال ہے کہ بعض حضرات تو ضرور چیں بہ جبیں ہوتے ہوں گے

مگر ایسے اہل علم بھی موجود ہیں، جنھیں اس قسم کے مضامین سے ایک طرح کی دلچسپی پیدا ہو۔

دوسری ضرورت کو کسی نہ کسی رنگ میں ہم اس طرح پورا کرتے رہے، مگر پہلے امر کے لئے ہم کوئی موقع نہیں پیدا کر سکتے تھے بجز اس کے کہ ہم عدم تشدد پر اپنے پروگرام کی بنیاد رکھیں اور مستقل طور پر کانگریس سے وابستہ ہو جائیں۔

حضرات! انڈین نیشنل کانگریس میں ایسی پارٹیاں موجود تھیں، جن کا پروگرام ایک خاص معنی میں انقلابی ہے۔ مگر چونکہ وہ عدم تشدد کی پابند تھیں اس لئے وہ ملک کی سیاست میں اپنی منشا کے مطابق انقلاب پیدا کرنے کی سعی کر رہی تھیں ہم نے ان سے سبق لیا اور جرأت کر کے عدم تشدد کو اپنی پارٹی کے پروگرام میں داخل کر لیا اور اپنے بعض تیز گام نوجوان رفیقوں کی رفاقت سے دستبر دار ہو گئے۔

حضرات! آپ بہ خوبی جانتے ہیں کابل پہنچ کر جب ہمارا حکومت سے اچھا تعارف ہو گیا تو اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ کی رہنمائی سے ہم انڈین نیشنل کانگریس کے طرف دار ہو گئے اور ہم نے اس کے نام سے اپنا کام مسلسل سر انجام دیا، یہ امر ترقی کر کے اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کے زمانے میں اس درجے پر پہنچ گیا کہ ہم نے کابل میں کانگریس کمیٹی بنائی اور آل انڈیا نیشنل کانگریس نے اس کا الحاق قبول کر لیا۔

حضرات! آپ جانتے ہیں کہ جب سے ہمارے ملک کا ایک بڑا سیاسی فلاسفر کانگریس میں شامل ہوا اس نے بالتدریج کانگریس کو عدم تشدد کا پابند بنا دیا اسی زمانے سے ہمارے ملک کی ترقی ایک نئے اسلوب میں شروع ہوتی ہے اس لیے ہمارے ملک کی انٹرنیشنل عزت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔

حضرات! ہم جانتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام عدم تشدد کا پیغام دے کر توراۃ کے پروگرام کو کامیاب بنانا چاہتے تھے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے امام

حضرت سید المرسلین ﷺ نے مکی زندگی میں ایک طویل زمانے تک اس پر عمل کیا مگر ہم اپنی فقہی ذہنیت نے اسے ایک منسوخ شریعت مان کر بے توجہی سے ٹالتے رہے۔

جس زمانے میں ہم ہر طرف سے مایوس ہو گئے اور ہم نے عدم تشدد کو ایک سیاسی پروگرام کی شکل میں منظم ہوتے مشاہدہ کر لیا تو ہماری حکمت کی ذہنیت بیدار ہوئی یعنی جب حالات ایسے پیدا ہو جائیں' جیسے ایک منسوخ شریعت کے وقت ظاہر ہونے تھے تو حکیمانہ عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنا قیاس اپنی ذمہ داری سے اسی منسوخ شریعت کے موافق پیدا کر کے اس پر عمل کر لینا چاہیے اس طرح ہم نے عدم تشدد [اہنسا(Non-violence] کو اپنے پروگرام میں اہم موقعہ پر رکھا۔

حضرات! اس کے بعد ہماری مشکلات کا تیسرا مرحلہ ہمارے سامنے آتا ہے عدم تشدد کا سیاسی نظریہ قبول کر لینا اپنے اندر کوئی اشکال نہیں رکھتا مگر اس کے ساتھ کامل آزادی ہند کو اپنا مقصد حیات بنانا ایک مفکر کے لیے آسان نہیں' ہمارے اس مطالعے سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ:

(۱) ہم نے اپنے اندر لڑائی لڑ کر آزادی حاصل کرنے کی طاقت نہ دیکھ کر عدم تشدد کو قبول کیا ہے۔

(۲) ہم کسی بیرونی طاقت کے اشتراک سے آزادی حاصل کرنے کے روادار نہیں ہیں۔

ہمارے خیال میں عدم تشدد کی پابندی سے وہی آزادی حاصل ہو سکتی ہے جو بالتدریج ہو۔ سب سے پہلے ''ڈومینین اسٹیٹس'' کے درجے کا ہوم رول ہوگا اور کافی زمانے تک ہند ''برٹش کامن ویلتھ'' کے اندر رہے گا' اس کے بعد سمجھوتے سے خارجی اور حربی اختیارات منتقل ہوں گے ان اختیارات پر پورا قبضہ حاصل ہونے کے بعد ''کامل آزادی''

کالفظ اصلی معنی میں صادق آتا ہے' عدم تشدد کی پابندی سے یہ درجہ حاصل کر لینا اہل ہند کی عقل مندی اور برطانیہ کی مصلحت شناسی سے دور نہیں' اس امکان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے عدم تشدد کو اپنے پروگرام میں قبول کر لیا۔

حضرات! ہمارا خیال ہے کہ کامل آزادی حاصل ہونے کے بعد بھی کافی عرصے تک ہندوستان برطانیہ کا حلیف بن کر رہے گا' اور حکمراں قوت کے ساتھ سمجھوتے سے مدارج طے کیے جائیں گے۔

حضرات! ہم نے عدم تشدد کو اس کے لوازم کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد قبول کیا ہے' ہمیں اپنی اس کمزوری کے اظہار میں مسرت محسوس ہوتی ہے' کیونکہ ہم سیاسی جہل وغرور میں مبتلا رہنا جرم عظیم سمجھتے ہیں' مگر ایسا ہندوستانی جسے ہند سے باہر رہ کر سیاسیات کے مطالعے کا موقع نہیں ملا' وہ عدم تشدد سے یک بارگی آزادی حاصل ہونے کا یقین رکھتا ہو' ہم اسے بعید نہیں سمجھتے' ہمارے خیال میں بہت سے نوجوان اسی رنگ میں عدم تشدد کو قبول کر کے مہاتما گاندھی کے ساتھ ہو لیے تھے اور کچھ سفر کرنے کے بعد' انہیں پشیمان ہو کر راستہ بدلنا پڑا' لیکن مہاتما جی عقل مندی سے اپنا پہلو ہمیشہ بچاتے رہے مثلاً: وہ بار بار کہتے رہے کہ اہنسا (عدم تشدد) کا فلسفہ فقط میں ہی جانتا ہوں' غالباً وہ نوجوانوں کی غلط اندیشیاں دیکھ کر اس تصریح کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

حضرات! میں نے جمعیت العلماء کے نصب العین کی تشریح میں آپ کا بہت سا وقت لے لیا' اگر اس میں کسی قدر کامیابی ہوئی تو اللہ کا شکر کرنا چاہئے کہ ایک اہم مسئلے کی اساسی بحث سے فراغت ہوئی' اب فروعی مباحث میں اس قدر تشویش پیش نہیں آئے گی۔

حضرات! اس کے بعد میرا فرض ہے کہ جمعیت علمائے سندھ کو نیشنل کانگریس کے اندر عدم تشدد کی پابندی سے کامل آزادی حاصل کرنے کے لیے پروگرام بنانے میں مدد

دون، میں اس سے کبھی غافل نہیں ہوا جس قدر سوچ سکتا ہوں بطور مشورہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

گزشتہ رمضان (۱۳۵۷ھ) کے ہفتۂ اخیرہ (۱۴۔نومبر ۱۹۳۸ء) کا واقعہ ہے جب میں مکہ معظّمہ میں مقیم تھا اور واپسیٔ وطن کی تیاری کر رہا تھا آپ کے مشورہ دینے کے لیے میں نے اس وقت پارٹی پروگرام کا مسودہ تیار کیا اور اس کی ایک نقل بذریعہ ڈاک اپنے پہنچنے سے پہلے جامعہ ملیہ دہلی میں بھیج دی تھی، وہ جامعہ میں محفوظ ہے (۱) جب ضرورت ہوگی، وہ مفصل پروگرام آپ کے سامنے پیش کردوں گا (۲) اس مجلس میں اس کا اختصار سے ذکر کر دیتا ہوں، اس وقت میرا اعتماد حافظے پر ہے اس لیے اس مسودے سے بعض لفظی اختلافات بعد میں درست کر دیئے جائیں گے۔

(۱)

جمعیت علمائے سندھ کا وہ حصہ جو انڈین نیشنل کانگریس کے دوامی ممبر ہیں، وہ نیشنل کانگریس کے نصب العین یعنی کامل آزادیٔ ہند مع عدم تشدد کو تسلیم کرتے ہوئے، کانگریس کے اندر ایک مستقل نیشنل پارٹی بناتے ہیں، جس کا نام سندھ ساگر پارٹی ہوگا۔

(۲)

سندھ ساگر پارٹی ہند کی ایک محدود سرزمین میں رہنے والی اقوام کی انٹرنیشنل پارٹی ہے۔ ان مختلف زبان بولنے والی اقوام کی علمی، اقتصادی ترقی اس کا خاص مقصد ہے۔

(۳)

سندھ ساگر پارٹی کا حلقہ اثر چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(الف) سندھ ساگر پارٹی کے حلقہء اثر کا پہلا حصہ آج کا صوبہ سندھ ہے اس کا مرکزی شہر کراچی ہے۔

(ب) اس پارٹی کے حلقۂ اثر کا دوسرا حصہ وہ سرزمین ہے جو دریائے سندھ اوراس کے معاونین سے سیراب ہوتی ہے' اس کے مرکزی شہر لاہور و پشاور ہیں۔

(ج) اس پارٹی کے حلقہء اثر کا تیسرا حصّہ وہ سرزمین ہے جو طبعی ضرورتوں کے اقتضاء سے اس کے ساتھ ملحق ہونا چاہیئے' اس کے بڑے شہر دہلی' آگرہ' لکھنو اورالہ آباد ہیں۔

(د) اس پارٹی کے حلقۂ اثر کا چوتھا حصہ وہ سرزمین ہے جو اس پارٹی سے ملحق ہونا پسند کرے۔

(۴)

سندھ ساگر پارٹی اپنے حلقہء اثر میں بسنے والی قوم کے ہر فرد کو اس کی مادری زبان میں لکھنا سکھلائے گی اگر وہ زبان عربی اور ہندی حروف میں لکھی جاتی ہے تو پارٹی اس زبان کا رومن حروف میں لکھنا بھی جائز قرار دیتی ہے۔

(الف) پارٹی کے دفاتر میں ہر ایک مقامی زبان رومن کیریکٹر میں لکھی جائے گی۔

(ب) پارٹی ہر ایک قوم کو انٹرنیشنل زبان اردو انگریزی ضرور سکھلائے گی۔

(۵)

سندھ ساگر پارٹی اپنے حلقہء اثر کی ذہنیت واضح رکھنے کے لیے فلسفہء امام ولی اللہ دہلوی کو اپنا اساسی اصول قرار دیتی ہے۔

(الف) یہ فلسفہ ویدانت فلاسفی کا اسلامی ایڈیشن ہے۔

(ب) ترقی یافتہ انسانیت کی عقلی تشریح کرنا اس کی اساس ہے۔

(ج) مذاہب عالم کی تطبیق اس کا لازمی نتیجہ ہے۔

(د) اس کا اقتصادی فلسفہ تکمیل انسانیت کے لیے بہترین اسکیم پیش کرتا ہے۔

(۶)

سندھ ساگر پارٹی اپنے حلقہء اثر کی اقتصادی ترقی کو اپنا اصلی مقصد قرار دیتی ہے۔

(الف) اس کا طریق عمل یہ ہوگا کہ پارٹی عام حالات کا اندازہ کر کے معیار زندگی مقرر کرے گی اور اجتماع کے اول طبقوں میں مثلاً کسان و مزدور کے ہر ہر فرد کو اس معیار پر پہنچانے کی کوشش کرے گی۔

(ب) پارٹی کے طبقہء اثر میں فقط پہلا حصہ یعنی صوبہ سندھ پارٹی کے اقتصادی پروگرام کا اصل میدان ہوگا۔

تشریح: پارٹی اپنے اقتصادی پروگرام کی تکمیل میں سندھ گورنمنٹ اور ہر اس

جماعت سے امداد حاصل کرے گی جسے اس مقصد سے ہمدردی ہے۔

(ج) صوبۂ سندھ کے سوا سندھ ساگر پارٹی کے جس قدر حلقہ اثر ہوں، اگر وہ پسند کریں گے تو انھیں اس پروگرام میں پارٹی شریک کرے گی۔

(۷)

سندھ ساگر پارٹی کسان اور مزدور کے معیار زندگی کو یوروپین کسان و مزدور کے معیار پر پہنچانا ضروری سمجھتی ہے اس لئے انھیں اُس یوروپین لباس کا عادی بنائے گی جسے ترک وایرانی وافغان ومصری وشامی وعراقی نے پسند کرلیا ہے۔

(۸)

سندھ ساگر پارٹی اردو زبان کی حمایت اور اس کی اشاعت کو اپنا مقصد اہم قرار دیتی ہے۔

(الف) اردو دراصل ناگری، فارسی، عربی، ترکی کے اختلاط سے پیدا ہوئی، چونکہ یہ زبان ہند کے ایک عظیم الشان تاریخی انٹرنیشنل اجتماع کی یادگار ہے، اس لیے پارٹی اس بے نظیر نمونے کی دعوت اقوام عالم کو دینا چاہتی ہے۔

(ب) پارٹی اس کے موجودہ رسم الخط کو تسلیم کرتی ہے اس لیے اس کے بہترین ٹائپ مہیا کرنے کی کوشش کرتی رہیگی۔

(ج) پارٹی اردو کو دیوناگری حروف میں لکھنا جائز سمجھتی ہے، اس لیے

اردو کی بہترین کتابیں اس ٹائپ میں چھاپ کر شائع کرے گی۔

تشریح: پارٹی اُردو کے موجودہ رسم الخط اور دیوناگری رسم الخط کا مرکز جامع ملیہ دہلی کو قرار دیتی ہے۔

(د) پارٹی اُردو کیلئے عربی رسم الخط کا ٹائپ استعمال کرنا جائز سمجھتی ہے اس سے اسلامی دنیا کو اس کے پڑھنے میں آسانی ہوگی۔

(ہ) پارٹی اردو کو ''مقطّع'' حروف میں لکھنا جائز سمجھتی ہے اگر ان پر زیر' زبر' پیش' جزم' تشدید' وقفہ کی علامتیں لگائی جائیں تو یہ رسم الخط دنیا کے آسان اور بہترین رسم الخط کا مقابلہ کر سکے گا' آگے چل کر عربی رسم الخط استعمال کرنے والی تمام زبانیں اسی رسم الخط میں تبدیل ہوسکتی ہیں۔

(و) سندھ ساگر پارٹی اردو کو رومن کیریکٹر میں لکھنا جائز سمجھتی ہے' اس سے یہ زبان یوروپین ممالک میں رائج ہوسکتی ہے۔

تشریح: سندھ ساگر پارٹی اردو کی اشاعت بہ خط نسخ و ''مقطّع'' حروف و حروفِ رومن کا مرکز کراچی کو قرار دیتی ہے۔

(ز) سندھ ساگر پارٹی اردو زبان کو اپنے حلقہء اثر میں انٹرنیشنل زبان مانتی ہے' اس سے مقامی نیشنل زبانوں مثل سندھی' پشتو' کشمیری' پنجابی کو صدمہ پہنچانا ناجائز سمجھتی ہے۔

(ح) سندھ ساگر پارٹی جہاں اردو سے انٹرنیشنل فائدہ حاصل نہیں کر سکتی، وہاں انگریزی کو اپنی انٹرنیشنل زبان مانتی ہے۔

(ط) نیشنل ازم کے غلو میں اگر یہ کوشش کی جائے کہ پرانی مذہبی زبان کو انٹرنیشنل بنایا جائے تو سندھ ساگر پارٹی اس ارتجاعی تحریک میں شمولیت سے انکار کرتی ہے۔

(۹)

سندھ ساگر پارٹی کانگریس کی طرح اپنا نصب العین کامل آزادی مانتی ہے، لیکن اگر اس نصب العین کو عدم تشدد سے تطبیق دی جائے تو مصالحت کی درمیانی منزل ''ڈومنین اسٹیٹس'' جیسے ہوم رول کو تسلیم کرنا ضروری ہے، اس لیے سندھ ساگر پارٹی عملی طور پر ایک زمانے کے لیے برٹش کامن ویلتھ میں رہنا منظور کرتی ہے۔

(۱۰)

کسی آنے والے زمانے میں اگر ہندوستان کو برٹش طاقت سے کامل آزادی حاصل ہو جائے تو سندھ ساگر پارٹی کے فیصلے میں اس کے بعد بھی ایک زمانے تک برٹش طاقت کا حلیف رہنا ضروری ہے۔

حضرات! یہ اس سیاسی پارٹی کے پروگرام کا خاکہ ہے جس کے منظم کرنے کا میں جمعیت علمائے سندھ کو مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں، آپ نے جس طرح خلافت کمیٹی کی شاخیں سارے ملک میں قائم کر دی تھیں اسی ہمت سے اب اس کانگریس میں سندھ ساگر

پارٹی کی کمیٹیاں ہر چھوٹی بڑی آبادی میں منظم کردیں، اگر آپ اس کو منظور کرتے ہیں تو میں بفضلہٖ تعالیٰ اس کو کامیابی سے چلانے میں آپ کی خدمت کرسکتا ہوں اس طرح پارٹی قائم ہونے پر جمعیت العلماء کے افراد کے لیے کام کا وسیع میدان نکل آئے گا۔

(الف) متوسط درجے کے اہل علم کے لیے:۔

(۱) سندھ کے ہر ایک مرد و عورت کو اسی کی زبان میں مبادیاتِ سیاست سے واقف بنانا اور سندھی زبان سکھانا۔

(۲) ہر مسلمان مرد و عورت کو سندھی زبان میں قرآن عظیم کے ترجمہ اور دینی ضروریات کی تعلیم دینا کس قدر ضروری اور عظیم الشان کام ہے۔

(ب) اعلیٰ طبقہء اہل علم کو

(۱) فلسفہء امام ولی اللہ دہلوی میں مہارت پیدا کرنا اور اسے تطبیق ادیان کے لیے ہر طبقہ انسانیہ میں رائج کرنا۔

(۲) قرآن عظیم کی تفسیر اس حکمت کے موافق مسلم اور غیر مسلم کے لیے شائع کرنا۔

اس پارٹی کے وہ افراد جو طبقہ علما میں شمار نہیں ہو سکتے وہ بھی ایک ترقی کن سیاسی پروگرام کی پیروی سے قومی مجالس اور سرکاری مجالس میں اعلیٰ عزت کے مدارج حاصل کر سکتے ہیں، اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں، اس نیشنل پروگرام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمان کی وجدانیات اور حسیات کا کانگریس کے اندر رہ کر پورا احترام کرتا ہے۔

حضرات! کانگریس کے اس دور میں جو تحریک خلافت کے ختم سے شروع ہوتا ہے مہاتما گاندھی کی رہنمائی سے ہندو سوسائٹی کا ایک خاص فلسفہ اور خاص ارتجاعی پروگرام

بالتدریج کانگریس پر قبضہ کر رہا ہے۔ اس سے تنہا مسلمان ہی نالاں نہیں، ہندوؤں کی تمام ترقی پسند سیاسی جماعتیں بھی ناراض ہیں، یہ پارٹی پرانے مذہب کو زندہ کرنے کے دعویٰ سے ہندومہاسبھا کو، اور سیاسی رشوتوں سے ترقی کن نوجوانانِ پارٹی کو اپنے ساتھ چلا رہی ہے۔

میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ میں نے کابل چھوڑنے کے بعد فقط اس تحریک کے مطالعے کو اپنے لئے سب سے اہم مقصدِ سیاسی قرار دیا۔

حضرات! یہاں پر میں اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں میں ایک نومسلم ہوں، یہ میرے پیدا کرنے والے پروردگار کی خاص عنایت اور فضل تھا کہ میں اسلامی تعلیم کے مطالعے کے بعد اپنی سمجھ اور فیصلے سے مسلمان ہوا، یہ بھی اُسی کے فضل کے بعد دوسرا کرم تھا کہ مجھ بے یار و مددگار کے لیے تعلیم و تربیت کا ایسا نظام بہم پہنچایا جو کم کسی کے لیے میسر آتا ہے، الحمدللہ کہ میں عمر کا معتد بہ حصہ اسلامی علوم کی تحقیق میں صرف کرنے کے بعد امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفے پر مطمئن ہو گیا۔

میں اس کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس اعلیٰ فلسفے تک میری رسائی حضرت مولانا محمد قاسم دیوبندی کے توسط سے ممکن ہوئی جو میرے استاد حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہند کے استاد اور مربی و مرشد تھے، میں نے حضرت استاد کے توسط سے شفاہاً (براہ راست) جس قدر سیکھا ہے اس سے زیادہ میں مولانا محمد قاسم کی تالیفات سے متاثر ہوا ہوں، یہ میرا اسلام مجھے اپنی زندگی سے بہت زیادہ عزیز ہے، میں نے اس پر اپنا تمام خاندان قربان کر دیا ہے، اور اس کی خدمت کے شوق نے کسی دنیاوی متاع حاصل کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔

حضرات! اب ایک جملہ معترضہ سنئے، مہاتما گاندھی، ٹالسٹائی کی فلاسفی سے متاثر ہو کر ہندو فلاسفی کے اُس اسکول کو زندہ کرتے ہیں جس سے انھیں طبعی مناسبت ہے، جیسا کہ

ان کی گیتا کی شرح دیکھ کر ہر انسان یقین کر سکتا ہے کہ مہاتما اپنے خاص خیالات کو ہندوازم کا جامہ پہناتے ہیں، مہاتما جی آج کانگریس کے ڈکٹیٹر ہیں وہ نیشنل کانگریس کو جو سیاسی ہندوستان کا دوسرا نام ہے، اپنی خاص فلاسفی کے لیے استعمال کرتے ہیں کیونکہ کانگریس کی اس نئی زندگی میں ان کا خاص ہاتھ ہے۔

حضرات! کیا عبیداللہ کو جو اسلامی فلاسفی پر یقین رکھتا ہے، یہ حق نہیں ہے کہ وہ کانگریس میں اپنے سیاسی اور فلسفی نظریے کی پارٹی بنائے؟ عبیداللہ وہ شخص ہے جو بیس برس سے اپنی خاص سوسائٹی کے ساتھ انڈین نیشنل کانگریس کی خدمت کرتا رہا ہے، اس کی خدمات آج اگر اہل ہند نہیں جانتے تو کل دنیا کی تاریخ انھیں بتائے گی۔

اب یہاں پر میں کانگریس کے ذمہ دار حلقہ سے بھی سوال کرنا چاہتا ہوں کیا وہ سب کے سب اس پر تُل گئے ہیں کہ پروفیسر جیوت رام کرپلانی کو تو کانگریس کا معتمد (سیکرٹری) بنا سکتے ہیں لیکن اس کے بڑے بھائی شیخ عبدالمجید کرپلانی کو نیشنل کانگریس میں سندھ ساگر پارٹی نہیں بنانے دیں گے؟ محض اس جرم میں کہ وہ اپنے ضمیر کے موافق اسلام کا معتقد و خادم بن گیا!

حضرات! ۳ جون ۹۳۹ء ہندی کو میں نے جمعیت علمائے بنگال کے جلسے میں کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ:

(۱) انڈین نیشنل کانگریس کو تمام سیاسیات ہند کا مرکز بنایا جائے۔

(۲) میں اپنے ملک کے محترم فلاسفر مہاتما گاندھی کا نان وائیلنس کے پولیٹکل پروگرام میں اعلیٰ درجے پر احترام کرتا ہوں، مگر ان کے ارتجاعی میلان خاطر یا ان کے فلسفے سے پورا متفق نہیں ہوں، میں کانگریس سے سفارش کرتا ہوں کہ وہ اس کو قوم کا دستور العمل بنانے

کی کوشش نہ کرے۔

(۳) میں جمعیت علمائے ہند کو ایک اول درجے کی انقلابی جماعت بنانے کا مشورہ دیتا ہوں اگر وہ انقلابی بننا چاہیں تو انھیں امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفے کو اپنا اساسی اُصول بنانا چاہیئے۔

(۴) امام ولی اللہ کا فلسفہ وہی ویدانت فلاسفی ہے جسے ہند کے مسلمان صوفیہ نے مکمل کیا ہے۔

(۵) ہم جامعہ ملیہ دہلی میں ایک مدرسہ بنانا چاہتے ہیں اس میں امام ولی اللہ کی فلاسفی انگریزی میں ترجمہ کر دی جائے گی اور مسلم اور غیر مسلم ہر ایک کو مساوی درجے پر سکھلائی جائے گی۔

(۶) اس مدرسہ کے فارغ شدہ مسلمان اور ہندو متحد الخیال ہو کر یورپین معاشی انقلاب کے مقابلہ میں ہندوستان کو بہت آگے لے جائیں گے۔

اس کے بعد اگست میں آچاریہ کرپلانی کے واسطہ سے مجھے یہ جواب دیا جاتا ہے میں شدت حیرت اور تعجب سے ہوش نہیں سنبھال سکتا جب میں اچاریہ کرپلانی کے مقالے کا یہ حصہ پڑھتا ہوں کانگریس کے جنرل سکریٹری فرماتے ہیں:

> ''ستیہ اور اہنسا یا صداقت و عدم تشدد ایک قسم کی مذہبی اصطلاحیں ہیں لیکن ہمیں ان اصطلاحوں کو قوم کی زندگی کے ہر شعبے میں بروئے عمل لانا ہے۔ روحانی اصول زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتے ہیں انھیں زندگی کے کسی ایک پہلو سے متعلق کر کے باقی پہلوؤں کو ان سے بے نیاز کرنا ناممکن ہے۔ خلاصہ یہ کہ گاندھی جی نے ہماری زندگی

کے لیے عملی کام کا جو پروگرام پیش کیا ہے' ہمیں صرف اسی کو چلانا ہوگا۔

ان باتوں کو سمجھ لینے کے بعد ہندو مسلم اتحاد کے سوال کو سمجھ لینا بے حد آسان ہے گاندھی جی نے ہمیں سمجھایا ہے کہ اس سوال کو حل کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو رعایتیں' نشستیں اور سیاسی حقوق دیں یا مسلم عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ پیدا کرنے کی اسکیمیں چلا کر کانگریس کے رجسٹر میں مسلم ممبروں کی تعداد بڑھائیں۔

گاندھی جی جس رابطہء عوام کو چاہتے ہیں' وہ اس طرح حاصل نہیں ہو سکتا' ہندو مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بداعتمادی کے بہت قدیم اور تاریخی اسباب ہیں' اگر نفرت اور بداعتمادی کے ان اسباب کو رفع کیے بغیر مسلمانوں کو کانگریس کا ممبر بنالیا جائے تو وہ کانگریس کے اندر ایک لاینحل مسئلہ بن جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں کا کانگریس کے باہر رہ کر ایک لاینحل مسئلہ بنا رہنا اتنا بُرا نہیں' جتنا بُرا یہ ہے کہ وہ کانگریس میں آ کر کانگریس کے اندر ایک عقدۂ لاینحل بن جائیں' اس لیے گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے' وہی سب سے بہتر ہے' جو ان کے بنیادی اصول یعنی عدم تشدد اور صداقت پر مبنی ہے۔''

''بہر حال اس وقت تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے یہ بہ خوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ کانگریس کے عقیدے اور پروگرام میں گہرا تعلق ہے' نیز اس کے تمام مختلف پروگرام بھی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح

جڑے ہوئے ہیں جیسے جسم کے ساتھ اعضائے جسم' اس لیے کسی ایک پروگرام کو دوسرے پروگرام سے جدا کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی ذی روح جسم کے اعضا کو چیر پھاڑ کر جدا جدا کرنا۔ عقیدے اور پروگرام کا یہ اتحاد ہی دراصل گاندھی جی کے فلسفہء حیات کا دوسرا نام ہے' یہ فلسفہ اپنی صفات کے لحاظ سے انقلابی ہے لیکن اس انقلاب میں تشدد کا لحاظ کہیں نہیں آتا۔

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ کانگریس کی ہر اسکیم گاندھی جی کے فلسفے کے ماتحت چلائی جائے گی یہ ہرگز ممکن نہیں کہ آپ کسی کو کسی اور فلسفہء زندگی کے اصول پر چلا سکیں کانگریسی اسکیموں کا قلم کسی اور فلسفے پر نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ فلسفہء زندگی دنیا کے کسی اور فلسفہء زندگی کے ماتحت نہیں بنایا جا سکتا۔

علیٰ ہذا القیاس سوشلسٹوں کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سوشلزم اور گاندھی ازم بالکل جدا جدا چیزیں ہیں جن میں کوئی مطابقت پیدا نہیں کی جا سکتی۔"

کیا یہ میرے اس خطبے کا جواب ہے جو میں نے جمعیت علمائے بنگال کے اجلاس میں پڑھا تھا؟ ظاہر ہے کہ آچاریہ کرپلانی جب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اور میرا خطبہ عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے جس میں گاندھی جی کی فلاسفی کا انکار اور امام ولی اللہ دہلوی کی فلاسفی کا اثبات موجود ہے تو یہ اسی کا جواب ہے اسی واسطے انھوں نے سوشلسٹوں کو علیحدہ مخاطب بنایا۔

میں مہاتما جی سے بہ صد ادب واحترام یہ دریافت کرتا ہوں کیا عبید اللہ کی سندھ ساگر پارٹی کو کانگریس سے روکنے کے لیے کانگریس کی اس سیاسی پوزیشن سے فائدہ اٹھانا "ستیہ اور اہنسا" کے خلاف نہیں؟

میں اپنے دوست آچاریہ کرپلانی کی دانشمندی سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ خود ہی میری پارٹی کے لیے دروازہ کھول دیں گے، ورنہ انھیں مطمئن رہنا چاہیے کہ ان کی جگہ دوسرا جنرل سکریٹری ہمارا استقبال کرے گا۔

حضرات! آپ اگر میرے اس مشورے پر عمل کریں اور سندھ ساگر پارٹی بنالیں تو اس وقت میں سیاسی امور میں شریک رہوں گا۔ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ سندھ سے باہر کسی عوام کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں پیدا کروں گا اگر آپ کو اس طرح کی سیاست کامیاب بنانا منظور نہیں تو میں امام ولی اللہ کے فلسفے کی تعلیم میں اپنا وقت صرف کروں گا۔

واللہ الموفق وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

اکتوبر ۱۹۳۹ء

حواشی

(۱) حضرت سندھی نے ۲۲ رمضان ۱۳۵۷ھ ھجری مطابق ۱۴ نومبر ۱۹۳۸ء کو پارٹی پروگرام کا یہ مسودہ تحریر فرمایا تھا' جو اس کتاب کے مقالہ نمبر ۴ کے طور پر قارئین کی نظر سے گذر چکا ہے۔

(۲) حضرت سندھیؒ نے اس مسودہ کی اساس پر ۱۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ''جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی'' کے نام سے مفصل پروگرام جاری کر دیا تھا جو آئندہ صفحات میں نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔

مقالہ نمبر ۱۰

جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی

کا

اساسی پروگرام

۱۰ دسمبر ۱۹۳۹ء

پس منظر

[بیسوی صدی کی چوتھی دھائی میں ہندوستان کی معروضی صورتحال کیا تھی؟ علاقائی تقاضے کیا چاہتے تھے؟ حضرت مولانا سندھیؒ کا دماغ ان کا ادراک کرنے اور ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں سوچ بچار میں مصروف تھا۔ ایک طرف ہندوستان کے معروضی سیاسی اور اقتصادی تقاضے تھے، تو دوسری طرف یہاں موجود سیاسی پارٹیوں کی صورتحال بڑی عجیب وغریب تھی۔ مہاتما گاندھی کے مذہبی خیالات کے ماتحت کانگریس ایک خاص طرز عمل کا مظاہرہ کر رہی تھی، تو مسلم لیگ کے لیڈر مذہبی بنیادوں پر ہندوستان کی وحدت کو تقسیم کرنے کے درپے تھے، دونوں کے درمیان خلیج دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ جس سے اس علاقہ کے سیاسی اور اقتصادی مستقبل پر بھیانک سایے بڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔

ایسے میں اس بات کی ضرورت تھی کہ برصغیر کے علاقائی، سیاسی اور اقتصادی قومی مفاد کو سامنے رکھ کر قومی اور ملی تقاضوں کے مطابق فیصلے کئے جائیں، اصل بات قومی سطح پر سیاسی شعور اُجاگر کرنے کی تھی۔ اس سلسلہ میں حضرت سندھیؒ نے "جمنا، نربدا، سندھ ساگر" کے نام سے ایک پارٹی قائم کی۔ اس حوالے سے ۱۹۳۸ء میں آپ نے مکہ مکرمہ میں ہی

ایک ابتدائی مسودہ اور خاکہ تیار کر لیا تھا۔ جو گذشتہ صفحات میں قارئین کے سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہندوستان پہنچ کر تقریباً ایک سال بعد آپ نے ۱۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کو باقاعدہ طور اس پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اور اس کا اساسی پروگرام اور اصول وقواعد آپ نے تحریر فرمائے، جنہیں آئندہ صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔ ہمیں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب آف کراچی کے ایک مضمون سے اس پارٹی کا 'فارم ممبری' کا نمونہ بھی دستیاب ہو گیا، وہ بھی آخر میں شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔ اسی طرح ۳ ستمبر ۱۹۴۰ء کو آپ نے ''ہم کیا چاہتے ہیں؟'' کے عنوان سے اس پارٹی کے اغراض ومقاصد پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ وہ بھی اپنی جگہ پر اس کتاب میں شامل ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ آزاد]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ

کھول کر آنکھیں میرے آئینہ گفتار میں آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

(اقبال)

جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی

کا

اساسی پروگرام

تمھید

اِنَّ وَلِیّیَ اللہُ الَّذِی نَزَّلَ الکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِینَ.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی سیّدنا محمد سیّد المرسلین وخاتم النبیین وعلٰی اٰلہ واصحابہٖ واَتباعہ من ائمة الدین وعباداللہ الصالحین وبارک وسلم. اما بعد.

آج ہم نے خدا کا نام لے کر اور اسی کی مدد پر اعتماد کر کے شمال مغربی ہند کی نئی سیاسی جماعت ''جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی'' کے پہلے حصہ کا کام سندھ میں شروع کرنے

کاارادہ کیا ہے۔

پارٹی کے چند اساسی قواعد ہم نے ضبط کر لیے ہیں' تاکہ خواص کو دعوت دینے میں آسانی ہو۔ان میں سے اکثر وہی باتیں ہیں جو سیاسی مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک علوم متعارفہ (مشہورہ) کا حکم رکھتی ہیں۔اس لیے ان کی مزید تشریح کی اس مقدمہ میں ضرورت نہیں۔البتہ پارٹی کے میدان عمل کو محدود کرنے کا مسئلہ قابل ایضاح (وضاحت) ہے۔

جس مبّصر کو گذشتہ تیس برس کی تاریخ پیش نظر ہے' وہ سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان کا سیاسی تقدم اتنا مشکل نہیں جتنا اس سے پہلے سمجھا جاتا تھا۔لیکن یہ امر بھی ساتھ ہی منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ کھیل جب کبھی بن کر بگڑتا ہے تو اس کی تہہ میں ہندو مسلم اختلاف ہی باعثِ نقصان نظر آتا ہے۔اس اختلاف کو حل کرنے کے لیے متفرق طور پر سیاسی نظریات بنائے گئے مگر عملاً ''مرض بڑھتا گیا۔جوں جوں دوا کی'' کا منظر سامنے نظر آتا ہے۔

ہم نے عملی اشتراک کے ساتھ فکری اتحاد کا ضمیمہ بھی لگا دیا ہے۔اس طرح ایک نیا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔اس کے لیے ہم نے ایک ایسا قطعہ کا انتخاب کیا ہے جو دونوں تہذیبوں کا مرکز ہے۔

جس طرح گنگا جمنا کا دوآبہ ہندو تہذیب کا منبع ہے۔اسی طرح سندھ ساگر مسلم تہذیب کا معدن ہے۔اگر ہم ان دو عظیم الشان قطعات کا اپنے نظریہ پر سمجھوتہ کرا سکے' جو ان کی تالیفِ قلوب پر قادر ہو سکتا ہے تو اس لاینحل مشکل کی کلید (غیر حل شدہ سماجی مشکل کا حل) مل جائے گی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسکندریہ میں حکماء کا ایک طائفہ نیوفلاطونی پیدا ہوا تھا۔ اسی منہاج پر مسلمانوں میں کئی حکیم پیدا ہوئے جن میں سے الشیخ الاکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین السہروردی مشہور عالم ہیں۔

ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں صوفیہ کرام کی آمد شروع ہوئی۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بعد اس خاک سے تصوف کے چاروں طریقوں میں کثرت سے معرفت الٰہی میں کامل خدام انسانیت پیدا ہوئے۔ وہ سب اسی حکمتِ اشراقی کے امام تھے۔ مگر ایسا عالم جو اپنے انکشافات (کشف والہام) اور نظریات کی تدوین و تنظیم پر قادر ہوا امام ولی اللہ دہلوی جیسا پیدا نہیں ہوا۔

ان تمام ائمہ تصوف کا مرکزی فکر وحدت الوجود ہے' جو ویدانت فلاسفی کا اصل اصول ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اسی کی تہذیب و تکمیل سے انسانیت کی تشریح کی اور اسے کتاب وسنت کا بطن بنایا۔ جیسا کہ ان کی معرکتہ الآراء کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور ان کی فلسفی تصانیف ''البدور البازغہ'' اور ''التفہیمات الالٰہیہ'' وغیرہ سے واضح ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں اگر دونوں مذاہب کے خدام انسانیت اسی فلاسفی کو امام بنا کر تقدم کی جدوجہد میں مصروف ہو جائیں تو ہند ایک دفعہ پھر مجمع البحرین بن کر دنیا کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

ہمارے پرانے رفقاء میں سے اگر کوئی بزرگ ہمارا نیا انداز دیکھ کر چیں بہ جبیں ہوں تو ان کی خدمت میں مختصراً عرض ہے

؎ کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ہمارا اصلی مخاطب ہندوستانی نوجوان ہے

؎ نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند

جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

ترجمہ: میرے پیارے دوست میری نصیحت کو کان لگا کر (غور سے) سُن۔ سعادت مند نوجوان بوڑھے عقلمند کی نصیحت کو غور سے سُنا کرتے ہیں۔

جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کا (دستور العمل اور) پروگرام

پارٹی کا نام اور میدان عمل

(۱)

دارالرشاد السواد الاعظم، قاسم المعارف کے پرانے کارکن اور ان کے رفقاء جو وطنی خدمت کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کے اندر ایک مستقل پارٹی تشکیل کرتے ہیں جسے شمال مغربی ہند کے محدود رقبہ جات سے تعلق ہوگا۔

الف۔ پارٹی کا نام ''جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی'' ہوگا۔

ب۔ اس پارٹی کا میدان عمل چار حصوں میں منقسم ہوگا۔

۱۔ آج کا صوبہ سندھ جس کا مرکز کراچی ہے۔

۲۔ دریائے سندھ اور اس کے معاونین کی زمین جس کا مرکز لاہور ہے۔

۳۔ دوآبہ گنگا جمنا اور اس کا زیر اثر اجمیری بنارسی علاقہ جس کا مرکز دہلی ہے۔

۴۔ ہند کا ایسا حصہ جو اپنے فیصلہ سے پارٹی میں شامل ہو۔

فکری اساسی اصول

(۲)

اس پارٹی کے نظری اساسی اصول یہ ہیں:

الف۔ عدم تشدد کی پابندی سے کامل آزادی حاصل کرنا۔

اس تاریخی حقیقت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ مسیحیت نے عدم تشدد کی پابندی سے تین سو برس میں استقلال حاصل کیا تھا۔

ب۔ کاشت کار اور دست کار محنت کش کی معاشی حالت درست کرنا اور اسے ترقی دے کر یورپ کے محنت کش کے برابر لانا۔

جب تک ملک کی عام آبادی کی معاشی حالت ترقی نہ کرے سیاسی ترقی ناممکن ہے۔

ج۔ ہند کو ایک ملک نہیں بلکہ یورپ کی طرح مجموعہء ممالک ماننا۔ زبان اور معاشرت کو ملکی تقسیم کی اساس بنانا۔

د۔ ہر ایک ہندوستانی ملک یعنی جس میں ایک زبان بولی جاتی ہے اور اس کی معاشرت میں تقریباً یکسانی ہے' اس میں مستقل رہائش رکھنے والے ہر مرد اور عورت کا مساوی حق ماننا اور جمہوری نظام پر قومیت کو ترقی دینا۔ نسل' مذہب اور قدامت کو تفوق کا ذریعہ نہ بنانا۔

ہ۔ ایک ہندوستانی ملک کی عام آبادی کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دے کر ووٹ کی قیمت سمجھانا۔

تشریح: جو ہندوستانی زبانیں عربی حروف میں لکھی جاتی ہیں' ان کی تعمیم تعلیم (تعلیم کو عام کرنا) موجودہ رسم الخط کے ذریعہ سے نہایت دشوار ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ یا تو حروف علیحدہ علیحدہ لکھنے کو رواج دیا جائے یا رومن حروف میں لکھنا شروع کریں۔ دوسری صورت میں ٹائپ رائٹر سے بآسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم چونکہ جبری قوت استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لیے سمجھا بجھا کر بالتدریج کامیابی حاصل کریں گے۔

د۔ ترقی یافتہ یورپ کی صنائع کو اپنے ملک میں پیدا کرنے کے لیے اور وطن کی خدمت اور حفاظت میں مرد وعورت کو جواں مردی سکھلانے کے لیے یورپین معاشرت (یعنی صنعتی ترقی اور فوجی تنظیم) اختیار کرنا۔

تشریح: یورپین قوموں کی سیاسی برادری میں شامل ہوئے بغیر نہ تو ایشیا کی سیاسی ترقی آسان ہے نہ ہندوستان کی۔ اس لیے یہ معاشرتی انقلاب خوشی سے برداشت کر لینا چاہیئے۔ ورنہ ارتجاعی قوتیں ملک کو خاک سیاہ بنا دیں گی۔

ز۔ فکرٔ اخلاق اور سیاست میں یکسانی پیدا کرنے کے لیے امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت اور فلسفہ کو پارٹی کی عقلی اساس ماننا۔ اور اس راستہ سے انسانیت کی خدمت کے لیے تیار کرنا۔

تشریح: دوسری ہزار ہجری کی ابتداء سے یعنی جلال الدین اکبر کے زمانہ سے مسلمانان ہند کے مفکرین کا ایک طبقہ ابن عربی کے فلسفہ یا ویدانت

فلاسفی کی اصلاح اور تکمیل میں اس لیے مصروف رہا کہ اسے ہندوستانی زندگی کے لیے سیاسی اساس بنائے۔ امام ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ ان تمام مساعی کا نچوڑ ہے۔اس سے تمام ادیان میں تطبیق دی جاسکتی ہے۔اورانسانیت کی ارتقائی تاریخ کی تشریح ہوسکتی ہے۔

ح۔ ہندوستان کی وحدت کوفیڈ ریشن میں منحصر سمجھنا۔

ہندوستان کوایک ملک سمجھنا اسی قدر غلط ہے‘جیسے کوئی روس کونکال کر باقی یورپ کوایک ملک کہے۔

ط۔ فیڈ ریشن کی تکمیل کے لیے ایک کافی لمبی مدت تک ''برٹش کامن ویلتھ''میں رہنے کافیصلہ کرنا۔

ی۔ فیڈ ریشن کی زبان ترقی یافتہ ہندوستانی (اردو)اورانگریزی کو ماننا۔

تشریح: اردوکورومن حروف میں لکھ کر یورپین قوموں میں رواج دینااور مقطّع (الگ الگ) حروف میں لکھ کر ایشیائی قوموں میں پہنچانا اس مقصد کی تکمیل کے لیےضروری ہے۔

پارٹی کے عملی سیاسی اصول

(۳)

الف۔ پارٹی اپنے نظریات کوپھیلانے کے لیے خاص تعلیم گاہوں میں خدام خلق تیار کرے گی۔ فقط وہی لوگ پارٹی کے ممبر بن سکیں گے جو انسانیت کی خدمت کواپنا فرض قراردیں گے۔اورعدم تشدد کی پابندی

سے اس فرض کی تعمیل میں ہر قسم کی مشقت برداشت کرنے کا عہد کریں گے کہ ”وہ تکلیف دینے والوں پر کسی صورت میں ہاتھ نہیں اٹھائیں گے“۔

ب۔ پارٹی کے جس قدر ممبر حکومت میں شریک ہوں گے وہ اپنی کرسی پر ملک کے ہر فرد کے ساتھ یکساں معاملہ کریں گے۔ اور رشوت لینا بند کرائیں گے۔

ج۔ پارٹی کے تجارت پیشہ ممبر ناپ اور تول میں کمی بیشی نہیں کریں گے۔ حساب لکھنے میں خیانت نہیں کریں گے۔ ربا (سود) بند کرائیں گے۔

د۔ پارٹی کے زمیندار ممبر کاشتکار سے جو معاہدہ کریں گے۔ اس کے پابند رہیں گے۔ کاشتکار کے خاندان کی بڑھتی ہوئی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے میں پوری مدد دیں گے۔

ھ۔ پارٹی کے کاشتکار ممبر حکومت کا مقررہ خراج اور زمیندار کا حصہ معاہدہ کی پابندی سے پورا ادا کریں گے۔

و۔ پارٹی کے کاشتکار ممبر جس سے معاملہ کریں گے امانت کو اپنا شعار بنائیں گے۔

ز۔ پارٹی کے جس قدر ممبر علمی یا اخلاقی خدمت کرنے کے لیے مخصوص ہیں وہ اپنے ملک سے جہالت دور کرنے میں انتہائی جدوجہد کریں گے۔ وہ ادنیٰ ضروریاتِ زندگی پر اکتفا کریں گے۔

ح۔ پارٹی کے ہر تعلیم یافتہ ممبر کا فرض ہوگا کہ وہ ہر مرد عورت کو لکھنا پڑھنا

سکھائے۔

۱۔اپنی ملکی زبان میں۔

۲۔اپنی بین الاقوامی زبان میں۔

۳۔ ہر پابند مذہب کو اس کی مذہبی زبان میں۔

ط۔ پارٹی کے ہر اس ممبر کا جو اخلاقی استاد یا مرشد مانا جاتا ہے' فرض ہوگا کہ وہ اپنے ملکی بھائیوں کو حقوق کا احترام سکھلائیں۔ یہاں تک کہ ان کے ملک کا ہر شخص کسی انسان کے جان و مال' عزت کو نقصان پہنچانا اخلاقاً حرام سمجھے۔

ی۔ پارٹی کا ہر ممبر اپنی ضروریات زندگی خود کما کر حاصل کرے گا۔اس کا فرض ہوگا کہ ملک سے بے کاری کی زندگی کو ختم کر دے۔ ہر امیر غریب کو کسی نہ کسی طریقے سے محنت کش بنایا جائیگا۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

دار الرشاد سندھ ساگر

۱۰ دسمبر ۹۳۹ھ ھندی

جمنا' نربدا' سندھ ساگر پارٹی کا فارم ممبر شپ

Indian (Inter) National Congress

Jamna Narbada Sindh Sagar Party

وارڈ' گاؤں یا شہر کا نام______________ ______________ .No

رجسٹر______________

فارم ممبری

جناب سیکرٹری.................. ج۔ن۔سندھ ساگر اکیڈمی

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں انڈین نیشنل کانگریس کریڈ مانتا ہوں۔ وہ یہ ہے:

''ہندوستان کیلئے تمام جائز اور پُر امن ذرائع سے کامل آزادی حاصل کرنا''۔

میں نیشنل کانگریس کے اندر جمنا' نربدا' سندھ ساگر پارٹی کے اساسی اصول پر ایک مستقل پارٹی قائم رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں ان تمام قواعد وضوابط کی پابندی کا وعدہ کرتا ہوں جو ج۔ن۔سندھ ساگر پارٹی کی کانگریس فیصلہ کرے گی۔

میں اپنی بدنی اور مالی تمام خدمات ج۔ن۔سندھ ساگر پارٹی کی انتظامی قوت کو دینے کیلئے آمادہ ہوں۔

پورا نام ....

ایڈریس ....

عمر .... پیشہ ....

مکان، رہائش یا ....

کاروبار ....

دستخط درخواست کنندہ

تاریخ درخواست ....

ممبری کی دعوت دینے والے کا نام ....

دستخط گواہ

آفس میں درخواست وصول ہونے کی تاریخ ....

دستخط سیکرٹری

مقالہ نمبر ۱۱

جمعیت خدام الحکمۃ کے اصول

۲۴ دسمبر ۱۹۳۹ء

پس منظر

[حضرت سندھیؒ نے سیاسی کام کیلئے ''جمنا' نربدا سندھ ساگر پارٹی'' بنائی' اور دین اسلام کے فلسفہ کو مربوط طور پر پیش کرنے کیلئے ''جمعیۃ خدام الحکمۃ'' کی تشکیل کی۔ مقصد یہ تھا کہ دورِ جدید کے فلسفوں کا توڑ پیدا کیا جائے چنانچہ ایک تحریر میں فرماتے ہیں:-

''جمعیۃ علماء ھند جیسی جماعت کو میں زور سے دعوت دیتا ہوں کہ وہ امام الائمہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ پر استقلالی نظر ڈالے' اور اپنے مدارس اور مجالس میں اس کو رواج دے''۔

غالباً اس مقصد کے لئے حضرت سندھیؒ نے ''جمعیۃ خدام الحکمۃ'' کی تشکیل کی تھی۔ اس کے اساسی اصول وضوابط وطریقۂ تعلیم آپ نے تحریری طور پر قلم بند فرمائی تھیں جو نذرِ قارئین ہیں۔ آزاد]

جمعیت خدّامُ الحکمۃ

اِنَّ ولِیّیَ اللہُ الَّذِی نَزَّلَ الکِتَبَ وَھُوَیَتَوَ لَّی الصّٰلِحِینَ.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین و صلی اللہ وسلم وبارک علٰی سیدنا محمد سید المرسلین و خاتم النبیین و علی اخوانہ من الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واتباعہ من ائمۃ الدین وعباداللہ الصالحین اجمعین!

امّابعد: آج بروز یک شنبہ ۱۲ ذی القعدہ الحرام ۱۳۵۸ھ (۲۴ دسمبر ۱۹۳۹ ہندی) دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) میں (اور ۱۶ ذی قعدہ کو ''مظہر العلوم'' کراچی میں) جمعیۃ العلماء کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا جاتا ہے' جو اسلامی فلاسفی کا خادم اور محافظ ہوگا۔ اگر خدا کو منظور ہے تو وہ ایک سوچے سمجھے ہوئے دینی پروگرام پر چل کر مسلمانوں کا تَشَتُّت (انتشار) دور کردے گا۔

واللہ الموفق والمعین.

جمعیۃ خدام الحکمۃ کے اصول

جمعیت کی تاسیس

(۱)

''جمنا' نربدا' سندھ ساگر پارٹی'' کے اراکین میں سے دارالرشاد کے علماء اور ان کے ساتھ مظہر العلوم کراچی کے علماء جمعیۃ العلماء سندھ میں ایک مستقل شعبہ کی تاسیس کرتے ہیں' جس کا نام ''جمعیۃ خدام الحکمۃ'' ہوگا۔

جمعیت کے اساسی اصول

(۲)

خدام الحکمۃ کے اساسی اصول نظری و عملی حسب ذیل ہوں گے۔

الف۔ امام ولی اللہ دہلوی (حکیم الہند) کو جمیع علوم شرعیہ مثلاً کتاب و سنت و حکمت و سیاست میں ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء ہندی) سے امام الہند تسلیم کرنا۔

ب۔ ان کی کتابوں:

(۱) الفوز الکبیر' فتح الرحمٰن' ازالۃ الخفاء۔

(۲) حجۃ اللہ البالغہ، مسوّی، مصفی۔

(۳) قول جمیل، الطاف القدس، لمعات۔

(۴) سطعات۔ لمحات۔ البدور البازغہ۔ الخیر الکثیر۔ تاویل الاحادیث۔

(۵) فیوض الحرمین۔ ''التفہیمات الالٰہیہ'' وغیرہ کو ان کی اصلی زبانوں میں پڑھنے پڑھانے کو مقصد حیات بنانا۔

ج۔ امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کی تشریح میں امام عبدالعزیز دہلوی کو امام ماننا۔ اور مولانا رفیع الدین کی ''تکمیل الاذہان'' مولانا محمد اسماعیل شہید کی ''عبقات'' مولانا محمد قاسم دیوبندی کی ''تقریر دل پذیر'' اور ''شرح حدیث ابی رزین'' اور ''قبلہ نما'' کو بطور مبادی پڑھنا پڑھانا۔

د۔ ہندی سیاست کو ترقی دینے کے لیے سندھ ساگر پارٹی یا اسی منہاج کی مستقل پارٹی کو انڈین نیشنل کانگریس میں قائم رکھنا اور مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہند کو اس سلسلہ کا استاد ماننا۔

ھ۔ ج، ن، سندھ ساگر پارٹی کے مراکز سیاسیہ دہلی، لاہور اور کراچی اور مراکز علمیہ دارالرشاد، مظہر العلوم، دارالعلوم دیوبند میں جمعیۃ خدام الحکمۃ کے مراکز ہوں گے۔

د۔ دارالرشاد کے مرکز میں جمعیۃ خدام الحکمۃ کی صدارت جناب پیر صاحب العلم دامت برکاتہم اور مظہر العلوم میں اس شعبہ کی صدارت جناب مہتمم (مولانا محمد صادق) صاحب زید مجدھم اور دارالعلوم دیوبند

میں جناب مہتمم صاحب (جناب قاری محمد طیب قاسمی) زید مجدھم کریں گے۔

ز۔ اس "جمعیۃ خدام الحکمۃ" کے محل اور مقام کو بیت الحکمۃ کہا جائے گا۔

ح۔ بیت الحکمۃ میں قرآن عظیم کی حکیمانہ تفسیر پڑھائی جائے گی۔

ط۔ بیت الحکمۃ میں فقط امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی تعلیم ہوسکتی ہے۔

ی۔ بیت الحکمۃ میں ایسا کتب خانہ جمع کیا جائے گا۔ جس کی مدد سے امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کا حکماء ہند اور حکماء یورپ کے فلسفہ سے مقابلہ کیا جاسکے۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین

مقالہ نمبر ۱۲

خطبۂ افتتاح

ٹھٹھہ (سندھ) ضلع کانگریس کمیٹی کانفرنس

منعقدہ ۱۲ جولائی ۱۹۴۰ء میں پڑھا

بسم اللہ الرّحمٰن الرَّحیم

اَللّٰھُمَّ مَا لِکَ المُلکِ تُوٴتیِ المُلکَ مَن تَشَآءُ وِ تنزِ عُ المُلکَ مِمَّن تَشَآءُ وَتُعِزُمَن تَشآءُ وَتُذِلُ مَن تَشَآءُ بِیَدِکَ الخَیر ط اِنَّکَ عَلیٰ کُلِّ شَیً قَدِیر“ ٥

تو رحیم وملک وبار ہے سَلَّم سَلَّم ہم جھول اور زیاں کار ہیں اِرحم اِرحم

بھائیو اور بہنو! آپ میں سے ہر ایسا مرد اور عورت جو دین دھرم کو مانتا ہے۔ اپنے خالق، اپنے سرجن ہار پر یقین رکھتا ہے۔ ایک منٹ کے لیے اُسے یاد کرے اور اپنی ارادی قوت کو جمع کر کے اُس سے دعا مانگے۔ پرارتھنا (دُعا) کرے کہ وہ ہمیں سیدھا راستہ دکھلائے

ذات پات پوچھے نہ کوئے ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

اَلحَمدُ للہِ وَسَلام“ عَلیٰ عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطفیٰ :-

امّا بعد! میں کانگریس کمیٹی کے کارکن ممبروں کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ انھوں نے مجھے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ اور سب سے پہلے تقریر کرنے کا موقعہ دیا۔ میں تمام حاضرین کو اس شکریہ میں شریک کرنا چاہتا ہوں کہ میری بات سننے کے لیے جمع ہوئے۔ میں اس یقین کے ساتھ اس کانفرنس کو شروع کرتا ہوں۔ کہ آپ جس نیک مقصد کے لیے اتنی تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں، اس میں کامیاب ہو کر رہیں گے۔ اگر چند گھڑیوں کی تاخیر ہو جائے تو مضائقہ نہیں، مسلسل کام کرنے والوں کی کامیابی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ میرا دل خوشی سے بھرا ہوا ہے کہ سندھ کے ایک تاریخی شہر میں ضلع کانگریس کمیٹی کی کانفرنس کا

افتتاح کرر ہا ہوں۔ یہ میرے لیے بہت بڑی عزت ہے۔ جو مجھے اپنے بھائیوں بہنوں کی طرف سے حاصل ہوئی۔

اس قدر زیادہ خوشی کے تین اسباب ہیں:

(۱) مجھے سندھ سے محبت ہے۔ یہ میرے دینی باپ (حافظ محمد صدیق صاحبؒ بھرچونڈی) کا وطن ہے میں نے اسے پچاس سال سے اپنا وطن بنالیا ہے۔ اس زمین کو سیراب کرنے والے دریا کی ہماری مذہبی کتابوں میں تقدیس کی گئی ہے ۔میں نے اس کے کنارہ پر بچپن سے پرورش پائی ہے۔

(۲) مجھے اس شہر سے محبت ہے۔ اس میں مقدس علماء اور عارفین کا بڑا مجمع رہا ہے۔ آخری زمانہ میں مخدوم محمد معینؒ کا گھر اسی شہر میں تھا۔ وہ شاہ عبداللطیفؒ کے ہم صحبت بزرگ تھے۔ اور انہوں نے ہمارے امام ولی اللہ دہلویؒ سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح یہ شہر ہماری حکمت کا ابتدا سے معدن (مرکز) ہے۔

(۳) مجھے نیشنل کانگریس سے محبت ہے۔ چونکہ دنیا کی نظر میں وہ ہمارے ملک کی معزز سیاسی مجلس ہے۔ میں سولہ سترہ برس کانگریس میں کام کرتا رہا ہوں۔ اسکا خادم ہونے کے نام سے مجھے بہت فائدے پہنچے ہیں۔ میں اُس سیاست کا مطالعہ کر سکا جس کے بعد مجھے امام ولی اللہ کی حکمت اور قرآن مجید سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ میں مدت سے تمنا کرتا رہا ہوں کہ اس قسم کے اجتماع میں شرکت نصیب ہو۔ جب ایک طرح کی مایوسی کے بعد خواہش پوری ہوتی ہے۔ تو اس خوشی کا ہر ایک شخص اندازہ نہیں کرسکتا۔

حضرات! عموماً سیاسی مجالس اس قسم کی عزت انہی لوگوں کو دیتی ہیں۔ جن سے ان کی قوت میں اضافہ ہو۔ میں اس امر کو صفائی سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں اس وقت

اس پوزیشن میں نہیں کہ میرے ساتھ بہت سے لوگ کانگریس کے ممبر بن جائیں یا میری وجہ سے کانگریس کمیٹی کو مالی مدد ملے۔ میں اس وقت یہی کر سکتا ہوں کہ اپنا سیاسی مطالعہ آپ کے سامنے پیش کر دوں۔

مجھے یہ بھی آپ کی خدمت میں عرض کر دینا چاہیئے کہ میں ہر دلعزیز بننے کی بھی کوشش نہیں کرتا۔ میں اب تک کانگریس کا پرائمری ممبر بھی نہیں بنا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے مشورے آزادی سے سنا سکوں۔ کسی اصطلاحی قانون کی پابندی نہ کرنے سے میں کانگریس سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ میں نیشنل کانگریس کا ہوں۔ نیشنل کانگریس میری ہے۔

البتہ وہ اُس پارٹی پروگرام کو کامیابی سے چلائے۔ جو ہم نے جمنا' نربدا' سندھ ساگر پارٹی کے نام سے شائع کیا ہے تو ہم کانگریس تحریک کو بہت آگے لے جائیں گے۔

آپ کی اجازت سے ہم اپنے مطالعہ کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ آخر میں بتلائیں گے کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔

مطالعہ کا پہلا دور

(۱۸۸۷ء تا ۱۹۱۵ء)

ہمارے مطالعہ کا پہلا حصہ وہ ہے۔ جو ہم نے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے حاصل کیا۔ میں پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوا۔ اور بچپن سے دریائے سندھ کے کنارے جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پرورش پائی۔ یہیں میں نے اسلام کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ اسلام میں نے ایک پنڈت سے سیکھا۔

ہمارے ملک میں برطانوی قبضہ کے بعد دو دفعہ ہندو سوسائٹی کی اصلاح شروع

ہوئی۔ دونوں میں اس قدر فرق ہے جیسے ایکس ٹری مسٹ اور ماڈریٹ میں ہوتا ہے:-

پہلی دفعہ پنڈت انت رام نے "پرانوں" کی شرک آمیز تعلیم کا اسلامی توحید سے مقابلہ کیا۔ اور آخر میں خود مسلمان ہو گیا۔ وہ مسلمانوں میں پنڈت مولوی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تحریک پنجاب میں خوب پھیلی۔ سینکڑوں ہندو نوجوان مسلمان ہو گئے۔ میں سولہ برس کی عمر میں ۱۸۸۷ء میں اُس کی کتاب "تحفۃ الہند" کو بار بار پڑھنے سے اسلام لایا۔ میں نے اپنا نام عبید اللہ 'پنڈت مولوی' کے نام پر خود رکھا ہے۔ میں نے اپنے ہم جماعت طالب علموں سے نماز پڑھنی سیکھ لی۔ اس زمانہ میں جب میں گھر پر تنہائی میں نماز پڑھتا۔ تو اس قدر سرور حاصل ہوتا جو اب تک باوجود اس قدر علم پڑھنے کے اور عمر گذارنے کے کبھی کبھی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس تحریک کو (ہندو سوسائٹی کے حوالے سے) انتہا پسند سمجھنا چاہیئے۔

دوسری تحریک پنڈت دیانند سرسوتی کی ہے وہ آریہ سماج کے لیے مرکز تلاش کرنے میں ملک ملک پھرے۔ مگر اس کا پنجاب کے سوا کہیں اچھا استقبال نہیں ہوا۔ پنجاب کی ہندو سوسائٹی پنڈت مولوی کی تحریک کے (مقابلہ کے) لیے آریہ سماج کی تائید میں پوری طرح متحد ہو گئی۔ پنڈت مولوی کا یہ کمال تو دشمن بھی مانتے ہیں کہ پرانک شرک سے ہندو سوسائٹی کو اس نے بچایا۔ آریہ سماج نے بھی اسی کی ہمزبانی اختیار کی۔ ہم اسے (ہندو سوسائٹی کے حوالے سے) اعتدال پسند کہتے ہیں۔

یہاں آپ کو ایک حکایت سناتا ہوں۔ جس سے دونوں تحریکوں کی اساسی وحدت آپ کو نظر آنے لگے۔

جب میں استنبول میں تھا۔ میرے ایک معمولی ڈاک سے سادہ خط لکھنے پر لالہ لاجپت رائے مجھ سے ملنے کے لیے وہاں پہنچے۔ انھوں نے استنبول پہنچنے کے لیے کیا کیا

ڈپلومیٹک تدبیریں اختیار کیں، میں ان سے بحث نہیں کرتا۔ ایک دن بر سبیل تذکرہ میں نے کہا کہ میری والدہ ایک دن رو رہی تھی، کہ میری موت کے بعد گائے بخشنے والا کوئی نہیں رہا۔ میں نے اسے کہا کہ تو خود برہمن کو گائے دے دے۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگی۔ تو مجھے گائے لا کر دے سکتا ہے، میں اس کے لیے گائے خرید لایا۔ اور وہ برہمن کو دے آئی تو خوش ہو گئی۔ لالہ جی نے کہا۔ جب میں آریہ سماج میں داخل ہوا تو میری والدہ بھی اسی خیال سے رونے لگی۔ اور میں نے بھی یہی علاج کیا جس سے وہ خوش ہو گئی۔

میں اسلام لانے کے بعد مدرسہ دیوبند میں داخل ہوا۔ میرے دینی استاد مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہند ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہو کر میں اپنے استاد کی سیاسی تحریک میں شامل ہو گیا۔

دیوبندی سیاسی تحریک: یہاں دیوبند کی سیاسی تحریک سمجھانے کے لیے چند کلمات لکھنے کی اجازت دیجیے۔ دہلی کے مسلمان لیڈر ۱۸۵۷ء کے بعد دو سیاسی جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ کوآپریٹر۔ نان کوآپریٹر (انگریزوں سے تعاون کرنے والے اور عدم تعاون والے)۔ پہلی جماعت کے لیڈر سر سید احمد خان ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی ان کی مرکزی تعلیم گاہ ہے۔ دوسری جماعت کے پیشوا مولانا محمد قاسم دیوبندی ہیں۔ دار العلوم دیوبند ان کا علمی اور سیاسی مرکز رہا ہے۔ دیوبندی اسکول ہند کو کیا سمجھتا ہے۔ اسکے لیے سبحۃ المرجان (عربی تاریخ) ہند پڑھنی چاہیئے۔ قدیم مذاہب ہند کے متعلق ان کے نظریات مرزا مظہر جانجاناں اور امام عبدالعزیز دہلوی کے مکتوبات میں ملیں گے۔

میں ان کی ترجمانی مختصر الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ ہمارا ہندوستان دنیا کی تاریخ میں عظیم الشان رفعت کا مالک ہے۔

پہلے (ہندو تہذیب کے) دور میں اس نے سنسکرت جیسی زبان پیدا کی۔ کلیلہ دمنہ

جیسی حکمت کی کتاب لکھی۔ فوجی تمرین کا کھیل شطرنج ایجاد کیا۔ ریاضی میں یونان کا ہمسر بنا۔ الٰہیات میں ویدانت فلاسفی سکھانے میں ''جگت گرو'' بنا۔ اس سے ویدک دھرم اور بودھ دھرم دنیا میں پھیلے۔ اس نے مہاراجہ اشوک جیسے حکمران پیدا کیے۔

دوسرے (مسلم تہذیب کے) دور میں قدیم انسانیت کی علمبردار سوسائٹی کو اسلام جیسے انٹرنیشنل پروگرام سے آشنا کرنے والا جلال الدین اکبر پیدا کیا۔ اس نے مشرقی ایشیا کی زبانوں کو ملا کر اردو جیسی انٹرنیشنل زبان پیدا کی۔ جس نے محی الدین عالمگیر جیسا سلطان پیدا کیا۔ جو تمام ممالک ہند کو ایک قانون کا پابند بنانا سکھا گیا۔ جس نے امام ولی اللہ جیسا فلاسفر پیدا کیا۔

تاریخ کے دونوں زمانوں میں ہمارے ملک کی اس طرح ہتک نہیں ہو سکی کہ کوئی قوم باہر بیٹھ کر ہم پر حکومت کرے۔ لیکن جب سے دہلی پر برطانوی قبضہ ہوا۔ ہمارے ملک کے نورانی چہرہ پر غلامی کا سیاہ داغ لگ گیا۔

دیوبندی اسکول کا نصب العین یہ ہے کہ اس دھبہ کو دور کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہا ہے۔ یہ اسکول اب تک تین دفعہ اپنے پروگرام میں مناسب وقت پر تبدیلی کر چکا ہے۔ یورپ کی آج کی سائنٹیفک اصطلاح میں اس سیاسی گروپ کو ایک سیاسی پارٹی نہ بھی کہا جائے تو ہم اسے تسلیم کرتے ہیں' مگر ملک میں اس کی قوت اور طاقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خلافت تحریک میں اس کا مظاہرہ ہو چکا ہے۔

دیوبندی لیڈر: لوگوں کو شاید معلوم نہ ہو کہ حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری بھی میرے استاد کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی کو ڈاکٹر انصاری نے شیخ الہند سے ملایا۔ اس کے بعد شیخ الہند نے اپنی جماعت کو مولانا محمد علی کے تابع کر دیا۔ اس دن سے مولانا محمد علی مسلمانان ہند کے واحد لیڈر رہے۔ اور دہلی کے دونوں اسکول (علی گڑھ اور

دیوبند) مل کرایک ہو گئے۔اس متحدہ طاقت نے نیشنل کانگریس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔اس کے اندر مرکزی فکر اسی نان کوآپریٹر دیوبندی اسکول کا غالب رہا۔

اس مجمع میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت مستقل حیثیت رکھتی تھی جو حکیم اجمل خان کے ساتھ مٹی ہوئی دہلی کا ایک نشان تھے۔

لوگوں کو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ مولانا شیخ الہند کا سندھ میں کس قدر اثر تھا۔ میرے مرشدوں کے سلسلہ میں مولانا تاج محمود امروٹی اور حضرت پیر صاحب العلم پیر راشد اللہ شاہ اور کراچی کے مدرسہ مظہر العلوم اور گوٹھ پیر جھنڈا کے مدرسہ دارالرشاد سے متعلق علماء کی جماعتیں سب دیوبندی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔مولانا محمد صادق رئیس جمعیۃ علماء سندھ اور ان کے بھائی شیخ محمد ابراہیم ایم۔اے دیوبندی اسکول کے خاص کارکن رہے ہیں۔

نان کوآپریشن اور دیوبند: لوگوں کو حیرت ہوگی کہ نان کوآپریشن کی تحریک جو خلافت کے زمانے میں کانگریس نے قبول کی ہے۔ وہ مدرسہ دارالرشاد کے ایک دیوبندی استاد مولانا نورالحق کی تجویز تھی۔مولانا نورالحق جناب پیر صاحب العلم کے ایک سیکرٹری تھے۔

میں ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) سے اس دیوبندی اسکول کا سیاسی کام کرتا ہوں ۱۹۱۵ء میں مجھے شیخ الہند نے کابل جانے کا حکم دیا۔ جہاں میں آزادی پسند ہندو دوستوں سے مل کر ہندوستانی کام کرتا رہا۔ برٹش ایمپائر سے باہر سب سے پہلی کانگریس کمیٹی کابل میں، میں نے قائم کی۔گیا سیشن میں اس کا الحاق کانگریس نے قبول کرلیا۔کابل کانگریس کمیٹی کو دیوبندی اسکول چلاتا رہا ہے۔داخلی امور میں مولانا کفایت اللہ جیسا عقل مند عالم اور مولانا حسین احمد جیسا ثابت قدم مسلسل کام کرتے رہے ہیں۔یہ سب حضرت مولانا شیخ الہندؒ کے خادم ہیں۔

مطالعہ کا دوسرا دور

(۱۹۱۵ء تا ۱۹۳۹ء)

اپنی تعلیم اوراپنے سیاسی مسلک کو سمجھانے کے بعد اب ہم اپنے مطالعہ کا دوسرا حصہ شروع کرتے ہیں۔ یعنی بائیس برس باہر رہ کر ہندوستان اور یورپ سے کیا کچھ سیکھ سکے۔

ہم نے مہاتماجی سے نان وائلینس سیکھا۔ ہم پنڈت موتی لال نہرو کوشمالی ہند اور لوکمانیہ تلک مہاراج کو دکن میں نیشنل کانگریس کا مستقل رہنما مانتے ہیں۔

یورپ میں دوتحریکیں کارفرما ہیں۔(۱) لبرل ازم اور (۲) ماکنیکل ازم۔

پہلی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے اکثر ممالک جمہوریہ بن گئے۔ حکومت بادشاہ کے نام سے ہو یا منتخب رئیس کے نام سے۔ بہر دوصورت ملک کی اہل الرائے پارلیمنٹ کے مشورہ سے کام ہورہا ہے۔اس طرز حکومت میں برطانیہ یورپ کے لیے استاد کا کام کرتا رہا ہے۔

دوسری تحریک کے متعلق ذرا وضاحت سے بیان کی ضروت ہے' پچھلی صدی سے یورپ تنہا ہمارے ملک سے نہیں بلکہ اکثر مشرقی ممالک سے بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ یہ ترقی مذہب یا تہذیب کی نہیں ہوئی۔ دیکھئے ہمارا ملک آج تک باوجود ہزارہا کوششوں کے اس معاملہ میں ہار نہیں مانتا۔ یورپ کی یہ ترقی دراصل ماکنیکل ازم میں ہے۔ یورپین اقوام نے چھوٹے بڑے کام کے لیے اس قدر مشینیں بنائی ہیں کہ مشرقی ممالک اس کے مقابلہ سے عاجز آ گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشینیں کاریگروں کے سوا کام نہیں کرتیں۔ ان کاریگروں کو یورپ میں مزدور کہا جاتا ہے۔ آپ انھیں اپنے ملک کے

ناتربیت یافتہ مزدور نہ سمجھ لیجیے گا۔ اس مزدور جماعت کا ایک نمائندہ برٹش ایمپائر کا پرائم منسٹر رہ چکا ہے۔

مشین کا خاصہ ہے کہ وہ تمام کاریگروں کو منظّم کر دیتی ہے۔ ایک مشین کے ساتھ کام کرنے والے مزدوروں کی ایک جماعت جب تک ایسی متحد نہ ہو جائے گویا وہ ایک فرد واحد ہے' اس وقت تک کسی کاریگر کو روٹی کا ٹکڑا نصیب نہیں ہوتا۔

حضرات آپ جانتے ہیں کہ ایک صدی سے ہمارے ملک پر برطانیہ حکومت کر رہا ہے۔ اس نے اپنا قبضہ جمانے کے لیے جو کام کیے۔ اس وقت تھوڑی دیر کے لیے ان سے قطع تعلق کر لیجیے۔ لیکن جب اس نے ملک پر اپنی حکومت قائم کر لی تو اس نے ہمیں جمہوریت سکھلانا شروع کر دیا۔ اس کی بنائی ہوئی یونیورسٹیوں نے ہمارے نوجوانوں کو جمہوریت پسند بنا دیا۔ ہمارے ملک میں اسمبلی اور کونسل اسی جمہوریت پسند عناصر کو راضی کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اب ہندوستانی راجہ اور نواب کی حکومت بھی اپنے ملک کی مشیر پارلیمنٹ کے سوا نہیں چل سکتی۔ یہ سب اسی جمہوریت پسندی کی برکت ہے۔

جیسے برطانیہ نے ہمیں لبرل ازم سکھایا۔ اسی طرح انہوں نے ہمارے ملک کو مشین سے بھی آشنا کر دیا ہے۔ مشین کا سب سے بڑا کارخانہ ہمارے ملک میں ریلوے کا جال ہے جو تمام اطراف مین بچھا دیا گیا ہے۔ اس نے ہمارے ملک میں بھی مشین سے کام کرنے والی جماعتیں پیدا کر دی ہیں۔

ہمارے نوجوان اگر دنیا کی قوموں کے ساتھ چلنا چاہتے ہین تو انھیں اس معاملہ مین برطانیہ کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ ہم نے اپنی سیاحت میں دیکھا کہ ترک' ایرانی' افغانی اور عرب اپنے ممالک میں جمہوریت اور مشین کو ترقی دے رہے ہیں۔ ہمارا ہندوستان اس

معاملہ میں ان سے بہت آگے ہے۔

یہ یورپ کی ترقی کا روشن پہلو تھا۔ اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کیجیے۔ اس ترقی یافتہ یورپ کو ہم ایک مصیبت میں مبتلا دیکھتے ہیں۔ یورپ کی جس قدر قومیں جمہوریت پسند ہیں۔ اور مشین کے استعمال سے دنیا پر برتری حاصل کر چکی ہیں۔ اگر ان کی پارلیمنٹ میں محافظین اور لبرل کی اکثریت ہے تو ان قوموں کو ایک خطرناک انقلاب ڈرا رہا ہے۔ ان کی پارلیمنٹ میں کاریگروں کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ چونکہ یہ کاریگر اور مزدور ایک طویل زمانہ سے کنزرویٹو اور لبرل کے ظلم کا شکار ہوتے رہے ہیں' اس لیے ان سے انتقام کا جذبہ مزدوروں میں پیدا ہونا ضروری ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ جن ملکوں میں مشین پر کام کرنے والے انقلاب پیدا کریں گے۔ اس وقت اگر ملک کے کاشت کار بھی منظم ہو چکے ہوں تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔

اس لیے اس قسم کے انقلاب کا اثر پہلے درجے پر تو نہیں البتہ دوسرے یا تیسرے درجہ پر ہمارے ملک میں بھی آئے گا۔ اگرچہ ہم انقلاب کے ضمن میں آج پہلی صف میں کھڑے نہیں ہو سکتے۔ مگر دوسرے یا تیسرے دن ہم پر وہ سب کچھ عائد ہو سکتا ہے۔ جو یورپ کی جمہوریت پسند اقوام پر آج وارد ہوگا۔

اس قدر جان لینے کے بعد ہماری رائے میں اب کوئی تذبذب نہیں رہا۔ ہم ماکنیکل ازم کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ ورنہ مالی ترقی سے ہمارا ملک محروم ہوگا۔ اور وہ دوسروں کا اچھوت اور غلام بن کر رہ جائے گا۔ البتہ یوروپین قوموں کے لیے جو مصیبت آ رہی ہے اس سے ہم کسی قدر مامون ہیں۔

لیکن ایک ایسے انسان کے لیے جو مذہبی جماعتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہی

مصیبت ایک اور راستہ سے آتی ہے۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ مذہبی قانون تو الگ رہا سرے سے خدا کا انکار بھی عام طور پر ضروری ہو گیا ہے۔ میں چونکہ مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لیے اس مشکل کا علاج برابر سوچتا رہا ہوں۔ مجھے اس سلسلہ میں مسئلہ وحدت الوجود کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ملا جس سے کہ ایک سائنس دان کو خدا کے وجود کا یقین دلایا جا سکے۔

چونکہ یہ مسئلہ ہندو فلاسفی کا بھی اصل اصول ہے۔ ایسے ہی امام ولی اللہ اسی کو مان کر حکمت اور فلسفہ کا ایسا اسکول قائم کرتے ہیں جس سے تمام مذاہب اپنی تشنگی رفع کر سکتے ہیں۔ اس لیے میری مستقل رائے یہ ہے کہ

(۱) مادی ترقی کے لیے ہمیں یورپ کے 'لبرل ازم' اور 'ماکینیکل ازم' دونوں کو بخوشی قبول کر لینا چاہیے۔ جیسے ترکی وغیرہ ممالک میں ہو رہا ہے۔ میں اس مجموعہ کو یورپین ازم کہتا ہوں جیسے کہ کمال پاشا نے اپنے دیہاتیوں کو استنبولیوں کے برابر بنا دیا۔ میں اسی طرح اپنے کاشت کاروں کو علی گڑھ سوسائٹی کے اعلیٰ درجہ پر لانا چاہتا ہوں۔

جب امیروں کی اولاد نے یورپین ازم سیکھا۔ تو گھر بیچ کر یورپ سے عیاشی کا سامان خرید لائے۔ نہ انہوں نے علم سیکھا نہ فن جس سے قوم میں ترقی پیدا ہوتی' ادنیٰ طبقہ اگر یورپین معاشرت اختیار کرے گا تو زیادہ کمائے گا اور اپنی کمائی خود کھائے گا۔ اگر چہ اعلیٰ طبقہ کو یہ امر ناپسند ہو گا۔ مگر اس انقلابی دور میں انہیں سب کچھ مان لینا چاہیئے۔

(۲) روحانی یا مذہبی حفاظت کے لیے امام ولی اللہ کی فلاسفی پڑھانی چاہیئے۔ جس قدر ہندو ویدانت فلاسفی مانتے ہیں۔ ان کو چند منٹ میں ولی اللہ فلاسفی سکھلائی جا سکتی ہے۔

ہمارے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ سندھ ساگر پارٹی پروگرام میں' ہم نے ان دونوں

امور کو اساسی اصول میں داخل کر دیا ہے۔

مطالعہ کا تیسرا دور

(مارچ ۱۹۳۹ء کے بعد)

اب یہاں سے میں اپنے مطالعہ کا تیسرا حصہ شروع کرتا ہوں۔ ہند میں واپس آنے کے بعد ہم نے کیا سمجھا ہے۔ اسے چار نمبروں میں علیحدہ علیحدہ بتلاتے ہیں۔

(۱)

سب سے پہلے ہم پر یہ تلخ حقیقت منکشف ہوئی کہ مسلمانوں کے دیو بندی اور علی گڑھی دونوں اسکول آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ آپ کی اجازت سے پہلے تمہیدی طور پر نیشنل کانگریس کے بعض تاریخی واقعات یاد دلاتا ہوں۔ اس کے بعد سب افتراق کو واضح کر دوں گا۔

کانگریس میں انقلابی تحریک دو دفعہ جاری کی گئی ہے۔ پہلی دفعہ تقسیم بنگال کی تنسیخ کے لیے۔ اس کا مرکز کلکتہ کا نوجوان بنگالی تھا۔ یعنی کام کرنے والے اپنے ملک کے لیے کام کرتے تھے۔ وہ ایجی ٹیشن بنگال کی فتح یابی پر ختم ہوا۔ اس کے بعد حالات معمولی رفتار سے چلتے رہے۔

دوسری دفعہ احیائے خلافت کے لیے۔ اس ایجی ٹیشن کا مرکز دہلی کا مسلمان ہے جو دیو بند اور علی گڑھ کے اتحاد اور اتصال سے پیدا ہوا تھا۔ یہ تحریک ناکامی پر ختم ہوئی۔

اس کا اصل سبب اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے سوا اور کوئی وجہ دکھائی نہیں دے گی کہ کام کرنے والے دوسرے ملک کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس دوسرے ملک میں

انقلاب آیا۔ پُرانا ترک شکست کھا کر ختم ہو چکا تھا۔ نئے ترک کے لیے نئی زندگی کے ساتھ خلافت کا سنبھالنا ناممکن تھا۔ اس نے خلافت کو منسوخ کر کے اپنی قومی حکومت یورپین نمونے پر بنائی اور اپنے گھر کی ترقی میں منہمک ہو گیا۔ خلافت منسوخ ہونے پر ہندوستانی مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

ہندو مسلم سمجھوتہ (میثاق لکھنو) میں پہلے ایک غلطی رہ گئی تھی۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس میں سے کچھ حصہ لے کر اقلیت کے صوبوں کو عموماً اور یو۔ پی کی اقلیت کو خصوصاً زیادہ حق دیا گیا تھا۔ اس طرح مسلمان ہر حصہء ہندوستان میں اقلیت بن کر رہ گیا۔ جیسے وہ سارے ہند کی مجموعی آبادی میں باوجود ستر ملین ہونے کے اقلیت میں شمار ہوتا ہے۔ خلافت کی کامیابی کی امید پر وہ اس وقت تو راضی ہو گیا۔ لیکن جب خلافت کی تحریک ٹوٹ گئی۔ تو ہر ایک مسلمان اس سمجھوتہ پر نظر ثانی کرانے کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔ اس مقصد کے لیے کونسل و اسمبلی میں جانا چاہیئے تھا۔ علی گڑھ پارٹی نئے طرز پر منظّم تھی۔ وہ تھوڑی دور پیچھے جا کر مسلم لیگ میں داخل ہو گئی۔ اور ہندو اکثریت کے خلاف محاذ بنانے میں کامیاب ہو گئی۔

دیوبند کی پُرانی مذہبی تنظیم پر بھی اسی دیوبندی جماعت کے ارتجاعی[1] لوگ غالب آ گئے۔ اور مسلم لیگ سے مل گئے۔ اس طرح عوام مسلمانوں کو کانگریس سے کوئی تعلق نہ رہا۔

---

[1] میں اپنے دیوبندی گروپ کو اس ارتجاعی جماعت کے پنجہ سے نکال کر اپنے استاد مولانا شیخ الہندؒ کے مقصد کو نصب العین کا درجہ دے کر آج کل کی پولیٹکل سائنس کے اصول پر پارٹی کی شکل میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ انڈین نیشنل کانگریس سے باہر رہ کر میرے لیے اس پروگرام کی تکمیل ناممکن ہے۔ اس لئے میں نے مکہ معظمہ سے لکھا تھا کہ میں ہمیشہ انڈین نیشنل کانگریس میں رہوں گا۔ مگر موجودہ پارٹیوں میں شامل نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی مناسب ہوگا' اپنی مستقل پارٹی بنا کر کام کروں گا۔ اب میں نے اس پارٹی کا پروگرام شروع کر دیا ہے۔ اللہ ھو الموفق (عبیداللہ)

فقط دیوبند کا ترقی کن عنصر جمعیۃ العلماء یا احرار میں بڑھ رہا ہے۔ اور کچھ لبرل مسلمان بھی کانگریس میں نیشنل پروگرام کے حامی ہیں۔

(۲)

مسلمانوں کی اس تفریق کو نیشنل کانگریس کے طرزِ عمل نے کم کرنے کی بجائے اور بڑھا دیا۔ آپ اگر اجازت دیں تو اسے ذرا واضح کر دوں۔

جب خلافت ٹوٹ گئی تو کانگریسی رہنماؤں نے اپنی ڈپلومیٹک عقلمندی سے بالتدریج کانگریس کو سوراج کے لیے مخصوص کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ ان پر خلافت تحریک یا مسلمانوں کی نیشنل خدمات کا اتنا اثر بھی نہ رہا۔ کہ وہ مسلمان کو ہندوستانی وطنیت میں اس کی تعداد کے موافق ہی انصاف سے حق دیتے یا دینے پر تیار رہتے۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں اگر کانگریس ہندوؤں کو جارحانہ پیش قدمی سے روک سکتی۔ تو معاملہ اتنا نہ بگڑتا۔ کانگریس کے تیز گام اور فلاسفر لیڈروں نے انٹرنیشنل ازم کو سامنے رکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کے معاملہ میں نیشنل انصاف سے تغافل برتا۔ اس طرح ہندو ازم کی جارحانہ اکثریت کے لیے انہوں نے کانگریس کے نام سے راستہ صاف کر دیا۔ اس حرکت نے معاملہ کو بد سے بدتر بنا دیا۔ یہاں تک کہ جمعیۃ العلماء اور احرار کے دیوبندی لیڈر بھی عوام کے سامنے کانگریس کا نام آج نہیں لے سکتے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو شروع سے اس ایجی ٹیشن میں کانگریس کے عام نیشنلسٹ لیڈروں کے ساتھ خلافت اور سوراج کے لیے شریک ہوئے تھے۔ لیکن آج وہ بغیر کسی خاص پروگرام کے سردار پٹیل کی ڈکٹیٹرشپ کے نیچے روندے جا رہے ہیں۔

(۳)

اس کے بعد دوسری حقیقت اس سے بھی زیادہ تلخ منکشف ہوئی۔اجازت دیجیے کہ اس کی تفصیل سناؤں۔

انڈین نیشنل کانگریس کی ترقی حقیقت میں لبرل کے دل و دماغ کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے۔اجلاس سورت سے کانگریس میں انقلابی آئے اور خلافت ایجی ٹیشن کی ابتداء میں مہاتما جی نے انقلابیوں کے لیے لبرلوں کو کانگریس سے نکال دیا۔ ہمارے خیال میں اب اس انقلابی میں کانگریس کو سنبھالنے کی طاقت نظر نہیں آتی۔اور لبرل ہی ایک خاص رنگ میں انقلابی فلسفہ کا لبادہ پہن کر اس پر چھا گئے ہیں۔ چرخہ اور کھدر اور سردار پٹیل کی مختاریت اس کو اب آگے نہیں بڑھا سکتی۔ڈر ہے کہ بنگال علیحدہ نہ ہو جائے۔اس وقت کانگریس کو مہاتما جی کی تاریخی عظمت اور پنڈت جی کی آگے بڑھنے سے نہ رکنے والی ہمت اتفاقاً مل گئی ہیں۔اور اس طاقت سے کانگریس سانس لے رہی ہے۔

میرے لیے یہ نہایت مہیب انکشاف ہے کہ مسلم لیگ کی کانگریس سے لڑائی بھی درحقیقت ایک لبرل لیڈر کے انتقامی جذبہ کا مظاہرہ ہے۔

(۴)

یورپ کی جنگ پر اگرچہ ابھی چند ہفتے گزرے ہیں۔لیکن ہم اس کے متعلق باہر رہ کر بہت کچھ سنتے اور جانتے رہے ہیں۔ ہماری مستحکم رائے ہے کہ ہمیں اس وقت برطانیہ کی بلاشرط امداد کرنی چاہیئے۔ میں برطانیہ سے لڑنے والی طاقتوں کے ساتھ شریک رہ چکا ہوں۔اس وقت مذہبی نقطۂ نظر سے میں اسے اپنا فرض سمجھتا تھا۔ہم اس جنگ میں شکست کھا

گئے۔ مگر اپنے مذہبی فیصلہ کی صحت کا اب بھی یقین رکھتے ہیں۔

لیکن آج حالات مختلف ہیں۔ برطانیہ کی مسلمانوں سے کوئی مذہبی جنگ نہیں۔ ہم اپنے سیاسی مطالعہ کے موافق اپنے ملک کے لیے برطانیہ سے اس وقت پرخاش غلط سمجھتے ہیں۔ اس ایجی ٹیشن کا مطلب دوسری قومیں صحیح نہیں سمجھ سکتیں۔ ہمیں عدم تشدد کی پابندی سے ترقی کا جو موقع برٹش کامن ویلتھ میں رہ کر مل سکتا ہے۔ دوسری صورت میں نظر نہیں آتا۔

حضرات! میرے مطالعہ کے تینوں حصے کچھ مجمل کچھ مفصّل آپ کے سامنے آ گئے۔ اب میں آئندہ کے متعلق اپنے ارادے آپ کو سناتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نے نیشنل کانگریس کے اندر ایک نئی پارٹی کا اساسی نظام شائع کیا ہے۔ وہ سندھی اردو اور انگریزی میں چھپ چکا ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اسے پڑھیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کس قدر بے انصافی کسی ہندوستانی سے کی جا سکتی ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا اینگلو انڈین۔ یعنی ہر وہ شخص جس نے ہند میں مستقل رہائش کا فیصلہ کر لیا ہو۔ اس کے معاملات میں بے انصافی کے انسداد (روکنے) کی کوشش کی گئی ہے۔

مسلمانوں کو اپنی اکثریت کے صوبوں میں مطمئن کرنا نیشنل کانگریس کا فرض تھا اور فرض ہے۔ انٹرنیشنل ازم اور فلاسفی کے خاص اصول اور اتحاد زبان کے موٹے موٹے ناموں سے اسے پریشان کیا جاتا ہے۔ ہماری پارٹی کے پروگرام میں اس کی پوری مدافعت ہے۔

اس طرح ہر ایک سنجیدہ سمجھ دار مسلمان کو مطمئن کر کے ہم نیشنل کانگریس میں لے آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام بہت پہلے ہونا چاہیئے تھا

ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔

آج کیا ہوگا: اس وقت میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کانگریس کے اندر رہ کر میں کیا کام کرنا چاہتا ہوں اور نوجوانوں سے کس امداد کا طالب ہوں۔ اس کو بھی میں تین مرکزوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ ذکر کردیتا ہوں۔

میری پارٹی کا پہلا مرکز کراچی ہے۔ یہاں سے میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک سندھی کو لکھنا پڑھنا سکھلاؤں۔ اسے نیشنل تعلیم دے کر اپنے ووٹ کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا طریقہ بتلاؤں۔ یہ میرا پہلا قدم ہے۔

میرا پروگرام مستقل ہے جسے میں سات سال میں ختم کرسکتا ہوں۔ موجودہ ریفارم اسکیم کو میں بہت بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ اگر ہم ملک کی عام آبادی کو اس کے ذریعہ سے فائدہ حاصل کرنے کی سمجھ بوجھ دے سکیں۔

میری استدعا ہے کہ ہر ایک سندھی مجھ پر اعتماد کرے۔ میں انھیں دھوکا نہیں دوں گا۔ وہ مجھے اس سات سال کے پروگرام کا تجربہ کرنے میں مدد دے۔ حکومت کسی پارٹی کی ہو۔ میں اس سے کوآپریٹ کروں گا۔ میں الیکشن کی لڑائی نہیں لڑوں گا۔

اس قسم کا کام ذمہ داری سے پورا کرنے میں ایک دفعہ امتحان دے چکا ہوں۔ میں نے کابل میں سات سال مستقل پروگرام پر کام کیا ہے۔ امیر بدل گئے' نئے وزیر آئے۔ انقلاب آیا۔ مگر میرے پروگرام کو بدلنے کا کسی کو خیال تک نہیں آیا۔ کابل میں شاہی حکومت کے اندر ہندوستانی نیشنل کام سات سال تک جاری رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ مَیں اگرچہ ضعیف ہوں۔ بوڑھا ہوں۔ مگر میں اپنا کام بفضلہٖ تعالیٰ بہت جلد نوجوانوں کو سکھا دوں گا۔

حضرات! اس کام کو شروع کرنے کی تدبیریں کررہا تھا کہ سکھر کا واقعہ پیش آیا۔ اگر میں اس کی اصلاح میں حصہ نہیں لیتا تو میں اپنا پروگرام جاری نہیں کرسکوں گا۔ اس لیے

میں نے دارالرشاد کے مرکز سے ۹ جنوری (۱۹۴۰ء) کو ضلع حیدرآباد کے دیہات میں والنٹیر بھیجنے شروع کر دیئے جو گاؤں کی عام آبادی کو جمع کر کے ان کو آمادہ کریں گے کہ وہ اس گاؤں کے رہنے والے ہندوؤں کو اپنا بھائی سمجھ کر ان کی حفاظت اسی طرح کریں گے جیسے ہم اپنے اور عزیزوں کی کرتے ہیں۔ میں انتظام کروں گا کہ اس اقرار کے تین کاغذ لکھے جائیں۔ ان پر اس گاؤں کے سرکردہ لوگوں کے دستخط ہوں۔ ایک کاغذ میری پارٹی کے دفتر میں رہے گا۔ دوسری نقل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس بھیجیں گے۔ تیسرا کاغذ کانگریس کے دفتر میں جائے گا' میں نے ۱۰ جنوری کے ''ہندو'' میں پروفیسر نارائن داس کی تجویزیں پڑھی ہیں۔ غالباً یہ وہی پروفیسر ہیں۔ جن سے ہم دہلی میں ملے تھے۔ یقین ہے کہ ہمیں ضرور کامیابی ہوگی۔

ہجرت: اگر میری آواز مہاتما جی تک پہنچتی ہے تو میں ان سے التجا کروں گا کہ وہ کسی سندھی کو ہجرت کا مشورہ نہ دیں۔ میں ہجرت کا تجربہ اپنی ذات پر کر چکا ہوں۔ میں ہندوستانی مہاجروں کی کابل میں اور بلغاریہ اور سرویا کے ترک مہاجروں کی استنبول میں پریشانی دیکھ چکا ہوں۔ مہاتما جی نے میرے خیال میں اس لفظِ ہجرت کا پس منظر خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ میں سندھی ہوں۔ سندھیوں کو جانتا ہوں۔ وہ اگر غلطی کریں تو ایک سندھی انھیں راہِ راست پر لانے کی کوشش میں بآسانی کامیاب ہو سکتا ہے۔ وہ عموماً نیک طبع انسان ہیں۔ اس میں ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہیں۔ اس لیے غیر سندھی لوگ مجھے اپنا کام کرنے دیں۔ ایک ملک کے داخلی معاملات میں بیرونی مداخلت مفید ثابت نہیں ہوتی۔

میرا پروگرام نہایت صاف ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اگر کسی مسلمان نے کسی ہندو کا مال لوٹا ہے تو اسے واپس کر دیا جائے۔ اگر کسی مسلمان نے کسی ہندو کو قتل کیا ہے تو عدالت میں جا کر اپنے جرم کا اقرار کرے۔

یہ یاد رہے کہ اس وقت مَیں شہر کے فسادوں کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔اس کے لیے گورنمنٹ کے ذمہ دار افسروں کو کام کرنا چاہیئے ۔ دیہاتی اصلاح میں مَیں گورنمنٹ کا ایک مددگار بن کر کام کروں گا۔

مسٹر محمد علی جناح سندھی ہیں: میں نے سُنا ہے کہ مسلم لیگ کے ڈکٹیٹر مسٹر محمد علی جناح صاحب بالقابہ سندھی ہیں۔ میں ان کی خدمت میں آل انڈیا لیڈر کی حیثیت سے نہیں۔ بلکہ ایک سندھی ' ایک لبرل جنٹلمین کی حیثیت سے عرض کرتا ہوں کہ اگر مجھے کبھی ان سے ملنے کا موقع ملا تو میں ان کو دو باتیں ذہن نشین کرانے کی کوشش کروں گا۔

ا۔ کیوں انھیں کرسی چھوڑ کر زمین پر بیٹھنا چاہیے۔

۲۔ فیڈ ریشن سے ہماری کیا مراد ہے۔ میں کیوں فیڈ ریشن کے سوا ہندوستان کی ترقی کا کوئی امکان نہیں سمجھتا۔ افسوس ہے کہ ہماری نظر میں فیڈ ریشن (کا جونقشہ ہے اس کو) نہ تو کانگریس سمجھتی ہے نہ لیگ۔ کانگریس کو قائل کرنے کی ہمیں جلدی ہے۔لیکن لیگ کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانا ہم ضروری جانتے ہیں۔

لاہور: میری پارٹی کا دوسرا مرکز لاہور ہے۔ مہاتما جی تصریح کر چکے ہیں۔ کہ ان کا ذاتی فیصلہ یہی ہے کہ اس لڑائی میں برطانیہ کو بلا شرط امداد دی جائے۔ میں ان کے اس فیصلہ کا احترام کرتا ہوں۔ ہوم رول کو جلدی حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ جس پر عدم تشدد کی پابندی سے عمل کر سکتے ہیں۔اس لیے میں سر سکندر کے فیصلہ کی تائید کرتا ہوں۔اس کے بعد انھیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ بلا شرط امداد کا نتیجہ ہوم رول سمجھتے ہیں۔اور اسی امید پر آپ نے یہ جرأت کی ہے تو آپ ہوم رول ہرگز حاصل نہیں کر سکیں گے۔ جب تک کہ نیشنل کانگریس آپ کی تائید نہ کرے۔

میں اپنے احراری دوستوں سے التجا کروں گا کہ ایام جنگ میں ایجی ٹیشن ضرور

بند کر دیں۔ جنگ ختم ہونے پر اگر ہوم رول نہ ملا تو آج کی ایک قربانی کے عوض اپنے دس آدمی قربان کرنے کی تیاری کریں۔ کاش وہ میری گزارش پر غور کرنا منظور کریں۔

دہلی: میری پارٹی کا بڑا مرکز دہلی ہے۔ یہاں سے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی خدمت میں عرض کروں گا کہ انقلابی ضرورت کے لیے پیچھے ہٹنا انقلاب کے خلاف نہیں۔ کامریڈ لینن اگر جرمنوں کا مفتوحہ علاقہ ان کو دے کر صلح نہ کرتا تو وہ کبھی کامیاب نہ ہوتا۔ آپ اگر مسٹر جناح سے صلح کرنا چاہیں۔ تو میں آپ کو ایسا دروازہ بتلاؤں گا۔ جس سے مسٹر جناح کانگریس میں آ جائیں گے۔ میں اس پر یقین نہیں رکھتا کہ ایک انقلابی کانگریسی ایک غیر کانگریسی کے ساتھ مصالحت نہیں کر سکتا ہے۔ اگر ہمارے بتلائے ہوئے راستے سے آپ مسٹر جناح سے مل سکے تو اس کے بعد دونوں مل کر مہاتما جی کو ساتھ لیجیے۔ اور وائسرائے کے توسط سے برٹش نیشن کے ساتھ ایک لمبے وقت کا مستقل پروگرام طے کرائیے۔ ملک کی شکست خوردہ فوج انقلاب کا معنی سمجھنے کی استعداد بھی گم کر چکی ہے۔ بے شک چند نوجوان اپنی محدود ٹولیوں سے انقلابی نعرے لگوا سکتے ہیں۔ اگر ہم پنڈت جی سے مل سکے تو ہم انھیں سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۴۰ء کا فرق سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ ہمارے خیال میں برطانیہ سے تصریح کرانے یا فیصلہ کن اسمبلی کے مطالبہ پر ملک کو سول نافرمانی کی دعوت دینا "کوہ کندن و رکاہ برآوردن" (پہاڑ کھودنا اور گھاس نکالنا) کے برابر ہوگا۔

البتہ مہاتما جی اگر اپنے فیصلے سے اپنی ذمہ داری پر کانگریس کو سول نافرمانی کا حکم دیتے ہیں تو میں اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کروں گا۔ اس حالت میں میں اپنے آپ کو اور ایک درجن اپنے عزیزوں کو مستثنیٰ کراؤں گا۔ میں محترم سوبھاش بابو سے عرض کروں گا کہ وہ بنگال میں سول نافرمانی جاری نہ کریں۔ بنگال کی پہلی کامیابی اس کے اعزاز کے لیے کافی ہے۔ اس وقت مہاتما جی کی اطاعت کیجیے۔

حضرات ! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اتنا وقت میری باتیں سُننے کے لیے متوجہ رہے، ہمارے خیالات کو کوئی صحیح یا غلط سمجھے، ہم آخر تک ملک کی ترقی اور آزادی کے لیے اپنے استاذ مولانا محمود الحسن دیوبندی شیخ الہندؒ کے طریقے پر کام کرتے ہوئے مریں گے۔ اللہ ہمیں توفیق بخشے۔ بس اس طرح جینا عبادت ہے۔ اور اس دُھن میں مرنا شہادت ہے۔

میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ آپ اپنا کانفرنس کا کام سنجیدگی سے شروع کریں اور کامیابی سے فیصلے بنائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مقالہ نمبر ۱۳

قومی اجتماعِ ہند

نیشنل ہے یا انٹرنیشنل؟

اگست ۱۹۴۰ء

قومی اجتماع ہند

نیشنل ہے یا انٹر نیشنل؟

نیشنل کانگریس جب شروع کی گئی تھی تو اس کا مقصد یہ قرار دیا گیا تھا کہ اینگلو انڈین طبقہ کے ساتھ انگریزی بولنے والے ہندوستانی مل کر ایک نئی قومیت کی بنیاد قائم کریں گے جو انگریزوں سے سوشل ارتباط میں وابستہ رہے گی۔ تاکہ برٹش گورنمنٹ کے لیے ایک قابل اعتبار سوسائٹی تیار ہوتی رہے۔ اس طرح جب کبھی ہندوستانی مطالبات سے مجبور ہو کر حقوق بخشی کی ضرورت ہوگی تو اسی سوسائٹی کو ہندوستان کا قائم مقام مانا جائے گا۔ برٹش کامن ویلتھ کے حالات دیکھنے سے بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اس قسم کی پالیسی برطانیہ کے اصول سلطنت میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

مؤسسین کانگریس کا اصلی نصب العین تو جبھی پورا ہو سکتا تھا، اگر اینگلو انڈین اس اجتماع پر حاکم رہتے۔ مگر بنگالی نیشنلسٹ نے ہندوستان کی نمائندگی میں اس طرح پیش قدمی شروع کر دی، جس کا مقابلہ اینگلو انڈین نہیں کر سکے۔ اس کے بعد اسی سلسلے میں احاطہ بنگال و بمبئی کے نیشنلسٹ آگے بڑھتے گئے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس قدر ان میں ہندوستانیت زیادہ آتی گئی۔ اسی قدر گورنمنٹ کانگریس کو ناپسند کرنے لگی۔

ہم اس دوسرے دور کو تنسیخ تقسیم بنگال تک ممتد (پھیلا ہوا) مانتے ہیں۔ اس زمانہ تک دہلی اور اس سے متعلق شمالی مغربی ہند نے کانگریس میں زیادہ ہمت سے حصہ نہیں

لیا۔ اوراس کا سبب واضح ہے کہ یوپی اور پنجاب انگریزی دانی میں کلکتہ مدراس اور بمبئی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

حرب عمومی (جنگِ عظیم اوّل) کے خاتمہ پر مہاتما گاندھی کانگریس میں نمودار ہوئے۔ اسے ہم تیسرے دور کا عروج سمجھتے ہیں۔ اس زمانہ سے کچھ عرصہ پہلے میں نے کانگریس کی خدمت شروع کی تھی اگرچہ اس وقت مَیں ہندوستان میں نہیں تھا۔ میری خدمات کا اندازہ لگانے سے پہلے یہ خیال ہمیشہ مستحضر رکھنا چاہیے کہ وطن چھوڑنے کے بعد میرے لیے قدرتی اسباب پیدا ہوگئے تھے کہ میں یورپ کی اینٹی برٹش طاقتوں کے سوا اور کسی سے تعلق رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

روس کو اگر یورپ سے علیحدہ کر دیا جائے تو ہمارا ہندوستان رقبہ اور آبادی اور تنوّع لغات (لسانی اختلاف) وغیرہ حیثیتوں سے اس چھوٹے یورپ سے متناسب (برابر) ہے۔ اس لیے حقائق اور واقعات کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ مگر ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس سے ہمارا اور یورپ کا طریق تعبیر مختلف نظر آتا ہے۔ اس لفظی اختلاف نے حقیقت کا رنگ اختیار کرلیا ہے۔ میں ناظرین کو اس مسئلہ پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

آج کل یورپ کی علمی مجالس میں لفظ قوم کی تعریف اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ''نیشن'' وہ انسانی اجتماع ہے جو ایک زبان بولتا ہو۔ اوران کی معاشرت میں ایک حد تک یکسانیت پائی جائے۔ چونکہ اس آبادی میں ایک فکر جلدی شائع (پھیل) ہوسکتا ہے اور روپیہ کا تداول (گردش) بھی بآسانی ہوسکتا ہے۔ اس لیے اسے ایک وحدت ماننا ضروری ہے۔

میرے خیال میں اس اصطلاح پر تمام ہندوستانی ایک قوم نہیں مانے جاسکتے بلکہ سندھی، کشمیری، بنگالی، مرہٹی علیحدہ قومیں کہلائیں گی۔ مجھے اثناء قیام مکہ معظّمہ میں بارہا تجربہ

ہوا کہ ایک بنگالی حاجی کی مدد کرنے سے میں عاجز آیا۔ کیونکہ وہ میری زبان نہیں سمجھتا تھا۔ میرے خیال میں جس طرح یورپ میں انگریز۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ اطالین قومیں مانی جاتی ہیں، وہی کیفیت ہمارے ہندوستان میں بھی موجود ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مختلف زبانیں بولنے والی قومیں اگر سمندر، پہاڑ جیسی قدرتی حدود انہیں جدا نہیں کرتیں تو آپس میں کسی نہ کسی طرح اشتراکِ فکر پیدا کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ یہ فلسفی فکر کبھی تو الٰہیات سے تعلق رکھتا ہے جیسے عقیدۂ وحدۃ الوجود۔ اور کبھی اقتصادیات سے تعلق رکھتا ہے جیسے ہمارے زمانے میں اشتراکیت۔ اور کبھی ایک دینی تنظیم میں دونوں باتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے فکری اتحاد سے جو وحدت پیدا ہو، اسے انٹرنیشنل طاقت کی اساس ماننا چاہیئے، اس قسم کے اشتراک سے اس بیسویں صدی کی عام اصطلاح کے موافق ایک قوم ہرگز نہیں بن سکتی۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ہم اسے بھی ممکن نہیں سمجھتے کہ کسی غیر معمولی تاثیر سے کوئی خاص زبان ہندوستان کے رہنے والوں کو اس تعمیم (عام طور) سے سکھلائی جائے جس سے آگے چل کر آج کی اصطلاح میں قومیت پیدا ہو جائے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ہندو فلاسفی نے شمالی ہند کو مرکز بنایا اور دکن کو فتح کر لیا۔ اس طرح ویدک زمانے میں اور اس کے بعد بودھوں کی حکومت میں اس فکری اتحاد نے سارے ہندوستان کو ایک رسّی سے باندھ کر اسے ایک انٹرنیشنل طاقت تو ضرور بنا دیا۔ مگر ہم اسے نیشنل طاقت نہیں کہہ سکتے۔

دیکھئے، ہندو فلاسفی نے اسی مرکز سے اکثر ایشیائی ممالک کو فتح کیا۔ بلکہ یونان کے توسط سے یورپ پر بھی غلبہ حاصل کیا۔ آج بھی یورپین طاقتیں اس کا لوہا مانتی ہیں تو کسی علمی اصطلاح میں بھی ان ممالک کو کیا نیشنل طاقت سے تعبیر کرنا ممکن ہے؟

ہمارا خیال ہے کہ اسلامی دور میں بھی ہندوستان کے انٹرنیشنل ازم کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اس کے بعد اب انگریزی دور بھی اس کا تتبع (اتباع) کر رہا ہے اس لیے اپنے ملک کے اربابِ فکر سے ہماری پُر زور التماس ہے کہ وہ اس مسئلہ پر توجہ کر کے اس علمی غلطی کی تصحیح کر لیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ ترکوں میں بعض سیاسی لیڈر ایسے پیدا ہوئے جو اتحادِ اسلام کو بھی ایک نیشنل تحریک مانتے ہیں اور اسے ''اسلامی قومیت'' کا نام دیتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے تتبع میں ہی اسلامی قومیت کی اصطلاح نوجوان مسلمانوں نے ہندوستان میں بھی استعمال کرنا شروع کر دی ہے۔

جہاں تک ہم ترکی عملداری پر غور کر سکے۔ ہمیں صاف نظر آیا کہ ترکی قومی تحریک کے لیے یہ ایک خاص قسم کا پروپیگنڈا تھا۔ ترک چونکہ اس تحریک کو اس کے مرکز پر قبضہ کر کے چلا رہے تھے ان کے لیے تو یہی موزوں تھا کہ دوسری اسلامی قوموں کی قومیت کا اعتراف نہ کیا جائے اور اسی غلو کا یہ نتیجہ نکلا کہ عرب، ترکوں کے قومی مخالف بن گئے۔ اسی قیاس پر ہمارا خیال ہے کہ غالباً ہندو سوسائٹی نے بھی اپنے سیاسی تغلب کے زمانے میں ہندوستان کی باقی اقوام کا اعتراف چھوڑ دیا ہوگا۔

ہماری التماس ہے کہ ہندوستانی مفکر آج کی حالت پر غور کر کے اس ڈپلومیٹک اصطلاح کو چھوڑ دیں۔ اس سے ان کے پروگرام میں کوئی بڑا انقلاب رونما نہیں ہوگا۔ مثلاً بنگال کانگریس کمیٹی کا نام اگر بنگال نیشنل کانگریس کر دیا جائے تو بنگال کی ذہنیت سے زیادہ چسپاں ہوگا۔ اسی طرح مہاراشٹر۔ گجرات۔ سندھ۔ پنجاب کی ان قومی جماعتوں کو نیشنل کانگریس سے تعبیر کیا جائے۔ اس کے بعد آج کی آل انڈیا نیشنل کانگریس صحیح معنی میں آل انڈیا انٹرنیشنل کانگریس بن جائے گی اور فیڈریٹ انڈیا سے زیادہ مناسبت پیدا کرے گی۔

فیڈریشن کی موجودہ اسکیم میں ہزار نقص نکالے جائیں اور اس کی اصطلاح کے مختلف طریقے زیر غور ہوں۔ اسے ہمارے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اصل فیڈریشن کا متفق علیہ ہونا ہی ہمارے نظریہ کو ثابت کرتا ہے۔ آج کی حالت یہ ہے کہ اوّلاً برٹش پارلیمنٹ نے (۱۹۳۵ء میں) اور اس کے بعد ہند کی تمام سیاسی جماعتوں نے اصل فیڈریشن کو تسلیم کر لیا ہے۔ بحث فقط تفصیلات میں ہے۔ کیا کانگریس کے لیے اس لفظی اصلاح پر غور کرنے کا وقت نہیں آیا۔

مقالہ نمبر ۱۴

جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی

کا تعارف

ہم کیا چاہتے ہیں؟

۳ ستمبر ۱۹۴۰ء

جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کے اغراض ومقاصد

ہم کیا چاہتے ہیں؟

ہم سیاسیات ہند میں ایک نئی جماعت (پارٹی) پیدا کرنا چاہتے ہیں جس کا ڈھانچہ ہم نے ''جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی'' کے نام سے تیار کرنا شروع کیا ہے۔ آج ہم اس پارٹی کے مقاصد پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ پارٹی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس کی طاقت کا منبع کیا ہوگا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانان ہند کی اندرونی طاقت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک کا مرکز علی گڑھ بنا اور دوسری کا مرکز دیوبند قرار پایا۔ علی گڑھ نے مسلم لیگ پیدا کی اور یہ اس کی سیاست کی آئینہ دار ہے۔ دیوبند نے جمعیۃ العلما ہند پیدا کی اور اس کی سیاست اس جماعت کی شکل میں پڑھی جا سکتی ہے۔ اب یہ دونوں تحریکیں رک گئی ہیں اور مسلمانوں کی کشتی ساحل مراد تک نہیں پہنچا سکیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ مسلم لیگ میں مفکرین کا ایک اچھا خاصہ طبقہ موجود ہے جو اس کے پروگرام سے مطمئن نہیں، مگر وہ اپنی بعض ضرورتوں کی وجہ سے مجبور ہو کر لیگ کے ساتھ گھسٹتا اور لڑھکتا چلا جا رہا ہے۔ ایسے ہی ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ جمعیۃ العلماء ہند کے بہت

سے علماء جمعیۃ کے پروگرام سے مایوس ہو چکے ہیں۔ ہم ان روشن خیال و پریشان دماغ طاقتوں کے سامنے اپنا پروگرام پیش کرنا چاہتے ہیں۔

پروگرام کا اہم جزو

ہمارے پروگرام کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ ہم سیاسیات ہند میں اپنا حصہ اپنے قبضے میں لانا چاہتے ہیں اور ابھی سے اس کی تیاری کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں بیرونی مسلمانوں کی کسی قسم کی امداد کی قطعاً کوئی توقع نہیں ہے' یہاں تک کہ اگر کوئی بیرونی طاقت ہندوستان پر حملہ آور ہو تو خواہ وہ مسلم ہی کیوں نہ ہو' ہم اس کا اپنی پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کسی مسلمان طاقت کا بھی یہ حق نہیں ہے کہ ہماری موجودگی میں وہ اسلام کے نام پر ہندوستان کی سرزمین کو پامال کرنے کی کوشش کرے۔ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا ہمیں اپنے وطن میں حکومت قائم کرنے کا حق نہیں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ بیرونی مسلم ممالک کو اپنی حکومتوں کو مستحکم اور منظّم کرنے کا حق حاصل ہے۔ مگر ہم ان کے اس حق کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر کے اسے فتح کرنے کی کوشش کریں۔ یہ ہمارا حق ہے کہ ہم ہندوستان میں ہندوستانی حکومت قائم کریں۔ اس فکر پر ہم کافی روشنی ڈال سکتے ہیں اور اس طرح اپنی سوڈیڑھ سو سال کی سیاسی غنودگی دُور کر سکتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمان اور اسلامی ممالک

لیکن یہاں ہمیں یہ بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس لیے صرف ایک اشارہ کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔

سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں جب شاہ عبدالعزیزؒ کی جماعت دلّی کی کمزوریوں کو دور کرنے کی لیے اٹھی تو اس کو کسی مسلم سلطنت نے مدد نہیں دی۔ جب ہمارے اسلاف اپنے ملک میں اپنی حکومت پیدا کرنے کے لیے شہید ہو چکے ہیں تو ہم اس تخیل بلند کے سوا کسی چیز کو اپنے سامنے نہیں آنے دیں گے۔ ہمارے ہندوستانی رہنما تو عرصے سے کہہ رہے ہیں کہ

شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا

ترجمہ: نئی نئی تعبیروں سے میرے خواب کا بنیادی مقصد ہی منتشر ہو گیا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ وہ اس پریشان خیالی کی وجہ پر پوری طرح غور نہیں کرتے۔ ہمارا علم و تجربہ شاہد ہے کہ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی توجہ ہمیشہ اجنبی امداد کی طرف مصروف رہی یا مصروف رکھی گئی۔ انہیں اپنے فیصلے سے اپنے ملک میں اپنی حکومت پیدا کرنے کے خیال کی طرف نہ لایا گیا ہے، نہ آنے دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اس غلط روی میں حصہ لیا، انھیں پہلے دور میں تو ~~معافی~~ قابل معافی سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بیداری کے زمانے میں جب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ کسی بیرونی رہنمائی پر بھروسہ کرنا ہمارے لیے زہر قاتل ہے، کسی ایسے شخص کو معاف نہیں کیا جائے گا جو ہمیں آج بھی اس وہم باطل میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرے۔

حقیقی ہندوستانی

ہمارا فکر عوام کے فکر سے ایک قدم آگے ہے۔ چنانچہ جب ہم ہندوستانی کا لفظ بولتے ہیں تو ہمارے نزدیک اس کا صحیح مصداق فقط ہندوستانی مسلمان ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک ہندوستانی کے ساتھ لفظ مسلم لگانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ صحیح

معنوں میں ہندوستانی وہ ہے جس نے ہندوستان کا انتشار دور کر کے اس میں وحدت پیدا کردی ہو اور اسے ایک راستے پر لگا دیا ہو۔ اس نقطہ نگاہ سے ہندوستان کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل یہاں ''بھیل'' اور ''گونڈ'' قومیں بستی تھیں۔ ان کی تاریخ کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ ہم فی الحال صرف اتنا جانتے ہیں کہ آریوں نے ہندوستان میں پہلے پہل ایک قسم کی وحدت پیدا کی اور اشوک اعظم جیسا شہنشاہ پیدا کیا، جس نے تقریباً سارے ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت پیدا کر کے داخلی افتراق کو دور کر دیا۔ آریہ لوگ پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے ''بھیل'' اور ''گونڈ'' کی ہندوستانیت کو منسوخ کر دیا، بشرطیکہ انھوں نے یہاں کوئی ہندوستانیت پیدا کی تھی۔

اس کے بعد اسلام اپنے پہلے دور میں سرحداتِ ہند تک پہنچ گیا۔ کابل اور غزنی جو تاریخی اعتبار سے ہندوستان کے آخری اضلاع تھے۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت میں فتح ہو چکے تھے۔ مگر ہندوستان کے اندر ایک نئی تحریک کی حیثیت سے اسلام چار سو سال کے بعد داخل ہوا۔

موجودہ ہندوستان میں آریوں کی حیثیت

غزنی کے مرکز سے محمود نے بڑھنا شروع کیا اور مسلمانوں نے پانچ چھ سو سال کے عرصے میں ہندوستان کی منتشر طاقتوں کو از سرِ نو جمع کر دیا اور اشوک کے بعد پھر ہندوستان میں عالمگیر جیسا ہندوستان گیر بادشاہ پیدا ہوا، جس نے سارے ملک میں پچاس برس تک حکمرانی کی اور تمام ملک میں ایک قانون جاری کر دکھایا۔ یہ دوسری ہندوستانی طاقت تھی جس نے آریوں کو ہندوستانیت سے اسی طرح گرا دیا جس طرح آریوں نے ''بھیل'' اور ''گونڈ'' کو ہندوستانیت سے گرایا تھا۔ مگر آریوں کی گراوٹ ایسی نہ تھی جیسی

''گونڈ'' اور ''بھیل'' کی تھی۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مسلمان اول درجے کے ہندوستانی ہیں اور ہندو یعنی آریہ دوم درجے کے ہندوستانی ہیں۔

عالمگیر کے بعد ہندوستان میں پھر بدنظمی شروع ہوگئی۔ اس پریشانی اور طوائف الملوکی کو برطانوی طاقت نے آکر دور کردیا۔ اب اگر برطانیہ اپنے آپ کو ہندوستانی کہنے پر راضی ہو اور اس کی ایک شاخ اینگلو انڈینوں کی طرح ہندوستان کو اپنا وطن بنالے اور وہی اس اجتماعیت کا مرکز بن جائے تو آج یہ لوگ اول درجے کے ہندوستانی کہے جائیں گے اور مسلمان اور ہندو دوم اور سوم درجے کے ہندوستانی ہوں گے۔ مگر چونکہ ابھی تک برطانوی طاقت ہندوستانیت قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس لیے فی الحال مسلمان ہی اول درجے کے ہندوستانی شمار ہوسکتے ہیں۔

ہندوستان ہمارا ہے

پس جب مسلمان کہتا ہے کہ ہندوستان ہمارا ہے تو اس میں ایک عظیم الشان حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج ہمارے پرانے اور نئے تعلیم یافتہ لوگ ان باتوں پر غور کرنے سے یکسر عاری ہو چکے ہیں۔ وہ صرف اپنی مردم شماری کے دھندوں میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ان کے جو حقوق ہیں' ان کے حصول کی کوشش نہیں کرتے۔ مسلمانوں کو جو اپنی تعداد کی فکر ہے' انھیں سوچنا چاہیئے کہ کیا انگریز ہندوستان پر اپنی کثرتِ آبادی کی وجہ سے حکومت کر رہا ہے؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ حکومت نہ کثرت پر موقوف ہے نہ قلت پر' بلکہ فکرِ صحیح پر منحصر ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس انسانیت کے لیے صحیح فکر موجود ہو اور اس کی تنظیم مکمل اور قوی ہو تو یہ صحیح حکمرانی کرتی ہے۔ یہ استعداد آج جتنی مسلمانانِ ہند میں موجود ہے' ہندوؤں میں نہیں ہے۔ انسانیت کا فکرِ سلیم

مسلم کو چند گھنٹوں میں سکھایا جا سکتا ہے۔ مگر ہندوؤں میں خال خال افراد ایسے نظر آئیں گے جو اس فکر کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ مگر عام ہندو سوسائٹی اس استعداد سے قطعاً عاری ہو چکی ہے اور نہ اسے یہ فکرِ صحیح سکھایا جا سکتا ہے۔ اسے سیکھنے کے لیے انھیں ایک عرصہ چاہیے۔

فکری تنظیم کا اہل کون ہے؟

حکمرانی کے لیے فکرِ صحیح کی تنظیم ضروری ہے۔ مسلمان ابھی اس تنظیم کے طریقے نہیں بھولا۔ اس نے اپنے نظام کے ساتھ یورپ کے اسلحہ کا استعمال بھی سیکھ لیا ہے۔ اس لیے اسے عہدِ حاضر میں اس فکرِ صحیح سے کام لینے کے بہترین مواقع حاصل ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ ہندو بھی یورپی نظام کو قبول کر کے اپنی سوسائٹی کو آگے لے جا رہا ہے۔ جہاں تک موجودہ واقعات کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ ہندوؤں نے بھی یورپی نظام کے بعض امور اپنا لیے ہیں۔ لیکن ہم پورے علم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ مسلمان کے پاس جو فلسفۂ عمل ہے اور جس کے زور پر وہ دنیا میں امامتِ اقوام حاصل کر سکتا ہے وہ فلسفۂ عمل ہندو کے پاس نہیں ہے۔ اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ کانگریس یورپی طریقۂ فکر سے پیدا ہوئی اور اسی آب و ہوا میں پروان چڑھی جب تک وہ مفکرین کی جماعت رہی، اس میں ارتجاعی عنصر بہت کم آیا۔ لیکن جس دن اسے حکومت کا ایک چھوٹا سا درجہ دیا گیا، سارا ارتجاعی نظام کانگریس پر چھا گیا۔ کیا کانگریس یورپی طرز پر حکومت چلا سکی؟ اس کا جواب نفیِ محض میں ہے۔ حقیقت میں ہندو سرمایہ دار طاقت کو راضی کرنے کے سوا اس کا اور کوئی نصب العین نہیں ہے۔

سرمایہ داری اور ہندو

ہندو جب بھی کوئی نیا نظام پیدا کرتا ہے تو اس کی بنیاد سرمایہ داری پر ہوتی ہے۔
چنانچہ گاندھی جی جیسا شخص بھی انسانیت کا اتنا بڑا نمائندہ بن کر سرمایہ داری سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکا۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کیمونسٹ ہیں۔ مگر وہ بھی سرمایہ دار ہیں۔ ان کے مقابلے میں حسرتؔ موہانی کو لیجیے۔ جس دن اس نے اشتراکیت قبول کی وہ اپنی تمام جائداد ختم کر چکا ہے اور اب وہ ایک کوڑی کا بھی مالک نہیں ہے۔ پنڈت جواہر لال نے یورپ جا کر سوشلسٹوں کے ساتھ رہ کر سوشلزم سیکھا۔ مگر حسرتؔ اپنی ذاتی فکر و کاوش سے اس مرتبے پر پہنچا ہے۔ یہ فرق ہے مسلم سوسائٹی اور ہندو سوسائٹی میں۔ مسلم جس وقت اپنے اصلی نظام پر آئے گا وہ سرمایہ داری کا بت توڑنے والا ہوگا۔ آج دنیا میں سرمایہ داری کے سوا اور کون سا بڑا بت ہے جسے توڑنے کی ضرورت ہے۔

مسلمان سرمایہ داری کا دشمن ہے

مسلمان ہندوستانی ہے اور وہ سرمایہ داری کا دشمن ہے اور وہ ہر غیر سرمایہ دار کے ساتھ جو مسلمان نہ ہو انسانیت کا سلوک کرنا جانتا ہے' آج تک ہندوستان میں ایسے اہل اللہ کی قبریں پوجی جاتی ہیں۔ جنہوں نے انسانیت کی خدمت کی ہے۔
خدا کا شکر ہے کہ مسلم نوجوان قرآن حکیم کی طرف پوری طرح متوجہ ہو چکا ہے۔ اور قرآن کی تعلیم موجودہ سرمایہ داری کی ضد ہے۔ اسمبلی کے موجودہ ممبروں کی سرمایہ داری سے مرعوب ہو کر مسلم نوجوان زیادہ دیر تک ان کے قابو میں نہیں رہ سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان میں مستقبل کو سنبھالنے کی پوری صلاحیت اور طاقت موجود ہے۔

چونکہ ہندوستانی تشتت (انتشار) کو برطانیہ کی جانشینی میں وہی دور کر سکتا ہے اور وہی ہندوستان میں عادلانہ نظام اجتماعیت پیدا کر سکتا ہے اس لیے ماضی کی طرح آیندہ کے لیے بھی ہندوستانی کے لفظ کا صحیح مصداق وہی ہو سکتا ہے۔

ایک ہندوستانی کا نصب العین

اس سارے فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان سلطان عالمگیر کے فکر کو نہ بھولیں۔ مگر عالمگیر کی سلطانیت کو اپنا نصب العین نہ بنائیں۔ بلکہ اس کے زمانے میں اسلامی فلسفے کی جو ارتقائی شکل شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد ماجد اور عم بزرگوارؒ (محترم چچا) نے بنائی اور جسے حضرت شاہ صاحب نے محمد شاہ کے زمانے میں مدون کیا اسے عالمگیر کا ورثہ سمجھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں بیرونی مسلمانوں کے پریشان کن پروگراموں میں نہیں الجھنا چاہیے۔ اور وہ اپنے گھر پر اپنا قبضہ جمانے کی کوشش میں برابر مصروف رہیں۔ اگر انھیں اس کام میں سو سال بھی لگ جائیں تو انھیں پروگرام تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد شاہ صاحب کے فلسفے کی روش پر ہم جو پروگرام سوچتے ہیں اس کے بھی ایک دو حصے واضح کر دینا چاہتے ہیں۔

ہمارا ہندوستانی ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ ہم انڈین نیشنل کانگریس کے رکن بننا چاہتے ہیں۔ اب دنیا کا سیاسی مرکز یورپ میں منتقل ہو چکا ہے۔ ہم میں سے کسی ہندوستانی کو یورپ میں تعارف کرنا ہو تو اس کے لیے کانگریس بہترین عنوان ہے۔

(۱) عدم تشدد

ہمارے خیال میں کانگریس کی عدم تشدد کی پالیسی اس وقت تک ہندوستانیوں

کے لیے لازم ہے۔ جب تک انھیں یقین نہیں ہو جاتا کہ وہ لڑ کر اپنا ملک فتح کر سکتے ہیں۔ یہ اصول تیاری کے لیے بہترین ذریعہ ہے۔ اس پر استقلال کے ساتھ عمل پیرا رہنا چاہیے۔ جب تک ملک آخری موقع کے لیے تیار نہیں ہوتا' اسے چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں حصہ نہیں لینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ہمارا فکر گاندھی جی کے فلسفے کا پابند نہیں رہتا۔ بلکہ ہمارے فکر کی بنیاد حضرت محمد ﷺ کی سیزدہ سالہ (تیرہ سالہ) مکی زندگی پر ہے۔ گو رسول اکرم ﷺ کی سیرت مبارک کے اس پہلو کی طرف ہمیں گاندھی جی کے پروگرام کی اشاعت کے بعد تنبہ ہوا۔

(۲) درجہ نو آبادیات

عدم تشدد کے بعد ہمارے پروگرام کی جو دوسری شق ہے وہ درجہ نو آبادیات پر برطانیہ کے ساتھ مصالحت کر لینا ہے۔ کانگریس کے اندر ہندوستانی مسلمان نوجوان ایسی پارٹی بنائے گا جو برطانیہ سے درجہ نو آبادیات لے کر رہے گی۔ جن شرطوں پر بھی آزادی مل سکتی ہو ان کی پوری قیمت ادا کرنے کے لیے یہ پارٹی تیار ہو گی۔ اس سے برطانیہ کے ساتھ ہمارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ اور ہمیں اپنی طاقت عامہ کو موجودہ اصول پر منظم کرنے اور عمومی سیاسی نظام اور عمومی تعلیم کے لیے پورا موقع مل جائے گا۔ اس ہوم رول میں جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں' ہندو اور مسلم برابر کے شریک ہوں گے اور ہندو اور مسلم صوبے برابر درجے پر رہیں گے۔ مگر صوبوں کی اکثریت اپنے اپنے صوبے میں قانون سازی پر یقیناً قابض رہے گی۔ اگر مسلم نوجوان اپنی اکثریت کے صوبے میں سرمایہ داری کو دھکا لگانا چاہے گا تو اسے کوئی چیز نہ روک سکے گی۔ اور اس کا فائدہ اس کے صوبے کے ہر ایک مسلمان اور ہندو کو برابر پہنچے گا۔ اس آخری اصول کو واضح کرنے کے لئے ہم ایک تیسرا اصول واضح کریں گے۔

(۳) مخلوط انتخابی طریق کار

مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہماری پارٹی کوشش کرے گی کہ مسلمانوں کے ووٹ ہمیشہ اس کو ملیں مگر وہ مخلوط انتخاب کے اصول پر کام کرے گی۔ اگر مسلم نوجوان اتنا بزدل ہے اور اعتماد علی النفس (اپنے اوپر اعتماد) قطعاً کھو چکا ہے اور وہ اپنی اکثریت کے صوبے میں برسر اقتدار نہیں آ سکتا تو ہماری قومیت کا یہ طبقہ فنا کر دیے جانے کے قابل ہے۔ لیکن ہمیں یقین کامل ہے کہ ہندو اور مسلمان ہماری پارٹی کے نمائندوں کو اپنے مشترکہ ووٹوں سے ضرور منتخب کریں گے اور مسلم نوجوان قطعی طور پر برسر اقتدار آئے گا۔ لیکن وہ اپنے اقتدار کو محض قانون سازی میں محدود رکھے گا۔ کوئی قانون اکثریت کی منشاء کے بغیر اس کے احاطے میں نہیں بن سکے گا۔ چونکہ ووٹروں کی تعلیم صحیح انسانیت کے اصول پر ہوگی۔ اس لیے مسلم اکثریت محض نام کی اکثریت ہوگی ورنہ حقیقت میں وہ انسانیت کی نمائندہ ہوگی۔ ہر ووٹر اپنی صحیح تربیت یافتہ ذہنیت کے مطابق ووٹ دے گا۔ اور اس کا نمائندہ صحیح انسانیت کے اصولوں کے مطابق اس کا دیانت کے ساتھ استعمال کرے گا۔ مسلم نوجوان اپنی قانون سازی کے حق کی حفاظت میں اپنی طاقت کا آخری حصہ تک صرف کر دے گا۔ مگر قانون چلانے میں ملک کی تمام بہترین طاقتوں کو یکساں حصہ دے گا۔ اس میں وہ ہندو اور مسلم کا امتیاز روا نہ رکھے گا۔ بایں ہمہ وہ اس بات کا خیال رکھے گا کہ قانون کی روح کہیں پامال نہ ہو رہی ہو۔

(۴) غیر نزاعی اصول

ان اصولوں پر ہماری پارٹی اسلامی اکثریت کے صوبوں میں صحیح اسلامی اور انسانی فضا پیدا کرنا چاہتی ہے۔ یہ فضا نہ ہندوستانیت کے منافی ہے۔ اور نہ اس میں ہندوؤں اور

سکھوں سے تنازعہ کا امکان ہے اور نہ برطانیہ کے ساتھ منازعت (جھگڑا) ہے۔

اگر اس قسم کی حکومت قائم کرنے میں دس بیس سال لگ جائیں تو ہمیں صبر سے کام کرنا ہوگا' کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا مقصد ناکام ہونے والا نہیں ہے۔ یہ وہ پروگرام ہے جسے ہم لیگ اور علماء کے غیر مطمئن افراد کی توجہ میں لانا چاہتے ہیں' اور اسے ہم ملک کی حکمران طاقت سے بھی چھپانا نہیں چاہتے۔ ہم اس پروگرام کی تکمیل میں اقلیت کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس پر کامل طور پر غور کر کے اس میں شریک ہونا پسند کرے۔

ہم اس تحریک کو لاہور سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا دوسرا مرکز لکھنو ہوگا۔ اور ہم دونوں کو دہلی میں جمع کریں گے۔

(۵) غیر اختلافی تخیّل

ایک آخری چیز بھی لکھ دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ چونکہ یہ پارٹی غیر مسلم عناصر کو بھی شامل کرنے کے لیے تیار ہے اس لیے دعوتِ فکری کے لیے وہ غیر مسلم طاقتوں کو ایک ایسے فلسفے کی طرف دعوت دیتی ہے' جو مسلم و غیر مسلم دونوں کے لیے یکساں قابلِ تسلیم ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ ہم اشتراکیت کے انتہا پسندانہ اقتصادی پروگرام کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن ہم محنت کش طبقے کے لیے روٹی کپڑے' تعلیم اور صحت کی اصلاح کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس میں بھی ہم مسلم و غیر مسلم کا امتیاز روا نہیں رکھیں گے۔ کیوں؟۔ یہ تو اس فلسفی فکر کا جزو لازم ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

(۶) مسلم لیگ کی توجہ کے لیے

مسلم لیگ کے اراکین کے سامنے ہم ایک خاص مسئلے پر بھی روشنی ڈالنا چاہتے

ہیں۔ ہمارے لیگی دوست ''فیڈرلیٹڈ'' گورنمنٹ کی مرکزیت کو بہت شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔اس لیے وہ ۱۹۳۵ء کی تجویز اصلاحات کورد کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔انھیں معلوم رہے کہ پارلیمنٹ کا یہ فیصلہ آسانی سے رد نہیں کیا جاسکتا۔البتہ ہم اس میں ایک ترمیم پیش کرنے پر زور دیں گے جس کی منظوری کے بعد امیدِ کامل ہے کہ ان کے تمام خطرات دور ہو جائیں گے اور جملہ شبہات بھی دور ہو جائیں گے۔

ایک دستوری اصطلاح

ہم چاہتے ہیں کہ پارلیمنٹ اس قانونی اصلاحات میں ایک دفعہ کا اضافہ کردے جس کا منشاء اس مطلب کا اظہار ہو کہ اب تک جن علاقوں کو صوبہ کہا جاتا تھا۔انھیں اب اسٹیٹ مانا جائے۔اس میں نہ پارلیمنٹ کو کوئی اعتراض ہوگا نہ کانگریس کو' کیوں کہ اس پر نہ نظام میں کسی تبدیلی کی ضرورت پڑتی ہے نہ خرچ میں اضافہ ہوتا ہے۔جو رقبہ ایک زبان رکھتا ہے اور معاشرت میں تقریباً یکساں ہے۔اسے ایک ملک یا اسٹیٹ ماننا حقیقت کے زیادہ قریب ہے اور جدید نظام میں اسے صوبہ قرار دینا بالکل بے معنی ہوگا بلکہ اس علاقے کے باشندوں کی توہین ہوگی۔ (۳ ستمبر ۱۹۴۰ء)

مقالہ نمبر ۱۵

جامعہ ملیہ دھلی میں
یادگارِ شیخ الہند کا افتتاح

۲۲ نومبر ۱۹۴۰ء

بیت الحکمۃ، جامعہ نگر، دھلی

جامعہ ملیہ دہلی میں

یادگارِ شیخ الہند کا افتتاح

اِنَّ وَلِيِّيَ اللّٰهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَ هُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تمہید

مجھے جاننے والے بھولے نہیں ہوں گے کہ میں نے جون ۱۹۴۰ء ہندی میں "یادگار شیخ الہندؒ" کے لیے مختصر پروگرام شائع کیا تھا۔ اس میں مسلمانوں کے متموّل طبقہ سے اپیل کی گئی تھی کہ جس قدر حضرات اس اسکیم کے مقصد کو سمجھ سکتے ہیں اور اسے ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے فی الجملہ مفید مانتے ہیں وہی دوست ایک خاص مقدار میں روپیہ جامعہ کے خزانہ میں جمع کرادیں تاکہ مجھے عمر کے اس آخری مرحلہ میں پُرشوق نوجوان عزیزوں کو اپنے علم و تجربہ سے تعارف کرانے میں آسانی ہو۔

آج کل حالات ایسے ہیں کہ کسی امتحانی (امکانی) اسکیم پر روپیہ خرچ کرنے کی دعوت اپنے اندر جذب کی پوری قوت نہیں رکھتی۔ غالباً اسی قسم کے اعذار نے مسلمانوں کو ادھر متوجہ نہیں ہونے دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میری نقل و حرکت سے اور میرے مختلف مقالات پڑھ کر اگر مجھ سے بدظن ہوگئے ہوں تو میں اپنا کام شاید جم کر نہ کرسکوں، یہ بھی جانتا ہوں کہ

بدظنی بڑھانے کے اور بھی اسباب پیدا ہوتے رہے، مگر میں ادھر ملتفت (متوجہ) نہیں ہوا۔ میں اگر کسی کو اپنا مطلب سمجھا کر اسے اپنی رفاقت یا امداد پر آمادہ نہیں کر سکتا تو لڑ جھگڑ کر راستہ کی آسانی پیدا کرنا اس وقت میری طاقت سے خارج ہے۔ اس لیے تو کلاً علی اللہ جس قدر کام کر سکتا ہوں تجویز کے مطابق نصاب مکمل ہونے (یعنی دس عربی اور دس انگریزی کے سند یافتہ مشتغلین (طلباء) کی ضرورت مہیا ہونے) سے پہلے تمہید کے طور پر شروع کر دیتا ہوں۔

میں بعض دوستوں کے مشورے سے جن میں سے محترم خواجہ عبدالحئی صاحب کا نام لے سکتا ہوں، رمضان ۱۳۵۹ھ ہجری کے آخر ہفتہ میں دہلی پہنچا۔ آج ۱۶ شوال ۱۳۵۹ھ (۱۷ نومبر ۱۹۴۰ء ہندی) سے جس قدر مستعدین اپنا خرچ خود برداشت کر سکتے ہیں، فقط انھیں کی رفاقت میں جامعہ ملیہ کا بیت الحکمتہ شروع کر دیتا ہوں۔ جسے آگے چل کر ''یادگار شیخ الہند'' اور ولی اللہ اکاڈمی Wali-Ullah-Acadmy کے نام سے پکارا جائے گا۔

میرے لیے ضروری ہے کہ محترم المقام ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب بالقابہ شیخ الجامعہ اور ان کے رفقاء کی شکر گزاری کا اس موقعہ پر اظہار کر دوں۔ انھوں نے پہلے دن سے اعلیٰ درجہ کی فراخ دلی سے تحریک کا خیر مقدم کیا ہے۔ اور اس وقت بھی جامعہ ہمیں ہر قسم کی مالی امداد دینے کے لیے تیار ہے۔ مگر میں اس کے بجٹ پر بجز اشد ضرورت کے کسی قسم کا بوجھ ڈالنا اپنی مصلحت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ ہماری درس گاہ اندرونی استقلال قائم رکھنے کے بعد اسی طرح جامعہ ملیہ کی جائداد بنے گی جیسے ''بنیادی تعلیمی اسکیم کا ٹریننگ اسکول'' جامعہ کا حصہ ہے۔

یادگارِ شیخ الہندؒ میں ولی اللہ فلاسفی

یاد رہے کہ ہم اسے کسی عارضی تحریک یا وقتی جوش سے متاثر ہو کر شروع کرنا نہیں

چاہتے بلکہ ہم اپنے علم اور تجربہ کا عملی نمونہ قائم کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ سے ہمارا تعلق پچاس برس سے دنیا جانتی ہے۔ اس وقت ہم اپنی تحقیقات کا نچوڑ آئندہ نسل کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستانی قومی فکر میں ایک معقول خیال کا اضافہ کریں، جس سے ایک مسلمان بھی اپنے ہندوستانی ہونے پر اسی قدر فخر کر سکے جس طرح دنیا کے عقل مند محبان وطن مسلم ہوں یا غیر مسلم، اپنے اپنے وطن کی عزت پر ناز کرتے ہیں۔ وہ خیال دنیا کے ایک غیر معروف لیکن بہت بڑے فلاسفر امام ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ ہے۔ یہ حکمت جس طرح مسلمانوں کے دو معروف فلاسفروں شیخ اکبر ابن عربی اور امام ربانی مجدد سرہندی کے متبعین کو مطمئن کر سکتی ہے۔ اس سے زیادہ ہندو فلاسفی کے مختلف اسکولوں کے نظریات کو گیتا کے اسلوب پر جمع کر رہی ہے۔ جس قدر اہل علم ولی اللہ فلاسفی میں تبحر (مہارت) حاصل کریں گے۔ وہ اپنے ہم خیال ہندوستانیوں پر ہندو ہوں یا مسلمان، یکساں اعتماد کریں گے۔

مسلمانوں کی اکثریت اگر نیشنل کانگریس سے علیحدگی پر اصرار کرتی رہی تو کانگریس ایک پارٹی کانفرنس بن جائے گی اور ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ اس سے ہماری ایک خاص قسم کی پچاس سالہ ملکی کوشش بے کار ہو جائے گی۔ جس کے ہم حقیقی حصہ دار ہیں۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کے رویہ سے اگر ہم قطع نظر بھی کر لیتے ہیں تو احرار اور جمعیۃ العلماء کا معاملہ اس سے زیادہ ناقابل فہم ہے۔ وہ کانگریس کے ہمدرد اور وفادار بن کر بھی کانگریس سے باہر اپنے لیے مستقل سیاسی پروگرام تجویز کرتے ہیں۔ ہم اس پریشان خیالی کو دور کرنے کے لیے ان جماعتوں کو کانگریس کے اندر ایک مستقل پارٹی کی صورت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس کے لیے ولی اللہ فلاسفی سے بہتر نصب العین نہیں مل سکتا۔

اس فلاسفی کی تعلیم سے ہمیں ایک اور فائدہ حاصل کرنا بھی مقصود ہے۔ ہم اپنی

اس نئی جماعت کو سرکاری یا مذہبی خدمات کے لیے تیار نہیں کر رہے۔ اس لیے انھیں ہم خدمتِ خلق کا پروگرام ہی دے سکتے ہیں۔ ولی اللہ فلاسفی چونکہ تمام ادیان کا مرجع ''انسانیت'' اور اس کی تکمیل کو قرار دیتی ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ جس قدر یہ فکر کسی ذہن میں راسخ ہوگا، اسی قدر وہ خلق اللہ کا اچھا خادم بن سکے گا۔

یادگارِ شیخ الہندؒ اور برٹش کامن ویلتھ

جس طرح ہندوستانی قومی فکر میں ہم ''ولی اللہ فلاسفی'' کو مرکزی درجہ دینا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ہم عملی پروگرام کے لیے برٹش کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کرنے والی پارٹی نیشنل کانگریس کے اندر پیدا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ کام اگرچہ لبرل ہم سے اچھی طرح کر سکتے تھے۔ مگر وہ کانگریس کا نصب العین قبول نہیں کرتے۔ اس لئے بچھڑ گئے۔ اور ہم نے عدمِ تشدد کے ساتھ آزادیٔ کامل حاصل کرنے کا مطمع نظر اپنے اصلی افکار میں ناکام ہونے کے بعد قبول کیا ہے۔ اس لئے بآسانی کانگریس میں ایسی پارٹی بنا سکتے ہیں۔ جو عملاً ہوم رول حاصل کرنے پر اپنی تمام طاقت صرف کر دے گی۔ اس میں ہم اپنے نوجوانوں کے انقلابی افکار کو منظّم کر لیں گے۔ وہ نراج اور اشتراکیت سے اپنے آپ کو مستغنی (بے پروا) سمجھیں گے۔ کانگریس کریڈ ماننے کے لیے استقلالِ تام ہمارا نصب العین تو رہے گا۔ لیکن جب تک برطانوی طاقت ہمارے ملک پر قابض ہے، ہم عوام کے لیے کوئی ایسا پروگرام نہیں بنا سکتے جو ہوم رول سے آگے قدم بڑھائے۔ اس حالت میں نہ تو ہم عوام سے تعلق توڑ سکتے ہیں، جیسے پچھلے پچاس برس میں غلطی سے ایسا کرتے رہے اور نہ ان کو بلا پروگرام فقط جذبات کا تابع بنا سکتے ہیں۔ ورنہ

''ہر ہوسنا کے جام وسنداں باختن''

''ہر خواہش پرست لیڈر کا ایک بہروپ ہوتا ہے''

کا بہروپ بھر کر عوام کو جو ہماری ریڑھ کی ہڈی ہیں' پریشان کرتا رہے گا۔

ہمارے پروگرام کو دانشمندی سے احاطہ کرنے کے بعد ہمارا نوجوان جس طرح عدم تشدد کا پابند رہے گا۔ اُسی طرح اگر اسے ضرورت محسوس ہوگی تو وہ گورنمنٹ پارٹی کے ساتھ کوآپریشن سے بھی محترز (بچتا) نہ رہے گا۔

یادگارِ شیخ الہند اور دہلی کا ولی اللّٰہی اسکول

اور مرحوم دہلی کالج

دہلی سے ہمارے افکار و اعمال کا تاریخی تعلق ہے۔ امام ولی اللہ کے اَتباع کا مرکز امام عبدالعزیز اور ان کے جانشین الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق کے آخری وقت تک دہلی ہی رہا۔ دیوبندی جماعت کے بانی حاجی امداد اللہ بھی مولانا محمد اسحاق کے مدرسہ کے فیض یافتہ تھے اور انہی کی سیاسی رہنمائی کے موافق حاجی صاحب نے ان کے بعد دہلی میں اپنا اجتماعی مرکز بنایا جو ۵۷ھ ہندی کے ناکام انقلاب کے بعد دیوبند منتقل کر دیا گیا۔

بانیانِ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم' مولانا رشید احمد' مولانا محمد یعقوب نے دہلی کالج میں شعبہء شرقیہ کے صدر مدرس مولانا مملوک علی سے تعلیم پائی۔ دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب' استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی صدر مدرس کے صاحبزادے تھے۔ اور مولانا محمد قاسم رشتہ میں مولانا مملوک علی کے بھتیجے ہوتے ہیں۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے دہلی میں نظارۃ المعارف کو اپنا ایک مرکز بنایا۔ پھر جامعہ ملیہ کا افتتاح ان کے ہاتھ پر ہوا۔ آخر میں ایک امیر الجامعہ ڈاکٹر انصاری کے

گھر پر دہلی میں وفات پائی۔ اب اگر شیخ الہند کی یادگار دہلی میں قائم ہوئی تو وہ ہمارے مشائخ کے سارے سلسلہ کی یادگار ہوگی۔

شیخ الہندؒ اور جامعہ ملیہ

ہم نے مکّہ معظّمہ میں اندازہ کر لیا تھا کہ اگر کبھی وطن پہنچ سکے۔ تو ہم اپنا کام جامعہ ملّیہ کے باہر شاید جاری نہ کر سکیں گے۔ اسی مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ ہم نے شیخ الجامعہ کی خدمت میں درخواست بھیجی تھی۔ اس کے ساتھ ہمارے دوستوں نے دوسرے مراکز سے بھی دعوت دی کہ ہم ان کی رفاقت میں اپنا کام شروع کریں۔ ایک سال سے زیادہ وقت ہم نے ان کے معاملات سمجھنے میں صرف کیا، مگر نتیجہ وہی نکلا جو ہم نے پہلے فیصلہ کیا تھا۔

ہم نظریات تو وہی مانتے ہیں جو امام ولی اللہ دہلوی سے لے کر شیخ الہند تک ہمارے بزرگوں نے مقرر کیے۔ لیکن آج کے دورِ انقلاب میں ان مقاصدِ عالیہ کو حاصل کرنے کے لیے پروگرام ہم یورپ سے سیکھنا ضروری سمجھتے ہیں، جیسے تمام مشرقی ممالک میں سو سال سے ہو رہا ہے۔ جاپان، ترکی اور پچھلی جنگ کے بعد ایران، افغانستان اور تمام عربی ممالک اور آخر میں نیشنل کانگریس کے رہنما سب یورپ سے سیکھتے رہے۔ اس لیے ہم نوجوانوں کو اپنے علمی نظریات کے ساتھ عملی تجارب سکھانے کے لیے انھیں یورپین بننے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لیے جامعہ ملیہ ہی کی رفاقت ممکن اور پھر مفید ثابت ہوگی۔

یادگارِ شیخ الہند اور سندھ کے راشدی مشائخ

میں اسے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میری زندگی کا سندھ اور دیوبند سے خصوصی تعلق ہے۔ میں نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی اور میری علمی اور سیاسی تربیت میں حضرت

مولانا شیخ الہند خصوصی مربی تھے، جن سے میرا رابطہ ۸۹۹ھ ھندی سے شروع ہو کر ان کی وفات کے سال ۹۱۹ھ ھندی تک مسلسل قائم رہا۔ اس کے بعد ارشاد و طریقہ اور تربیت وصحبت اور عملی زندگی سندھ کے راشدی مرشدوں کے ظلِ عاطفت میں شروع ہوئی اور بفضلہٖ تعالیٰ میرا یہ تعلق آج تک قائم ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ امام ولی اللہ دہلوی کے حلقہء مسترشدین میں سندھ کے نامور علماء داخل تھے۔ مثلاً مخدوم معین الدین ٹھٹھوی جو شاہ عبداللطیف صاحب ''رسالہ توحید'' کے رفیق اور مخدوم محمد ہاشم کے مشائخ میں ہیں۔ وہ شاہ ولی اللہ کو اپنا امام مانتے ہیں۔ جب امام عبدالعزیز کی جماعت مجاہدین سندھ سے گزری تو راشدی مشائخ میں سے شیخ شیخنا مولانا سید محمد حسین جیلانی اور مولانا سید صبغۃ اللہ لکیاری اس حلقہ میں شامل ہو گئے۔ آخر میں میرے مرشد حضرت حافظ محمد صدیق (بھرچونڈی) کے دونوں بڑے خلیفہ مولانا غلام محمد (دین پور) اور مولانا تاج محمود (امروٹ) اور سید صبغۃ اللہ کے خاندان سے مولانا راشد اللہ صاحب العَلَم، حضرت مولانا شیخ الہند سے ملحق ہو گئے۔ مولانا شیخ الہند کی یادگار سے جس طرح دیوبند اور دہلی کے سلسلہ کی یاد تازہ رہے گی۔ دہلوی، دیوبندی رفقاء اور راشدی اخوانِ طریقت سے میری پرزور استدعا ہے کہ وہ یادگار شیخ الہند کو ہی اپنے مشائخ کی یادگار سمجھیں، جامعہ ملیہ دہلی میں اس مرکز کو مضبوط بنائیں۔ اور اس کے فروع (شاخیں) اپنے ہاں قائم کرنے کی کوشش کریں۔

ابتدائی کاروائی کا پروگرام

اب ہم اپنے کام کا مختصر پروگرام لکھتے ہیں۔ بیت الحکمتہ کا نصابِ تعلیم تو ہم پہلے شائع کر چکے ہیں۔ یعنی ''ولی اللہ فلاسفی'' سے قرآن عظیم کو سمجھنا اور انسانیت کے اصول پر

کاشتکاروں کی علمی اور عملی خدمت کرنا۔

اس تعلیم دینے میں بالفعل ہمارے ساتھ جامعہ کا ایک پروفیسر شریک رہے گا۔ اور دوسرا معاون ہمارا ہم مسلک ایک مولوی ہوگا۔ اگر اللہ کو منظور ہے تو جامعہ کا بیت الحکمۃ جسے ہم شروع کر رہے ہیں، حکمۃ امام ولی اللہ دہلوی کا مرکزی کالج بن کر رہے گا۔ اس کے متعلق ابتدائی اور اعلیٰ اسکول اطرافِ مملکت میں قائم ہوتے رہیں گے۔ مثلاً سندھ کے مدرسہ دارالرشاد اور مظہر العلوم میں جس قدر کام ہو رہا ہے یا دین پور ریاست بہاول پور اور لاہور میں جس کام کی ابتدا ہو چکی ہے۔ یہ مختلف تعلیم گاہیں ترقی کر کے جامعہ کے اس مرکز کے لیے فروع (شاخیں) بن جائیں گی۔

مرکزی تعلیم گاہ کی تعمیر

جامعہ نگر میں ''یادگار شیخ الہند'' کی مستقل عمارت کا خاکہ یوں سمجھنا چاہیئے۔ وسط میں ایک خوبصورت مصفٰی مسجد ہوگی۔ اس کے گرد میدان چھوڑ کر چاروں طرف تعلیم گاہ اور اس سے باہر پھر میدان چھوڑ کر چاروں طرف دارالاقامۃ بنے گا۔

بالفعل جامعہ نگر کے قریب کسی گاؤں میں طالب علموں کے رہنے کے لیے جو مکان میسر آیا کرایہ پر حاصل کر لیا جائے گا اور بہت جلد بفضلہٖ تعالیٰ جامعہ نگر کے احاطہ میں بقدر ضرورت دارالاقامۃ بنا لیا جائے گا۔ اس تعلیم کے لیے جامعہ کی عمارت میں بعض کمرے استعمال کے لیے مل جائیں گے۔ چنانچہ تیسری منزل پر شمالی گنبد والے کمرہ میں تعلیم شروع کر دی گئی ہے۔

جامعہ نگر میں میرا قیام

جہاں تک میری صحت برداشت کر سکتی ہے۔ میں کراچی سے دہلی تک اس تحریک کے مرکز اور اس کے فروع (شاخوں) کی خدمت کے لیے سفر کرتا رہوں گا اور جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوتے گئے' دہلی کے مشرقی علاقہ میں (جس کے مراکز لکھنو' بنارس اور پٹنہ ہیں) اور جنوبی علاقہ میں (جس کا مرکز اجمیر ہے) اس تحریک کے فروع (شاخیں) قائم کرنے کے لیے سفر کے حدود وسیع ہوتے جائیں گے۔

بالفعل اپنے اوقات اس طرح تقسیم کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ ہر دو مہینے جامعہ میں رہنے کے بعد ایک مہینہ سندھ جایا کروں گا۔ طالبعلم اس مہینہ میں ضبط اور مطالعہ میں مصروف رہیں گے' پروفیسر اور استادان کی نگرانی اور معاونت کریں گے۔ اس طرح آٹھ مہینے مسلسل کام کے بعد ایک مہینہ تعطیل ہوگی اور تین مہینے کے لیے سب طالب علم افادہ و استفادہ کے لیے ملک میں ایک خاص پروگرام کی پابندی سے دورہ کریں گے۔ یہ چار مہینے میرے دوسرے مشاغل کے لیے فارغ ہوں گے۔

میری دلچسپی کا سامان

ہم ایک طویل زمانہ دوسری قوموں کی ترقی کے سامان دیکھتے دیکھتے پہلے حسرت اور پھر وحشت کے غلبہ سے پریشان ہو گئے تھے۔ اگر چند روز اور اسی طرح رہتے تو ممکن تھا کہ ہم اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے۔ وطن پہنچنے سے آخری صدمہ کا خوف تو جاتا رہا۔ مگر اب تک چونکہ ہماری منشا کے موافق کام کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا ہماری وحشت پر کوئی مستقل اثر نہیں ہوا۔

یادگار شیخ الہند کا کام شروع کرنے کے ارادے سے جب ہم جامعہ نگر پہنچے تو سب سے پہلے جامعہ کی شاندار عمارت سے ہم متاثر ہوئے۔ ہم نے استنبول میں باسفورس کے کنارے پر کالج دیکھے ہیں۔ ہمیں وہی لطف جمنا کی اس وادی میں نظر آیا۔ جب ہم اسے اپنی چیز سمجھتے ہیں تو دماغ کی گہرائیوں تک سرور محسوس کرتے ہیں۔

ہم اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ اس نے ہمارے نوجوان کو توفیق عنایت کی جس نے اپنی اولوالعزمی سے قوم میں معیاری زندگی کا اساس قائم کرلیا۔ خدا کرے کہ جامعہ کے مخلصین قوم کے ادنیٰ طبقہ کو اس معیار تک لانے میں کامیاب ہوں۔ میں نے فاضل استادوں کو بچوں کے ساتھ کھیلتے اور پڑھاتے دیکھا۔ ہماری آنکھ اور ہمارے کان جب دہلی کی شستہ زبان میں ایک اعلیٰ فکر بچوں کے ذہن میں راسخ کرنے کا عمل محسوس کرتے ہیں تو ہمیں اس قدر راحت ملتی ہے جسے ہم بیان نہیں کرسکتے۔

ہماری طبیعت جب سے ہم وطن میں آئے، سبزہ اور بچوں کو دیکھ کر فی الجملہ سرور حاصل کرتی رہی۔ الحمد للہ کہ جامعہ نگر میں ہمیں دونوں چیزیں ملیں ع

یہ جھاڑیاں چمن کی یہ میرا آشیانہ

جامعہ کے اساتذہ اور منتظمین کو جہاں تک ہم سمجھ سکتے ہیں، وہ اس تحریک کی ہمدردی سے معمور ہیں۔ ہم اُسے اللہ رب العزت کی ایک بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔

واللہ الموفق والھادی وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

۲۲ نومبر ۱۹۴۰ھندی

بیت الحکمۃ جامعہ نگر۔ دہلی

مقالہ نمبر ۱۶

خطبۂ صدارت

صوبہ مدراس کے مقام کمباکونم میں اینٹی سیپریشن

(Anti Separation) کانفرنس منعقدہ

جون 1941ء میں پڑھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفٰی. امابعد:

آپ کی کانفرنس نے مجھے دعوت دی کہ مسلم لیگ کے جدید نظریہ کے متعلق آپ کو اپنے خیالات سناؤں۔اس کا شکریہ قبول فرمائیے۔

(اپنا تعارف)

میرے حالات شمالی ہند میں تو عام مسلمانوں کو کسی قدر معلوم ہیں۔شاید جنوبی ہند کے مسلمان اتنا بھی نہ جانتے ہوں۔اجازت دیجئے کہ چند کلمات لکھ کر میں اپنا تعارف کراؤں۔امید ہے کہ میرے بعض افکار اس کے بعد زیادہ وضاحت سے سمجھے جائیں گے۔ میں نومسلم ہوں۔علمی اور سیاسی افکار میں دیوبندی جماعت سے تعلق رکھتا ہوں۔

دیوبندی جماعت

یہ جماعت امام ولی اللہ دہلوی کے طریقہ پر محافظین کی ایک مستقل پارٹی ہے۔جو ہند کے استقلال تام کو اپنا ''کریڈ'' مانتی ہے۔اور اس مقصد کی تحصیل کے لیے ہر ایک آزادی پسند جماعت سے مسلم ہو یا غیر مسلم، متحد ہو سکتی ہے۔مسلمانوں کی بیرونی دولتوں (حکومتوں) میں اس کا اچھا تعارف ہے۔

شیخ الہندؒ

میرے استاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی اس پارٹی کی مرکزی طاقت میں

بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ میں انھیں کے ارشاد سے ۱۸ سال ہند میں کام کرتا رہا۔ پھر ان کے حکم سے کابل چلا گیا۔ میں اسلامی تعلیمات کی تحصیل و تکمیل میں عمر کا بڑا حصہ صرف کر چکا ہوں۔ ہندوستان کے اندر اور اسلامی ممالک میں اسلامی ترقی کی کئی اسکیمیں بننے اور ان کے ناکام ہونے کا تجربہ رکھتا ہوں۔ یورپ و ایشیاء کے کئی ملکوں میں پرانی شاہی حکومتیں تباہ ہوتی دیکھ چکا ہوں۔ اور انقلاب کے بعد نوجوانوں کی کمزور جماعتوں کو کامیابی سے طاقتور حکومتیں بنانے کا بھی کافی مشاہدہ رکھتا ہوں۔ میں جس کام کو اپنے نام سے کہتا ہوں۔ حقیقت میں وہ نوجوانوں کی ایک جماعت کا کام ہے جن کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا ہوں۔

میرے سمع و بصر (آنکھ' کان) اور میرے ہاتھ پاؤں وہی ہندوستانی نوجوان ہیں۔ اس میں عربی مدرسے کے طالب علم اور کالج کے تعلیم یافتہ مساوی درجہ پر شریک رہے۔ نیز تعلیم یافتہ طبقہ میں سے ہندو اور سکھ بھی ہمارے شریک کار تھے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ میں آج تک کوئی یورپین زبان نہیں جانتا۔ محض میرے مطالعہ کے لیے میرے ان رفیقوں نے ہزاروں صفحہ کی کتابیں ترجمہ کیں۔

میرے استاد نے اپنی جماعت کے افکار کی نشر و اشاعت کے لیے ایک اجتماعی انجمن بنائی تھی۔ میں اس ''جمعیۃ الانصار دیوبند'' کا ناظم رہا ہوں اس کے بعد ''جمعیۃ علماء ہند'' ''جامعہ ملّیہ'' کا افتتاح بھی انہیں کے نام سے ہوا۔

کالج پارٹی

دیوبندی جماعت کے بالمقابل وہ لبرل ہیں جنہوں نے علی گڑھ کالج کو اپنا مرکز بنایا۔ کالج پارٹی نے مسلم لیگ پیدا کی ہے میں تقریباً ٦ سال تک اپنے استاد کے حکم سے کالج پارٹی سے ملتا رہا ہوں۔ میرے استاد نے میرا تعارف ڈاکٹر انصاری سے کرایا۔ ڈاکٹر

صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی سے ملایا۔

ایک دفعہ اس سے پہلے دیو بند چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا۔ تو میرے استاد سے تعلق کی بناء پر دہلی میں حکیم اجمل خان ہمارے مربی بنے۔ اور مجھے نواب وقار الملک اور نواب محمد اسحاق خان سے ملایا۔

اب میں اس تمہید کو ختم کرتا ہوں۔ اور اپنے خیالات مختصر الفاظ میں آپ کو سناتا ہوں۔

(بنیادی خیالات و نظریات)

(۱)

حضور نظام ایک مسلمان فرماں روا ہیں۔ جس قدر سیاسی ذمہ داری وہ سمجھ سکتے ہیں۔ غالباً ہندوستان کے اندر رہنے والا مسلمان اسے محسوس تک نہیں کرتا۔ وہ جب اپنی حکومت چلاتے ہیں تو اس حالت میں اپنا مسلمان ہونا بھول نہیں جاتے۔ لیکن وہ اپنی حکومت کو ''اسلامی'' نہیں کہتے۔ ان کے اس دانشمندانہ فیصلہ کی قدر کرو۔ اور ہندوستان کے کسی حصہ کو پاکستان کہنا قطعاً چھوڑ دو۔

(۲)

دہلی کا رہنے والا ایک مسلمان اگر گنگا جمنا کے دوآبہ کو اپنا کہنے لگے تو وہ سچا ہے' اور اس نے اپنے حق کا اعلان کیا ہے۔ ایسا ہی اگر ایک مدراسی مسلمان مدراس کو' اور بمبئی کا رہنے والا مسلمان بمبئی کو اپنا بنالے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

لیکن کیا کوئی عقل مند یہ فیصلہ بھی کر سکتا ہے کہ دہلی' بمبئی اور مدراس کے اپنانے میں اس ایک مسلمان کے سوا اور کوئی شریک نہیں۔ اس طرح کی باتیں ایک فاتح یا اس کا

جائز وارث فرماں روا کہتا ہے۔ کیا اس وقت ہندوستان کا کوئی بھی مسلمان اپنے آباؤ اجداد کا صحیح معنی میں وارث بن کر ہند کے کسی خطہ کا مالک کہلا سکتا ہے؟ اس لیے ''پدرم سلطان بود'' (میرا باپ بادشاہ تھا) کا فکر دماغ سے نکال دیجیے۔ آپ یقین کیجیے کہ اگر اس فکر میں کسی قدر حقانیت کا وزن ہوتا تو حضور نظام اپنی مملکت کو اسلامی حکومت کے نام سے موسوم کرنا اپنا فرض قرار دیتے۔

(۳)

ہندوستانی مسلمان دو سو برس سے سوتا رہا ہے۔ اس نے اپنے اعلیٰ درجہ کے مفکرین کی بے قدری کی۔ اس نے اپنے خیر خواہوں کو دشمنوں کے ہاتھ سے قتل کرایا۔ اس قسم کی غلطیاں شمالی ہند اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کی اکثریت سے تنہا تنہا بارہا ہوتی رہی ہیں۔ ورنہ ٹیپو سلطان اور مولانا محمد اسماعیل کی جماعتیں یوں شہید نہ ہوتیں۔ انقلاب کا مرکز بننے کی جو قدرتی صلاحیت ہندوستان کے مسلمان میں مضمر تھی، ان غلطیوں سے وہ انفرادی استعداد برباد ہو چکی ہے۔

(۴)

پچھلے پچاس ساٹھ برس سے ہندوستانی مسلمان انقلابی، اپنی خود اعتمادی کھونے کے بعد بیرونی مسلمانوں کی تھپکیوں سے اور زیادہ غلط اندیش بنتا چلا گیا۔ باہر کا مسلمان عموماً یورپ کے زیر اثر ہو کر ہندوستانی مسلمان کا لیڈر بنتا رہا ہے۔ جس انقلاب نے یورپ کی زمین اور اس کا آسمان بدل دیا ہے یا بدل رہا ہے۔ اس کا اثر اسلامی سلطنتوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ چنانچہ اب وہ اپنے بچاؤ کی فکر میں ہیں اس لیے وہ ہندوستانی مسلمان کو قطعاً بھول جائیں گے۔

(۵)

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان بھی اس انقلاب کے اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ یورپ کی جو بڑی سلطنت سو سال سے اس پر حکومت کر رہی ہے' وہ اپنے بادشاہ کے نام سے ڈکٹیٹر بن کر ملک کی تمام قوتوں کی تنہا مالک ہے۔ اس کے کارندے اب اپنی پالیسی یورپ کے سانچے میں ڈھالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور انھی کے راستہ سے انقلاب ہندوستان پہنچے گا۔

(٦)

اگر آپ اپنے نوجوان کو جو انقلابی یورپ سے آشنا ہو چکا ہے' اپنا رہنما مان کر اس انقلاب سے عہدہ برآ ہونے کا خیال نہیں رکھتے تو آپ کا وہی حشر ہوگا۔ جو بخارا کے مسلمان کا ہو چکا ہے۔ ان کو دیکھئے۔ ان کے لوٹنے میں کس قدر مسلمانوں نے حصہ لیا ہے۔

انقلاب جب ظاہر ہوتا ہے تو ایک مفلس مسیحی' مالدار مسیحی پر اور ایک مفلس مسلمان' مالدار مسلمان پر رحم نہیں کرتا۔ آپ مالداروں کے ایسے جتھے پر بھروسہ نہ کیجیے جو نہ تو فوجی طاقت کا مالک ہے' نہ قانونی اقتدار رکھتا ہے۔ نہ کسی ''انٹرنیشنل باڈی'' سے اپنا تعارف کرا سکتا ہے۔ آپ فقط اپنے نوجوان کا ساتھ دیجئے۔ وہ اپنے ملک میں قومی حکومت پیدا کرے گا۔ اسے معلوم ہے کہ اشوکا یا شاہ جہان کی حکومت کے زندہ کرنے کا امکان نہیں رہا۔

میں آپ سے عاجزانہ التجا کرتا ہوں کہ پرانے شاہی دور کی واپسی سے مایوس ہو جایئے۔

(۷)

اگر کوئی ہندوستانی مسلمان (عالم ہو یا سیاسی لیڈر) آپ سے یہ کہے کہ ہند کے جس قطعہ میں ہماری فعال اکثریت ہے، کیوں نہ وہاں ہم اپنا شاہی نظام جاری کرنے کی کوشش کریں، اس سے ہمارا کلچر بھی محفوظ ہو جائے گا اور اسلام کی خدمت بھی قوم کے مستعد افراد کے لیے آسان ہو جائے گی۔ مثلاً صوبہ سندھ، سرحد اور پنجاب کے بعض حصوں کو ملا کر ہم ایک حکومت بنالیں۔ اس میں فقط اس قدر محنت کرنا ہوگی کہ اپنے نوجوانوں میں پروپیگنڈا کر کے انھیں اس کام کے لیے تیار کر لیا جائے۔ نیز اگر دنیا میں لادینی نظام نوجوانوں کی طاقت سے پیدا کیا جا سکتا ہے تو ہمارے اس نظام کے پیدا ہونے سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

ان کے نزدیک اگر ہند کے کسی کونہ میں ایسی اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو اقلیت والے صوبوں میں رہنے والا مسلمان بھی غیر مسلموں کے اسلام کُش جذبہ کی خونخواری سے محفوظ ہو جائے گا، اور ممکن ہے کہ ہند میں اسلامی تاریخ اپنے آپ کو پھر دہرانے لگے۔

اس کے جواب میں مَیں آپ کی خدمت میں یہی مشورہ عرض کروں گا کہ آپ ایسی اسکیمیں بنانے والوں کی کوئی بات نہ سنیں اور اسے ''مُشت بعد از ہنگام جنگ'' کہہ کر ٹال دیں۔ جب ''ٹرکش امپائر'' جیسی مسلمانوں کی ایک مرکزی سلطنت موجود تھی تو ہم خود اس قسم کی اسکیمیں بناتے رہے۔ ہمارے ساتھ نوجوانوں کی ایک انقلابی جماعت اس اسکیم کی تکمیل میں کوشش کرتی رہی ہے۔ ہمیں بین الاقوامی سہولتیں بھی مہیا ہوتی رہی ہیں۔ مگر جب ترکی کو شکست ہو چکی ہے۔ ہم اس قسم کی انقلاب انگیز تجویز کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

ہم گویا آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس تجویز کا اثر برطانیہ اور رشیا دونوں سلطنتوں پر بہت برا ہوگا۔ اور اس کا خمیازہ سب سے پہلے افغانستان جیسی ایک چھوٹی سی اسلامی سلطنت کو بھگتنا پڑے گا۔ اس کے بعد جو انقلاب رونما ہوسکتا ہے وہ قطعی طور پر لادینی ہوگا۔

ایک سیاسی مبصر کے نزدیک اس قسم کی تجویز کے لیے فقط ایک وجہ جواز ہوسکتی تھی کہ سب سے پہلے یہ تحریک انڈین نیشنل کانگریس میں پیش کی جائے۔ کانگریس اس میں جس قدر کاٹ چھانٹ کرے۔ جس قدر اصلاح اور ترمیم تجویز کرے وہ فیصلہ مان لیا جائے۔ اس کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے اس فیصلہ کو برٹش پارلیمنٹ کے سامنے لایا جائے جس قدر ترمیمیں گورنمنٹ ضروری سمجھے وہ بھی سب منظور کر لی جائیں۔

کیا آپ دیکھتے ہیں کہ مسلم لیگ کے کرتا دھرتا جو آج کل ان تجویزوں کا منبع ہیں، ان میں اس قسم کے سوچ بچار کا میلان پایا جاتا ہے

؎ جب یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

(۸)

(مسلمانوں کی ترقی کا پروگرام)

اس کے بعد اگر آپ ہم سے مسلمانوں کی ترقی کا پروگرام پوچھیں تو ہم آپ کو اس وقت اس سے زیادہ نہیں بتلائیں گے کہ آپ اپنے نوجوان پر جو انقلابی یورپ سے آشنا ہے اور ہر قدم پر تبدیلی کو نہایت غور سے دیکھتا ہے، اس پر پورا اعتماد کیجیے۔

ہم اس کی قوتِ اجتہاد پر اعتماد کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے حالات کے مطابق اپنے

لیے راستہ نکال لے گا۔ ہم نے دس بیس نوجوانوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ وہ اگر افغان نوجوان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تو ان سے آگے رہتے ہیں۔ اس کے بعد یورپ کی مسلم اور غیر مسلم قوموں میں کام کرنے میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

میرا خیال ہے کہ تنہا لاہور ہمیں بیس ہزار نوجوان ایسے دے سکتا ہے جو ان نوجوانوں کی طرح کامیابی سے آگے بڑھیں۔ اور اسی طرح تنہا دیوبندی نظام اس قسم کے چالیس ہزار نوجوان مہیا کر سکتا ہے۔ جو ان نوجوانوں کے ساتھ مل کر کام کر سکیں۔

(پروگرام کے اہم نکات)

پروگرام کی تفصیلات کو آخری شکل میں معین کرنے کا تو یہ وقت نہیں ہے۔ مگر ہم چند ایسے اہم نکات ضرور بیان کرنا چاہتے ہیں تا کہ ہمارا نوجوان دھوکہ نہ کھائے۔

الف۔ اسلام حقیقت میں ایک انٹرنیشنل پروگرام ہے جو انسانیت کے لیے ضروری ہے۔ قرآن عظیم نے عربی نیشن کو بطور واسطہ استعمال کیا تھا۔ چنانچہ اس کے تھکنے پر عجمی قوموں نے وہ بوجھ اپنے سر لیا۔ حجاز اور دمشق کے بعد بغداد، بخارا، غزنی اور دہلی کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ مگر آج ہم اپنے نوجوان کو انٹرنیشنلسٹ بننے سے روکتے ہیں۔ کیوں کہ اسلامی انٹرنیشنلزم کا تو کوئی اجتماعی مرکز رہا نہیں۔ اور لادینی انٹرنیشنلزم کا زور شور سے منظم پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ وہ لوگ اپنے مطلب میں کامیاب ہونے کے لیے نہایت عمیق (گہری) چالیں چل رہے ہیں۔ ہم ڈرتے ہیں کہ ہمارا نوجوان دھوکا سے لادینی نہ بن جائے۔ اس معاملہ میں ہم اپنے تجربے رکھتے ہیں۔

اسی طرح ہم ایک ہندوستانی عالم کو اس سے روکتے ہیں کہ وہ کسی مسلمان بادشاہ کا

انتظار کرے جو باہر سے آئے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ اب کوئی مسلمان بادشاہ تو باہر سے آ نہیں سکتا۔ اور یہ بھولا مسکین کسی لادینی دولت (حکومت) کے پیچ میں نہ پھنس جائے۔

ب۔ ہمارا نوجوان جمہوری نظام کے سوا کسی اور نظام کو نہ مانے۔ قوم کے جمیع افراد کی پوری طاقت استعمال کرنا بجز اس نظام کے ممکن نہیں۔ ہماری قوم کا اعلیٰ طبقہ عموماً برباد ہو چکا ہے۔ بجز ان چند نیک بندوں کے جو پسماندہ جماعت کے اٹھانے میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ اسی نظام کو ہم جمہوری مانتے ہیں۔ نکمّے مالداروں اور رہبانیت سکھانے والے عالموں کا اس نظام میں کوئی دخل نہیں۔

ج۔ ہماری تلقین کے موافق جس جماعت نے نیشنلزم اور جمہوریت پر یقین پیدا کرلیا ہو اس کو پوری ذمہ داری سے ہم یقین دلاتے ہیں کہ انڈین نیشنل کانگریس کا نظام لادینیت سے بچنے کے لیے ایک مستحکم حصار کا کام دے گا۔ اس کا تجربہ ہم اپنی ذات پر یورپ میں کر چکے ہیں۔

ہمارے خیال میں لادینیت کا پروپیگنڈہ عموماً اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ اپنے سیاسی مرکز کی ڈکٹیٹرشپ کو وسیع کیا جائے۔ لیکن جب ایک نیشنلسٹ کو یہ لوگ اپنے اندر شامل کرنے سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اس پروپیگنڈے کا رخ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کا ممبر اُن کے حلقہء اثر سے قطعاً خارج ہے۔ وہ لوگ ہر ایک سوشلسٹ کو قبول کر لیتے ہیں۔ مگر جن لوگوں نے نیشنل کانگریس کے اندر اپنی سوشلسٹ پارٹی بنائی ہو۔ انھیں وہ اپنے مرکز سے ملحق نہیں مانتے۔

د۔ جب آپ نیشنل کانگریس میں جانے کا عزم کرلیں تو ہمارا مشورہ آپ کے لئے

یہ ہوگا کہ آپ اپنی مستقل پارٹی بنائیں' نہ تو گاندھی جی کی پارٹی کے پیچھے چل کر ہماری طرح کا ایک مسلمان کامیاب ہوسکتا ہے۔ اور نہ سوشلسٹوں میں مل کر وہ مسلمان عوام میں اپنی تحریک بآسانی چلاسکتا ہے۔ اس لیے اپنی پارٹی کو ان اعلیٰ اصول پر منظم کیجئے' جہاں آپ کا مذہب اور دنیا کا اقتصادی نظام باہم مل جاتے ہیں۔ اس پارٹی کا آئیڈیا نہایت معقول اور نظام نہایت مضبوط ہو۔ ممبروں کی کمی وزیادتی پر نظر نہ رکھی جائے۔ ہندوستانی مسلمان کی طاقت بہت زیادہ ہے جسے وہ خود محسوس نہیں کرتا۔ ایک عقل مند اقلیت بھی اپنی پارٹی کو ملک کی رہنما جماعت بنا سکتی ہے۔ اور ہندوستان کی دوسری قوموں سے مسلمان میں یہ صلاحیت زیادہ ہے۔

اس کے ساتھ ہم نوجوان کو وصیت کرتے ہیں کہ اپنے ہم مسلک نیشنلسٹ (مسلم وغیر مسلم) ہندوستانیوں کو اپنی پارٹی میں جمع کرتا رہے اور نکمّے مالداروں کو نزدیک نہ آنے دے۔ اور چندروز کی بھوک سے نہ گھبرائے۔

ھ۔ یہ پارٹی آگے بڑھ کر برطانوی حکومت سے ''ڈومینین اسٹیٹس'' کا چارج حاصل کرے۔

و۔ یہ پارٹی جرأت کر کے نیشنل کانگریس کو اندرونی نقطہ نظر سے انٹرنیشنل کانگریس بنا دے۔ ہر ایسے اجتماع کو جو ایک زبان بولتا ہے۔ اور معاشرت میں متقارب ہے' ایک قوم تسلیم کرے' اس کی زمین کو صوبہ نہ کہے بلکہ اسے اسٹیٹ بنا دیا جائے۔ اسی طرح آبادی میں مذہبی قلت وکثرت کا اثر صوبوں تک محدود ہو جائے گا۔ ہر ایک اسٹیٹ میں قانونی طاقت تو اکثریت کے قبضہ میں ہوگی۔ مگر قوتِ تنفیذ (نفاذ) میں اقلیت کے لائق افراد پوری عزت اور احترام کے ساتھ شریک رہیں

گے۔اس طرح قلت اور کثرت کا اتنا فرق ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاوے گا۔

ز۔ فیڈریشن کے مرکز میں برطانوی طاقت کے ساتھ ہر ایک اسٹیٹ کے نمائندے شامل کر دیے جائیں۔ جنہیں اسٹیٹ ملک کی مرکزی پارلیمنٹ میں بھیجے گی۔ مرکز کے قبضہ میں فقط ڈیفنس اور معاملات خارجہ ہوں گے۔

(۹)

الف۔ مگر اس سے پہلے ضروی ہے کہ یہ پارٹی انڈین نیشنل کانگریس کو اس تمام قرضہ کے تسلیم کرنے پر تیار کر دے جو برٹش گورنمنٹ پر ہند کے نام سے عائد ہے۔

ب۔ نیز نیشنل کانگریس سے یہ بھی قبول کرالیا جائے کہ ڈیفنس کے لیے ملک کو تیار کرنے کے زمانہ میں فوجی آفیسر برطانیہ ہی سے مستعار لیے جائیں گے۔

ہمارے خیال میں جب تک کانگریس اس قسم کے جس قدر ضروری فرائض ہیں ان کے ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ اسے فقط سول نافرمانی کرنے سے ڈومینین اختیارات نہیں ملیں گے۔

(۱۰)

ہم چاہتے ہیں کہ نیشنل کانگریس کے اندر نئی پارٹی کھڑی کریں۔ جو اصول مذکورہ بالا کی پابندی سے ملک کے لیے ترقی کا راستہ کھول دے۔ کیونکہ ہم ''نان وائیلنس'' کے پروگرام اور انقلاب میں مذہب کے احترام' ان دو اصول کے سوا گاندھی جی کے کسی پروگرام کو نہیں مانتے۔ اور نہ ہم سوشلسٹوں کی لادینی کو برداشت کر سکتے ہیں۔ ان مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہم ''ولی اللہ فلاسفی'' کو پارٹی کی عقلی اساس قرار دیتے ہیں۔ اور بیت الحکمت

میں ہم یہی فلاسفی سکھلاتے ہیں۔

(۱۱)

اگر ہماری پارٹی انڈین نیشنل کانگریس کو اس جمود سے نکالنے میں کامیاب ہو جائے تو:۔

الف۔ ہم اپنے ملک میں معاشی نظام کے مالک بن جائیں گے۔ ریزرو بنک پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ ہم اپنا بجٹ آمدنی سے متوازن بنائیں گے۔ ہم ہر ایک ہندوستانی کو روٹی کپڑا مہیا کریں گے۔ ہم اپنے مزدور اور کاشت کار کو یورپ کے مزدور اور کاشت کار سے معاشی حالت میں پیچھے نہیں رہنے دیں گے۔

ب۔ ہم ہندوستانی زبانوں کو رومن کیرکٹر میں لکھنا ضروری بنا دیں گے۔ اس سے بہت سے بیکار جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

ج۔ ہم ہر مرد و عورت کے لیے اس کی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا اور ہر مرد و عورت کا ملک کی مدافعت (دفاع) میں حصہ لینا ضروری قرار دیں گے۔

د۔ ہم یورپ کی مختلف اقوام میں سے جس قدر نیک انسان ہماری ملکی ترقی کی امداد کے لیے ہمارے ملک میں آنا چاہیں، ہم انھیں اپنے اختیار سے داخلہ کی اجازت دے سکیں گے۔

(۱۲)

اب میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔ اس وقت بعض تفصیلی باتوں کا تذکرہ اس پلیٹ فارم سے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ورنہ جس قسم کے تجربات کا میں مالک ہوں، بچے

بوڑھے کو سمجھا دیتا کہ کیوں ہند میں اسلام کی حفاظت کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کے سوا اور سب راستے بند ہو چکے ہیں۔ اور کس طرح کانگریس میں غیر مسلم میجارٹی کے ہوتے ہوئے خدام خلق کی تحریک سے اسلام کی ترقی کا راستہ کھولا جا سکتا ہے۔ ہم اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرتے ہیں کہ خدام خلق یا خدام انسانیت تیار کرنے کے لیے ہم نے شیخ الہند کی یادگار کے نام سے توکلاً علی اللہ جامعہ ملیہ میں ''بیت الحکمۃ'' کھول دیا ہے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو ہم اپنے نوجوانوں کو بہت جلد اپنا مطلب سمجھا دیں گے۔

صلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا محمد خاتم النبین و سید المرسلین وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وسلم وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین.

مقالہ نمبر ۱۷

بیت الحکمت

(حکمت امام ولی اللہ دہلویؒ)

۱۰ فروری ۱۹۴۲ء

بیت الحکمۃ' قاسم العلوم۔ لاہور

پس منظر

[حضرت سندھیؒ نے سیاسی تعلیمات و افکار کیلئے جہاں جمنا' نربدا' سندھ ساگر پارٹی ۱۰ دسمبر ۱۹۳۹ء میں قائم کی تھی۔ وہاں حضرت شیخ الہندؒ سے لے کر امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک ولی اللّٰھی سلسلہ کے اکابرین کی کتابیں اور علوم و افکار کی تعلیم و تعلم کیلئے ''بیت الحکمۃ'' کے عنوان سے ادارے قائم کئے تھے' چنانچہ جامعہ ملّیہ دھلی' دارالرشاد پیر جھنڈا' مظہر العلوم کراچی (سندھ) دین پور نزد خانپور' (پنجاب) اور قاسم العلوم لاہور میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں' لاہور کی شاخ کو نومبر ۱۹۴۰ء قائم ہو گئی تھی۔ لیکن حضرت سندھیؒ نے اس کا تعارف اور اغراض و مقاصد فروری ۱۹۴۲ء میں تحریر کیا' ''بیت الحکمۃ'' کے نام سے قائم ہونے والے ادارے آگے چل کر ''محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج'' کا حصہ بن گئے تھے۔ جیسا کہ حضرت سندھیؒ کے آخری خطبہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس تعارف اور اغراض و مقاصد کو ''بیت الحکمۃ' لاہور'' کی جانب سے شائع کیا گیا تھا۔ جسے اب نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔

حضرت سندھیؒ کے مقالات میں اس تحریر کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ آزاد]

بیت الحکمت

حکمت الامام ولی اللہ دہلوی

کچھ کذبِ افترا ہے، کچھ کذبِ حق نما ہے

یہ ہے بساط اپنی، وہ ہے کمال اپنا   حالی

ہم ہندوستانی سیاست کے اس دور کو جو رولیٹ ایکٹ **Rowlett Act** کی ایجی ٹیشن **Agitation** سے شروع ہوا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کا دور مانتے ہیں۔ کیوں کہ ہم جانتے ہیں، کہ اگر گورنمنٹ شیخ الہند کی کاروائیوں سے مطلع نہ ہوتی تو نہ رولیٹ کمیشن **Rowlett Commission** بیٹھتا۔ نہ کانگریس کی تیز گام پارٹی کو اس طرح ترقی کا موقع ملتا۔

ہماری دماغی تکلیف انتہاء کو پہنچ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے عقل مند اور آگے بڑھ کر کام کرنے والے نوجوان شیخ الہند کا ذکر تک بھولتے جاتے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس طرح سے ہم ہندوستان کے میدان سیاست سے بالتدریج پسپائی پر مجبور ہوتے جائیں گے۔ اس لیے ہم نے مکہ معظمہ میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جب کبھی ہم وطن پہنچے یا ہماری رہنمائی میں کوئی کام چل سکا تو ہم جامعہ ملیہ دہلی میں "یادگار شیخ الہند" ضرور قائم کریں گے۔ چونکہ ہماری شخصیت کا تمام علمی و سیاسی ارتقاء اس مردِ خدا کے اتصال سے وابستہ ہے، اس

لیے ضروری ہے کہ یہ تحریک ہمارے لیے بھی تقدم (آگے بڑھنے) کا راستہ صاف کر دے گی۔ اگر چہ ہمارے خلاف یہ بدگمانی پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر اس وقت ہمارا نقطۂ نظر اپنے شخصی تفوق سے قدرے بلند ہے۔

ہماری سوچی سمجھی ہوئی مستقل رائے ہے کہ اگر مسلمانان ہند اپنا تعلق حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی کے مجدّدانہ پروگرام سے قائم نہ کر لیں گے تو ان کی قومی تحریک اپنی تاریخی عظمت کھو بیٹھے گی۔ اگر مفکرین کا کوئی طائفہ ہمارے اس فکر کو قابل قبول سمجھے تو اس کے بعد ہم دنیا کو منوا سکتے ہیں کہ ہمارے دور کو ''فتاویٰ عالمگیری'' کے تدوینی زمانہ سے ملانے کے لیے کوئی عروۂ وثقیٰ (مضبوط سلسلہ) مل سکتا ہے تو وہ فقط حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی ہی ہو سکتے ہیں۔

ہم ہندوستان پہنچ کر اپنی پریشان حالی سے جس قدر فرصت نکال سکے۔ اس میں یادگار شیخ الہندؒ کے فکر سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہوئے چنانچہ ہم نے:

(۱) سب سے پہلے انڈین نیشنل کانگریس میں اپنی مستقل پارٹی بنانے کا اعلان کیا۔

(۲) اس پارٹی کے اصول اساسیہ میں حکیم الہند امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کو ایک مستقل اور غیر متبدّل اصول قرار دیا۔

(۳) یہ فلسفہ پڑھانے کے لیے بیت الحکمۃ کی تحریک شروع کر دی۔ بیت الحکمۃ کا نصاب ہم نے مکّہ معظّمہ ہی میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اور گزشتہ سال زیادہ تر وہی طالبعلم اپنے باقی ماندہ نصاب کی تکمیل کے لیے دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔

(۴) اس علمی تحریک کو اس بڑے استاد کی یادگار بنایا۔

(۵) اس تحریک کو مستقل طور پر چلانے کے لیے جمعیۃ خدام الحکمۃ کا نظام بھی تجویز کیا۔

ہم اپنے موجودہ حالات میں اس راستے پر دھیمی رفتار سے چلنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ہم جب کبھی جامعہ ملیہ میں گئے۔ بیت الحکمۃ بنانے کی دعوت دیتے رہے۔ بالآخر ۷ انومبر ۱۹۴۰ء جامعہ نگر میں بیت الحکمۃ (یادگار شیخ الہند) کا افتتاح ہو گیا۔

اس مرکزی بیت الحکمۃ کی تمہید اور تائید کے لیے ہمیں ''دارالرشاد'' (گوٹھ پیر جھنڈا) ''مظہر العلوم'' (کراچی) دین پور اور لاہور میں جس قدر موقعہ ملتا رہا۔ بیت الحکمۃ کی شاخیں قائم کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۰ دسمبر ۹۳۹ھ کو ''جمنا' نربدا' سندھ ساگر پارٹی'' کا دارالرشاد میں اعلان ہوا۔ ۲۴ دسمبر ۹۳۹ھ کو ''دارالرشاد'' میں اور ۲۸ دسمبر کو ''مظہر العلوم'' کراچی میں ''بیت الحکمۃ'' قائم ہو گئے۔ اس وقت خدا کے فضل سے دین پور کا ''بیت الحکمۃ'' جو ۱۲۲ اکتوبر ۹۴۰ھ کو کھلا۔ مستقل آمدنی کا مالک ہے۔ لاہور میں مولانا احمد علی سلمہ کے جوان شاگردوں نے نومبر ۹۴۰ھ فاروق گنج میں ''بیت الحکمۃ'' کی بنیاد ڈالی۔

ہم ''بیت الحکمۃ'' میں قرآن عظیم کے ساتھ حضرت حکیم الہند امام ولی اللہ کا فلسفہ اور حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ ہم حضرت شیخ الہند کا خطبہ جو انھوں نے مولانا محمد قاسمؒ کی کتاب 'حجتہ الاسلام' کے شروع میں لکھا تھا' اس کو سامنے رکھ کر اس ''بیت الحکمۃ'' سے بہتر ان کے لیے یادگار سوچ ہی نہیں سکتے۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں:

> ''اب طالبان حقائق اور حامیان اسلام کی خدمت میں یہ درخواست ہے کہ حضرت خاتم العلماء (قاسم العلوم و الخیرات سیدی و مولائی حضرت مولانا مولوی محمد قاسم متعنا اللہ بعلومہ و معارفہ) کے رسائل کے مطالعہ میں کچھ وقت ضرور صرف فرمائیں اور پورے غور سے کام

پس اور انصاف سے دیکھیں کہ ضروریاتِ موجودہ زمانۂ حال کے لئے وہ فائق اور مختصر اور بہتر اور مفید ہیں یا نہیں۔ باقی خدام مدرسہ عالیہ دیوبند نے یہ تہیہ بنام خدا کرلیا ہے کہ تالیفاتِ موصوفہ مع بعض تالیفات حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ وغیرہ (مثل مولانا رفیع الدین ومولانا محمد اسماعیل شہید) نصاب تعلیم میں داخل کر کے ان کی ترویج میں اگر حق تعالی توفیق دے تو جان توڑ کر سعی کی جائے اور اللہ کا فضل حامی ہو تو وہ نفع جو ان کے ذہن میں ہے' اوروں کو بھی اس کے جمال سے کامیاب کیا جائے۔

کیا فائدہ فکر بیش وکم سے ہو گا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو کچھ ہوا۔ ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہو گا تیرے کرم سے ہو گا

۱۰ فروری ۱۹۴۲ء ہندی۔
بیت الحکمۃ' قاسم العلوم' لاہور

مقالہ نمبر ۱۸

سندھ ساگر نیشنل بورڈ

کا

ابتدائی مسودہ

۲ جون ۱۹۴۲ء

دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا۔ سندھ

پس منظر

[حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے سندھ میں ولی اللھی علوم وافکار اور تاریخ و حکمت پڑھانے کیلئے ''محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج'' محمود نگر (گوٹھ پیر جھنڈا) میں قائم کیا تھا۔ چنانچہ اپنے آخری خطبہ میں لکھتے ہیں:-

''یاد رکھنا چاہیے کہ ہم نے دھلی کی تاریخ پڑھانے کیلئے ''محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج'' محمود نگر برائے یادگار شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی'' قائم کیا ہے۔ اس سارے ادارے کا نام ''سندھ ساگر انسٹی ٹیوٹ'' رکھا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ادارہ اپنے تین مرکز بنائے گا''۔

۱۔ بیت الحکمۃ جو محمد قاسم ولی اللہ کالج کا جزو بن جائے گا۔

۲۔ سندھ ساگر اکیڈمی جو کالج کیلئے نشر و اشاعت اور طلباء جمع کرنے کا کام۔ نیز فارغ التحصیل طلباء کی تنظیم قائم کرے گی۔

۳۔ جمنا' نربدا' سندھ ساگر پارٹی: سیاسی تعلیمات دینے کیلئے کام کرے گی۔''

جمنا' نربدا' سندھ ساگر پارٹی نے سندھ کی سطح پر ایک ''نیشنل بورڈ'' قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس میں سندھ میں کام کرنے والی تمام سیاسی اور با اثر مذہبی جماعتوں کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس نیشنل بورڈ کے اغراض و مقاصد' دائرہ کار' کام کرنے والی مجالس کی تفصیلات کیلئے حضرت سندھیؒ نے ایک ابتدائی مسودہ تیار کیا تھا۔ تا کہ دوسری جماعتوں کے سامنے پیش کر کے اسے منظور کرا لیا جائے۔ اس بورڈ کا یہ ابتدائی مسودہ حضرت مولانا عزیز اللہ جروار صاحب (گوٹھ عزیز آباد نزد پنوں عاقل' ضلع سکھر۔ سندھ) تلمیذ حضرت سندھیؒ کے پاس محفوظ تھا۔ ان کے شکریہ کے ساتھ شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ آزاد]

سندھ ساگر نیشنل بورڈ

کا ابتدائی اساسی مسودہ

(۱) جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی ''سندھ کا نیشنل بورڈ'' قائم کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

(الف) یہ نیشنل بورڈ سندھ پر بیرونی حملے کی صورت میں مدافعت کرنے والے برطانوی فوجی آفیسروں کو ہر قسم کی امداد دینا اپنا فرض قرار دیتا ہے۔ سندھ میں فوجی آفیسروں کو جس قدر والنٹیر (مددگار) اور روپے کی ضرورت ہوگی۔ سندھ ساگر پارٹی کا نیشنل بورڈ پوری ذمہ داری سے اسے پورا کرے گا۔

(ب) یہ نیشنل بورڈ سندھ کے اندرونی خلفشار کو دور کرنے کیلئے ملکی ذمہ دار آفیسروں کے ساتھ اپنے بہترین کارکن شریک کرے گا۔ جو پوری ذمہ داری سے مشورہ اور تعاون پیش کرتے رہیں گے اور مستقل امن قائم کرانے میں یقیناً کامیاب ہوں گے۔

(۲) اس نیشنل بورڈ میں سندھ کی ہر ایک سیاسی پارٹی کی شرکت حاصل کی جائے گی۔ جس میں ایک طرف نیشنل کانگریس، مہا سبھا، آریہ سماج، اکالی سور ما وغیرہ اور دوسری طرف مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء مجلس احرار (اسلام)، خاکسار (پارٹی) وغیرہ پارٹیوں کے نمائندے جمع کیے جائیں گے۔

(الف) اس کے ساتھ سندھ کے متعدد مشائخ طریقت کی اُن فعال جماعتوں کے نمائندے بھی خصوصی احترام کے ساتھ بلائے جائیں گے۔ جن

کا ملک کے عوام پر گہرا اثر ہے۔ لیکن گورنمنٹ کے اعلیٰ آفیسروں کو ان کے جذبات اور مشوروں کی صحیح اطلاع بہت کم ملتی ہے۔

(ب) سندھ ساگر پارٹی ملکی قوت کو انتشار سے بچانے کیلئے اس قسم کی علیحدگی پسند (ہندو، مسلمان) جماعتوں کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش ''خدمت خلق'' کے اصول پر اپنا خاص فرض سمجھتی ہے۔

(۳) نیشنل بورڈ کا اجتماع دو مجلسوں میں منعقد ہوگا:

(الف) ''مجلس عوام'' جس میں پارٹیوں اور جماعتوں کے منتخب افراد نشست کریں گے۔ فی الحقیقت یہی مجلس بورڈ کے فیصلوں کی ذمہ دار ہے۔

(ب) پارٹیوں اور جماعتوں کے رہنماؤں اور سرداروں کی مجلس، جسے ''مجلس خواص'' کا نام دیا جائے گا۔

(۴) جس قدر جماعتیں اس نیشنل بورڈ میں شرکت اختیار کریں گی۔ ان مجلسوں کے وہ منتخب اراکین جو اجلاس میں جمع ہو جائیں گے۔ انہیں کی کثرت رائے سے مجلس عوام کے فیصلے مرتب کیے جائیں گے۔ ہر ایک جماعت اپنے اپنے حلقہ اثر میں اس فیصلے کی تعمیل کرانے کی ذمہ دار ہوگی۔

(الف) اگر کوئی پارٹی اپنے بعض ارکان سے اپنا فیصلہ نہیں منوا سکتی اور اس سے بورڈ کے کام کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ تو اس صورت میں وہ پارٹی ان ممبروں کے معاملے کو گورنمنٹ کے حوالے کرسکتی ہے۔

(ب) مجلس عوام کے نظام کو مستحکم بنانے کیلئے اس کے ممبروں میں سے ایک ڈسپلن کمیٹی بنائی جائے گی۔ جس میں انصاف اور انتظام کا بہترین تجربہ رکھنے والے لائف ممبر منتخب کیے جائیں گے۔ اس کمیٹی کے ممبر

تین یا پانچ سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنے مخصوص ذرائع سے ہر ایک جماعت کے اعمال کا احتساب کرتے رہیں گے وہ کسی ممبر یا کسی پارٹی کے ایک حصے کو نیشنل بورڈ سے نکال سکتے ہیں۔ ان کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا۔

(۵) جس قدر جماعتیں اس بورڈ میں شامل ہوں گی۔ ان کے لیڈروں اور سرداروں کیلئے ایک مجلس اعلیٰ علیحدہ بنائی جائے گی۔ جس میں سردار بہ نفس نفیس شامل ہوں گے یا اس اجلاس کیلئے خصوصی اختیار دے کر اپنا وکیل بھیجیں گے۔

(الف) مجلس عوام کے تمام فیصلے تصدیق کے لیے مجلس اعلیٰ میں پیش ہوں گے۔ یہ مجلس خواص اپنی طرف سے کوئی نئی تجویز پیش نہیں کرے گی۔

(ب) اگر مجلس اعلیٰ کسی فیصلے میں ترمیم کرتی ہے تو وہ فیصلہ نظر ثانی کے لئے مجلس عوام میں بھیج دیا جائے گا۔ اگر مجلس عوام کی اکثریت اس ترمیم کو قبول نہیں کرتی تو وہ فیصلہ قابل قبول نہیں رہے گا۔

(ج) مجلس عوام کا وہ فیصلہ جسے مجلس خواص نے ایک دفعہ رد کر دیا ہے، تین ماہ کے بعد نئے سرے سے مجلس عوام میں پیش ہو سکتا ہے۔ اگر مجلس عوام دوسری دفعہ بھی وہی فیصلہ قائم رکھتی ہے تو مجلس اعلیٰ اسے روک نہیں سکتی۔

(۶) ہندوستان میں جس قدر آل انڈیا نظام (یعنی کل ہند کے وحدانی نظام) قائم ہیں ان کی سندھی برانچیں اور سندھی کمیٹیاں اپنی مستقل ذمہ داری پر اپنے مرکز سے اجازت لے کر اس نیشنل بورڈ میں شامل ہوں گی۔ لیکن غیر سندھی ممبران کو اس بورڈ میں کسی قسم کی مداخلت کا حق نہیں دیا جا سکتا۔

استثنا: اس عام قاعدے میں فقط ایک مخصوص صورت مستثنیٰ ہے۔ جب کہ بورڈ کے تمام

ممبر یعنی مجلسیں کسی خاص محترم شخصیت کے شمول پر متفق ہو جائیں۔

(۷) سندھ ساگر پارٹی اپنے اساسی اصول ''خدمت خلق'' کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری سمجھتی ہے۔ وہ اس نیشنل بورڈ کے جمع کرنے میں تسہیلات بہم پہنچانے کا کام بھی اسی اصول کی رہنمائی میں کر رہی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ نیشنل بورڈ کے پہلے اجلاس منعقد ہونے کے بعد سندھ ساگر پارٹی کا اس تحریک پر کوئی مؤثر حق باقی نہیں رہے گا۔ البتہ اگر بورڈ کوئی خدمت پارٹی کو تفویض کرے گا۔ تو پارٹی اپنے اس اصول ''خدمت خلق'' پر اسے پورا کرتی رہے گی۔

(۸) ۲۴ مئی ۹۴۲ ہندی کو سندھ ساگر پارٹی کے انتظامی اراکین نے بھر چونڈی سے سندھ کا دورہ شروع کیا ہے۔ وہ پارٹی پروگرام سے ہمدردی رکھنے والے احباب سے مل کر ملک کے اہل الرائے کا میلان دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر امید کا پہلو غالب نظر آیا تو ایک عارضی کمیٹی بنا دی جائے گی۔ جو کیبنٹ کے ممبروں سے مل کر گورنمنٹ کے سامنے درخواست پیش کرے گی کہ

آل انڈیا نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ وغیرہ پارٹیوں کے باہمی فیصلے تک ہمارے ملک ''سندھ'' کا معاملہ مؤخر نہ کیا جائے' بلکہ گورنمنٹ جلد سے جلد اس نیشنل بورڈ کو کارآمد بنانے کیلئے سہولتیں بہم پہنچائے تا کہ مستقل امن کی کوئی صورت نظر آئے۔ ممکن ہے ہمارا یہ فیصلہ آل انڈیا مسئلے کو حل کرنے میں مدد دے۔ واللہ المستعان.

عبیداللہ سندھیؒ

مئوسس: ج۔ن۔ سندھ ساگر پارٹی

۲۔ جون ۹۴۲ ہندی

بیت الحکمت۔ دارالرشاد' سندھ ساگر

گوٹھ پیر جھنڈے والا' ضلع حیدرآباد (سندھ)

مقالہ نمبر ۱۹

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک

استدراک و تصحیح

مئی ۱۹۴۳ء

پس منظر

[امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ہندوستان واپس آ کر اہل علم و دانش کو حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفہ اور سیاست سے متعارف کرانے کیلئے دو اہم ترین کتابیں تحریر فرمائی تھیں:۔

ا۔ امام ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کا اجمالی تعارف:

حضرت سندھیؒ نے اس عنوان سے اصل میں ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا، انہی دنوں ''الفرقان'' کا ''شاہ ولی اللہ نمبر'' آ رہا تھا، چنانچہ حضرت سندھیؒ نے اس میں اشاعت کیلئے یہ مقالہ ارسال فرما دیا، اس مقالہ پر مولانا نورالحق علویؒ پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور نے مفصل حواشی لکھے تھے، جو دراصل حضرت سندھیؒ کی تقاریر اور کتب کے حوالہ جات پر مشتمل تھے، یہ مقالہ ''الفرقان'' کے مذکورہ نمبر میں دسمبر ۱۹۳۹ء/ذی القعدہ ۱۳۵۹ھ کو طبع ہوا تھا۔

اس مقالہ کی اتنی مانگ ہوئی کہ صرف نو ماہ بعد اگست ۱۹۴۱ء میں مولانا منظور نعمانی ایڈیٹر ''الفرقان'' نے اس کو دوبارہ کتابی صورت میں طبع کرا دیا۔ اور اس پر درج ذیل رائے کا اظہار کیا:۔

''بہت ممکن ہے کہ اس مقالہ میں بعض چیزیں آپ کیلئے نامانوس یا وحشت انگیز ہوں، لیکن الفاظ کی وحشت سے گزر کر اگر آپ معنی اور مقصد پر زیادہ غور فرمائیں گے، تو وہ وحشت انشاء اللہ اکثر جگہ رفع ہو جائے گی، اور اُن لوگوں کیلئے تو ابتداءً بھی وحشت بہت کم ہوگی، جنہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے علوم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہوا ہے۔

خود مَیں بھی اس مقالہ کے کئی مقامات کا صحیح مطلب اور مولانا سندھی کی مراد حضرت شاہ صاحبؒ کی تصانیف کی رہنمائی سے سمجھ سکا ہوں۔

یہ مقالہ شاہ ولی اللہ صاحب کی حکمت کا اجمالی تعارف ہی نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت آپ کے علمی کام (تجدید فی العلوم الشرعیہ) سے واقفیت اور علی وجہ البصیرت واقفیت کیلئے اس میں کافی سامان ہے، اور ''ولی اللّٰھی علوم و معارف'' کے لئے بجا طور پر اس مقالہ کو بنیادی لٹریچر قرار دیا جا سکتا ہے۔ نیز اس کے مطالعہ کے بعد ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ''ولی اللّٰھی حکمت'' پر مولانا سندھیؒ کی نظر کس قدر گہری اور شاہ صاحب کے علوم و معارف کا انہوں نے کس قدر عمیق (گہرا) مطالعہ فرمایا ہے۔''

مولانا نعمانی صاحب نے اپنی اس وقیع رائے گرامی کے بعد مولانا سید سلیمان ندویؒ کی رائے لکھی ہے۔ نعمانی صاحب کے نام ایک خط میں مولانا ندوی لکھتے ہیں:-

''مولانا سندھیؒ کے مضمون کو میں نے بغور پڑھا، اور اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ بے شبہ مولانا سندھیؒ کی نظر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفہ اور نظریات پر نہایت وسیع اور عمیق ہے۔''

مولانا سندھیؒ کے اس مقالہ کو بعد میں پروفیسر محمد سرور صاحب مرحوم نے متن اور حاشیہ کو باہم ملا کر ''شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کی سیاسی تحریک:۔

زوال کے بعد ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا کرنے اور آزادی وحریت کیلئے ولی اللّٰھی جماعت نے جو شاندار کردار ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا سندھیؒ نے اس کو متعارف کرانے کیلئے اس عنوان سے ایک بنیادی کتاب تحریر فرمائی اور خود اپنے قلم سے ۱۱۔اکتوبر ۱۹۴۱ء کو شروع کر کے ۲۵۔اکتوبر ۱۹۴۱ء تک اصل مقالہ تحریر کیا' پھر مولانا نور الحق علوی نے آپ سے سبقاً سبقاً پڑھ کر اس پر مفصل حواشی تحریر کیئے۔ اس طرح یہ کتاب ۱۹۴۲ء کے آغاز میں طبع ہو کر سامنے آئی۔

اس پر ہندوستان میں اُن جماعتوں سے تعلق رکھنے والے چند افراد نے شور مچایا' جن کے غلط سیاسی کردار سے تحریکِ آزادی کو نقصان پہنچا تھا' حالانکہ مولانا سندھیؒ نے اپنی کتاب میں ان کے کردار کو بڑے اعتدال کے پیرایہ میں بیان کیا تھا' اور خوبصورتی سے اپنی بات کی وضاحت کی تھی۔

حضرت مولانا سندھیؒ نے تقریباً ایک سال تک ان کی تنقید اور بے جا الزامات کو بڑے تحمل اور برداشت کے ساتھ سنا' اور مناظرہ ومجادلہ کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اہلِ علم کو سوچنے کا موقع دیا۔ سال بھر کے بعد اپنی اس کتاب پر ''استدراک وتصحیح'' کے عنوان سے اپنے مطالب کی توضیح کیلئے زیرِ نظر مقالہ سپرد قلم کیا۔ اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ پر غور وفکر کرنے والوں کیلئے بصیرت وشعور کا ایک دروازہ کھول دیا۔

ہندوستان کی تاریخ پر اتنی جامعیت کے ساتھ گفتگو غالباً کسی اور مفکر نے نہیں کی ہے۔ اس مقالہ میں مرحوم سندھیؒ نے پہلے فلسفہء تاریخ کی حقیقت بیان کی' پھر ہندوستان کے مسلم دور کا تجزیہ کیا' اور آخر میں زوال کے بعد کے دور میں کام کرنے والی ولی اللّٰھی جماعت کے

تاریخی فکر، تسلسل، بنیادی نکات اور اساسی کردار کو انتہائی جامعیت کے ساتھ نکات و اشارات کے ذریعہ واضح کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مقالے کا ایک ایک پیراگراف ہندوستان کی تاریخ پر لکھی جانے والی کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اور واقعات و حقائق کے تناظر میں تاریخی نتائج اخذ کرنے کے عمدہ اسلوب کا شاہکار ہے، اس مقالہ کے ایک ایک نکتہ پر مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اور صاحب ''نُزهةَ الخَوَاطِر '' کا یہ جملہ کہ ''مولانا سندھیؒ علوم کی تاریخ اور طبقات پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے'' مولانا کے حوالے سے حقائق تاریخ کا ایک باب کھولتا ہوا نظر آتا ہے۔

اللہ سے دعاء ہے کہ ہمیں حضرت سندھیؒ کے علوم و افکار سے استفادہ کرنے اور انہیں درست تناظر میں سمجھنے کی توفیق دے۔ آمین آزاد]

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک

استدراک و تصحیح

(تمہید)

ہمارے دوست عام طور پر جانتے ہیں کہ جب سے ہم ہند میں واپس آئے ہیں ہم نے کسی سیاسی جماعت سے پورے اشتراک کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔ بلکہ ایک ایسے فکر کی دعوت دیتے رہے جو ملک کی عام ذہنیت سے بہت دور ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ جو پارٹی امام ولی اللہ کی فلاسفی پر بنے گی، وہی ہماری وطنی، ملی ضرورتیں پوری کرے گی۔ ہمارا یہ فکر اور زمانہ کی وہ فضا کہ اہل علم بھی نہیں جانتے کہ امام ولی اللہ واقعی فلاسفر تھے۔ یا انہوں نے کوئی ایسا سیاسی تخیّل پیدا کیا ہے جو آج جمہور کے ترقی کن طبقہ کے مزاج سے سازگار ہوسکتا ہے۔

اپنے افکار کا تعارف کرانے کے لیے ہم نے دارالرشاد میں پرانے رفقاء کے اجتماع عمومی کے ایک جلسہ میں ''ج۔ن۔ سندھ ساگر نیشنل پارٹی'' کے اساسی پروگرام کا اعلان کیا۔ اسے سندھی'' اُردو، انگریزی میں شائع کرایا۔ پھر اس کی توضیح میں مقالات لکھے خطبات دیئے، وہ سب ہمارے مرکزی فکر کو سمجھنے کے لیے تمہید کا کام دیتے ہیں۔

آخر میں مفکرین کا ایک خاص حلقہ سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہوا۔ وہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ ہند جیسے براعظم میں اگر ایک ایسی سوسائٹی جو خاص فکر لے کر پیدا ہوتی ہے اور تخمیناً سات سو سال کی جدوجہد سے اپنے لیئے عالمگیر ترقی کا پروگرام بنالیتی ہے۔ کیا اس

عظیم الشان جماعت کی تمام ضرورتیں کسی ایسی نیشنل پارٹی کی تشکیل سے پوری ہوسکتی ہیں' جو امام ولی اللہ کے فلسفہ اور سیاست سے اساسی تعلق رکھتی ہو۔

ان کے افکار میں ہلکا سا تموّج پیدا کرنے کے لیے ہم نے پہلے ''امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف'' کرایا۔ اس کے بعد ان کی سیاست کا' (تعارف کرایا) ہم امام ولی اللہ کو ''الٰہیات'' میں اور ''اقتصادیات'' میں ایک مستقل امام فرض کر کے مضامین لکھتے ہیں۔

پہلے رسالہ میں بھی اگرچہ بعض خیالات نئے تھے مگر انہیں ناقابل برداشت نہیں سمجھا گیا۔ البتہ دوسرے رسالہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے' اس میں مختلف جماعتوں کے لیے مزاحمت کا کافی سامان موجود ہے۔

جس قدر احزاب پہلے سے امام ولی اللہ کی طرف منسوب ہیں یا جس قدر جماعتیں ان کی مخالف تحریکوں کو چلاتی ہیں۔ اور اپنے تفوق کا دعویٰ بھی رکھتی ہیں۔ ان کے افکار سے اس رسالہ میں تعرض نہ کرنا ممکن' ہی نہ تھا۔ اس لیے نسبتاً اس پر زیادہ توجہ ہو رہی ہے۔

ہمارے بعض دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ اس سیاسی رسالہ میں بہت سے نئے خیالات ہیں۔ ہم جلدی نہ کریں۔ اہل علم کو سوچنے کا موقع دیں۔ اس لیے سال بھر ہم خاموش رہے۔ اس عرصہ میں ہم نے ایک نیا رسالہ مرتب کیا ہے (رسالہ محمودیہ)' جس میں امام ولی اللہ کی تصانیف سے مختلف فوائد بغیر کسی حاشیہ آرائی کے جمع کر دیے ہیں۔ اس کے شائع ہونے پر اہل علم کے لئے غور کرنے میں آسانی ہوگی۔ لیکن بعض عزیز دوستوں کا تقاضا ہے کہ ہم اس موضوع پر ایک مقالہ ضرور لکھیں۔ جس سے بعض غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ اس لیے مناظرہ یا مجادلہ سے بچ کر اپنے مطالب کی توضیح کے لیے ہم نے یہ تبصرہ تیار کر دیا ہے۔ اگر اس طرح ہم بعض دوستوں کے ذہنی انتشار کو کم کر سکتے ہیں تو ہم اسے خدا کا خاص فضل سمجھیں گے۔ واللہ ھو المستعان۔

باب اوّل

جس میں امام ولی اللہ کے خاندان کا ذکر ہے

حکیم الہند امام ولی اللہ الدہلوی امام ائمۂ انقلاب

(۱)

چونکہ عقلی اجتماعی اصول پر تاریخ ہند کا مطالعہ کرنے میں ہم کسی مؤرّخ کو امام نہیں مانتے' اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ جس فلسفہ کا ہم تعارف کراتے ہیں اس کی ماہیت اور جس زمین اور زبان سے ہم اسے ربط دیتے ہیں اس کے متعلق اپنا طرز تفکر صراحۃً بیان کر دیں تاکہ ہمارا نظریہ سمجھنے میں اصطلاحی اختلاف سے غلط فہمی نہ ہو سکے۔

(تعارف فلسفۂ تاریخ)

(الف) جب انسانیت کا ایک حصہ کسی بڑے قطعہ زمین میں لمبی مدت تک مل جل کر رہتا ہے۔ اور قدرتِ الٰہیہ اس کی طبعی ترقی کے ساتھ عقلی اور اخلاقی بلندی کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔ یعنی اس میں انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے ساتھ اصلح سلاطین اور حکام بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یا حکماء اور شعراء کے ساتھ عدالت شعار بادشاہ اور بلند ہمت سپاہی برسر کار آتے ہیں۔ اس طرح وہ بڑی قوم ترقی کے تمام مدارج طے کرتی ہے۔ اپنی حکومت کا نظام بناتی ہے' جس سے ظلم کی بیخ کنی ہو۔ شہر بساتی ہے' علم و ہنر پھیلاتی ہے' جس سے رفاہیت عامہ کا سامان بہم

پہنچتا ہے۔ اس کی ہمسایہ قومیں اس کی رفاقت اور سرپرستی میں اپنی فلاح سمجھتی ہیں، اگر اس کی اجتماعی تاریخ کو انسانیت کے عام پسند عقلی افکار و اخلاق پر مرتب کیا جائے تو اسے ''حکمت الادیان'' یا ''فلسفہ تاریخ'' کہا جائے گا۔

(ہند میں مسلم تاریخ)

(ب) ہم ہند کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ مسیحی تاریخ کے دوسرے ہزار سے شروع کرتے ہیں۔ ۱۰۰۱ء میں سلطان محمود غزنوی نے ہند کا مشہور قلعہ ''ہنڈ'' فتح کیا۔ اور لاہور کے ہندو راجہ کے نومسلم نواسہ کو اس کا حاکم بنایا۔ جس طرح امیر المومنین فاروق اعظمؓ نے مدائن فتح کر کے حضرت سلمانؓ فارسی کو اس کا پہلا حاکم بنایا تھا۔

(ج) ''ہنڈ'' دریائے سندھ کے مغربی کنارہ پر اٹک کے قریب واقع ہے۔ اس سر زمین کے عام باشندے پشتو بولتے ہیں۔ پشتان یا پٹھان ''ہندوکش'' سے بحر عرب تک ہند کے شمال مغربی پہاڑوں اور میدانوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کابل، غزنی، قندھار، پشاور، کوئٹہ اس کے مشہور شہر ہیں۔ چونکہ علمی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ پشتو بھی کشمیری، پنجابی، سندھی کی طرح ''سنسکرت'' کی شاخ ہے۔ اس لیے ہم اس قوم کو ہندوستانی اقوام میں شمار کرتے ہیں۔ اس قوم نے دوآبہ گنگ و جمن میں ایک وسیع خطہ (روہیل کھنڈ) کو اپنا وطن بنایا ہے۔

(۲)

سلطان محمود غزنوی سے شروع کر کے امیر تیمور کے حملہ تک ہم ہندوستانی تاریخ کا پہلا دور مانتے ہیں۔ اور امیر تیمور سے بہادر شاہ تک دوسرا دور۔ دوسرے دور میں عالمگیر کے بعد تنزل شروع ہوا۔ عموماً تنزل شروع ہونے کے بعد ہی قوموں کا فلسفہ معین ہوتا ہے۔

ہمارے امام الائمہ بھی اسی عہد کے امام الانقلاب ہیں۔

(الف) کسی عقلی یا مذہبی تحریک کو کسی خطہ زمین کی طرف منسوب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مرکز اس سرزمین میں ہو۔ اس لیے ہند کے اسلامی دور میں ہم مسلمانان ہند کی کسی تحریک کو اس وقت تک ہندوستانیت سے موصوف نہیں بنا سکتے جب تک اس کا مرکز ہند میں پیدا نہ ہو چکا ہو۔

(ب) امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں کابل فتح ہوا۔ اور ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں سندھ فتح ہوا، مگر اسے ہم خلافت عربیہ کا ایک حصہ مانتے ہیں۔ یہاں ہندوستانیت کا ذکر نہیں ہو سکتا۔

(ج) سلطان محمود غزنوی نے اسلام کے لیے ہندوستانی مرکز کی بنیاد قائم کر دی وہ ''انہلواڑہ'' میں مرکز حکومت منتقل کرنا چاہتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین نے سقوط بغداد سے تھوڑا عرصہ پہلے دہلی کے حکمران کو سلطانی اختیارات استعمال کرنے کی اجازت دی۔ گویا خلافت اسلامیہ کے اندر ہندوستانی مسلمانوں کا اپنا مرکز بن گیا۔ اس دور کے اخیر تک سلاطین دہلی اسلامی خلافت سے کم و بیش تعلق رکھتے رہے ہیں۔

(۳)

امیر تیمور کے حملہ کے بعد ہندوستانی مرکز بیرونی تعلق سے آزاد ہو گیا۔ سکندر لودھی نے غالباً پہلی مستقل حکومت بنائی۔ اس نے آگرہ بسایا، ہندوؤں کو فارسی پڑھا کر دفتروں کے کام میں دخیل بنایا۔ اس کے بعد شیر شاہ نے مالی انتظام ہندوؤں کے سپرد کیا، جسے اکبر نے درجہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ ہم جلال الدین اکبر کو ہندوستانیت کا موسس نہیں مانتے۔

(الف) اکبر مذہبی عالم نہیں تھا۔ علماء اس کے ساتھ اخیر تک مشیر رہے۔ ان کی رہنمائی سے اگر اس نے غلطیاں کی ہیں تو ''اثم علی من افتاہ'' (ترجمہ: اس کا گناہ اُن پر ہے! جنہوں نے فتویٰ دیا) ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اگر اکبر نہ ہوتا تو عالم گیر جیسا مسلمان بادشاہ ہند کو نصیب نہ ہوتا' جس کی نظیر دنیا کے شاہی نظام میں نہیں ملتی ہم عالمگیر کی ہی برکت مانتے ہیں کہ امام ولی اللہ جیسا حکیم ہند میں پیدا ہوا۔

(ب) امام ربانی شیخ احمد سرہندی اکبری دربار کی اصلاح کرتے رہے۔ اس میں وہ پورے کامیاب ہوئے۔ آخر میں ''جہاں گیر'' ان کا اتباع کرنے لگا' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ جہاں امام ربانی کے پسندیدہ طریقہ پر حکومت چلاتا رہا' اس کے ہوتے ہوئے ہم جانتے ہیں کہ شاہ جہاں کا دربار انسانیت عامہ کو اسلام کا مرکز نہیں بنا سکا۔

(ج) ہمارا دعویٰ ہے کہ امام ولی اللہ شاہ جہانی سلطنت سے بہترین نظام کی دعوت دیتے ہیں۔ گویا جس کام کی ابتدا امام ربانی سے ہوئی اس کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے امام ولی اللہ کی معرفت سے کرائی اس طرح ہم امام ولی اللہ کو خاتم الحکمائ مانتے ہیں۔

(۴)

امام ولی اللہ نے اپنے مختلف الہامات کا ذکر کیا ہے۔ ہم ان میں سے ایک حصہ کو خاص ترتیب سے لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(الف) امام ولی اللہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا نے ہمیں ایسی تحریک کا امام بنایا ہے جس کا عنوان ہے'' فک کل نظام'' (فیوض الحرمین) کیا یہ انقلاب نہیں ہے۔

(ب) امام ولی اللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ ''اگر ہماری تحریک فوراً کامیاب ہو جاتی تو امام (مہدی) کا خروج اور مسیح کا نزول متاخر ہو جاتا مگر وہ آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھائے گی۔'' (تفہیمات)

کیا یہ انقلابی پروگرام اس بڑے انقلاب کا قائم مقام نہیں ہے۔ جس کے لیے مسلمانوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ بھی صدیوں سے انتظار کر رہے ہیں۔

(ج) امام ولی اللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ "ہماری اولاد کے پہلے طبقہ میں علم حدیث پھیلے گا اور دوسرے طبقہ میں علم و حکمت کی اشاعت ہوگی" (تفہیمات)

کیا امام عبدالعزیز سے حدیث کا شیوع نہیں ہوا۔ کیا مولانا رفیع الدین کی تکمیل الاذہان اور مولانا محمد اسماعیل شہید کی عبقات نے حکمت کا نیا اسکول نہیں قائم کر دیا۔

(د) امام ولی اللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ "ہماری بیٹیوں کے اولاد سے افراد پیدا ہوں گے جو ہمارے بیٹوں کے بعد ہمارا کام مکّہ معظّمہ میں بیٹھ کر کریں گے" (قول جلی بحوالہ اتحاف النبلا)

کیا الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق اور الصدر الشہید مولانا محمد یعقوب اس کا مصداق پیدا نہیں ہوئے۔

(۵)

امام ولی اللہ نے فیوض الحرمین میں خلافت کی دو قسمیں بتائیں۔ خلافت ظاہرہ۔ خلافت باطنہ۔

(الف) خلافت باطنہ میں امام ولی اللہ حکومت کا وہ درجہ شامل مانتے ہیں جو تعلیم اور دعوت کے زور سے پیدا ہوتی ہے۔ امام ولی اللہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس قسم کی حکومت اسلام نے قرآن عظیم کی دعوت کی تنظیم سے مکہ معظّمہ میں پیدا کر لی تھی۔ اس کا ذکر فتح الرحمٰن میں سورہ رعد کے آخر میں اور فیوض الحرمین میں موجود ہے۔

(ب) امام ولی اللہ خلافت ظاہرہ کے لیے محاربہ ضروری قرار دیتے ہیں ملک کا خراج بزور وصول کر کے مستحقین کو پہنچانا' مصارف عامہ میں خرچ کرنا اور عدالت کا

نظام بزور قائم کر کے مظلومین کی حمایت کرنا' اس کے اہم اجزاء ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ خلافت اسلام کے مدنی دور میں پیدا ہوئی۔

(ج) قول الجمیل اور فیوض الحرمین بار بار پڑھنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔ امام ولی اللہ اپنے خاندان میں تصوف کا سلسلہ اس لیے قائم کرتے ہیں۔ کہ وہ خلافت باطنہ کے قیام کا وسیلہ بن جائے۔ مولانا شہیدؒ جب امیر شہید کی فوجی طاقت کا ان کے محاربین سے مقابلہ کرتے ہیں تو امیر شہید کے مبایعین کو سپاہی کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ اسی اصطلاح پر منطبق ہوسکتا ہے۔

(د) ہم نے یورپین انقلابی پارٹیوں کے نظام کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ اس سے ہمارے دماغ میں سیاسی پروگرام بنانے اور سمجھنے کا ملکہ پیدا ہوگیا ہے۔ ہم اگر امام ولی اللہ کی خلافت باطنہ کے فکر کو آج کے سیاست دانوں کے سامنے پیش کریں گے تو اسے انقلابی پارٹی کا نام دیں گے۔ جو عدم تشدد (نان وائیلنس) کی پابند ہو۔

(۶)

امام ولی اللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ خدا نے انہیں یوسف علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے کے لیے مفطور (پیدا) کیا ہے۔

(الف) یعنی وہ امتِ محمدیہ میں وہی کام کریں گے۔ جو یوسفؑ ملّتِ اسرائیلیہ میں کر چکے ہیں۔

(ب) ہم جانتے ہیں کہ یوسفؑ نے ایک غیر اسرائیلی بادشاہ سے اختیارات حاصل کر کے اولادِ یعقوب کی حکومت کا اساس قائم کر دیا تھا۔ اسی یوسفی حکومت کی ایک برکت ہے کہ وہ بنی اسرائیل کو اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے تیار کر گئے۔

(ج) ہمارا خیال ہے کہ امام ولی اللہ اپنے زمانہ میں دلی کے بادشاہوں کو کسریٰ اور قیصر کا نمونہ جانتے تھے۔ اس لیے ان کے سارے نظام کو بدلنا اپنا نصب العین بتاتے

رہے۔ مگر عملی پروگرام فقط داخلی انقلاب سے شروع کیا تھا۔ وہ امرائے سلطنت میں اپنا فکر پھیلا کر نظامِ سلطنت درست کرنا چاہتے تھے۔

(د) نجیب آباد کا مدرسہ اسی لیے حکمت امام ولی اللہ کی درس گاہ بن گیا تھا۔ مرہٹوں کی شورش کو وہ احمد شاہ کے ذریعے سے ختم کرا دیتے ہیں۔

جن حضرات نے ہماری طرح امام ولی اللہ کی تحریک کا مطالعہ نہیں کیا' جب وہ دیکھتے ہیں کہ امام ولی اللہ سلطانی اختیارات میں تبدیلی کی کوئی کوشش نہیں کرتے تو انہیں امام الانقلاب ماننے میں تامل کرتے ہیں۔

(۷)

امام ولی اللہ ''خیر القرون'' کو شہادت عثمانؓ تک (جو مبعث سے ۴۸ سال بعد واقع ہوئی) محدود کر دیتے ہیں (ازالۃ الخفاء)

(الف) اسی زمانہ کو وہ **ھو الذی ارسل رسوله بالھدیٰ و دین الحق لیظھره علی الدین کُلِّهٖ** کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ ''ازالۃ الخفاء'' کے ابتدائی مباحث میں اس آیت کی تفسیر پورے غور سے پڑھنی چاہیئے۔ امام ولی اللہ کی حکمت کا یہ مرکزی مسئلہ ہے۔

(ب) امام ولی اللہ اس دور کے علمی و عملی کارنامے مسلمانوں کے مشورہ اور اتفاق سے جاری مانتے ہیں (یہ فکر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابوں میں بھی ملتا ہے)۔ اسی زمانہ کو وہ نزول قرآن کے مقاصد کا نمونہ مانتے ہیں۔

(ج) امام ولی اللہ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں اس دور کو انسان کی نیچرل ترقی کا آخری درجہ ثابت کرتے ہیں۔ ''باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان'' کو غور سے پڑھنا چاہیئے۔

(د) ہمارا خیال ہے کہ اس دور کی علمی و عملی تاریخ جس قدر امام ولی اللہ نے ضبط کر دی ہے وہ ہمیں کسی مصنف کی کتاب میں نہیں ملتی اسی لیے ہم امام ولی اللہ کی کتابیں

''بیت الحکمۃ'' میں پڑھانا چاہتے ہیں۔

(ھ) ہم سمجھتے ہیں کہ امام ولی اللہ قرآن عظیم کی اس علمی اور عملی تعلیم کو انسانیت عامہ کے لئے انٹرنیشنل انقلابی پروگرام مانتے ہیں۔ اس لیے ہم اس دور میں انھیں اپنا امام مانتے ہیں۔

(و) ''اگر کیپٹل'' کے مصنفین کو انقلاب کا باپ مانا جاتا ہے تو جس حکیم نے خیر القرون کی انقلابی تاریخ کو ہند کی علمی زبان میں عام عقلی اصول کے مطابق بنا کر ضبط کر دیا ہے اسے امام الانقلاب ماننا خوش اعتقادی پر مبنی نہیں سمجھا جائے گا۔ جب کہ اس نے یوسفؑ کی طرح انقلاب کا راستہ بھی صاف کر دیا ہو۔ (خطبہ محمودیہ)۔

ہمارا خیال ہے کہ اس مضمون کو واضح کرنے کے لیے خطبہ محمودیہ یہاں پر نقل کر دینا مفید ہوگا۔

یہی وہ رسالہ ہے جسے ہم نے بیماری کے وقفوں میں مرتب کیا۔

زماننا هذا زمان انتقال من دورالی دور فقد انقضٰی دور الملوكية التی اسسهاالسلاطين من عصر السلطان محمود الغزنوی والسلطان محمد الغوری الیٰ زمان السلطان شاه جهان والسلطان عالمگير انارالله برهانهم.

وقد عرف من تعمق فی مطالعة فلسفة التاريخ ان طائفة من العلماء والامراء كانواقد تهيوا لقبول نوع من نظام الجمهورية الانقلابية بقيادة ٹيپو سلطان قبل سقوط الدولة الهندية لكن غباوة عامة المكتسبين و دِعاية الرأسماليين المتغلبين نومت عوام بلادنافلم يتكامل الانتباه الا بعد سقوط الدولة العثمانية.

كذلك يعرف من تامل فی تاريخ البشر ان نظرية الجمهورية انماارتقت بالتدريج الطبعی فی بلاد اوروبا وما حولها فكل ملة تنبهت من

المشرقيين مثل روسيا' جاپان ثم تركيا وايران ولم يكن له بُدٌّ من تقليد اوروبافي النظام العسكرى والصناعي والا دارى البارلمانىفنحن اذا اردنا تنظيم نهضة ملة هندية لانقدرعلىٰ مخالفة اوروبا ومن تبعهم كلهم.

وبعد ذلك قد عرض لنا فى زماننا عارض ادهش افكارنا هوان دُعاة الجمهورية من الاوروباويين عامتهم ينفون الدين رأسا فبقينا فى حيرةٍ لان التاخرعن الانقلاب ينتج الذلة والهوان والتقدم علىٰ نهجهم يفضى الى هدم الدين.

لقد كابدنا مشقة شديدة فى مطالعة تاريخ من تقدم علينا فبعد ذلك حصل لناالیقین باننا الخروج من تلك الحالة الحائرة الموصلة الىٰ ياس. اوالقعود فى حاجة شديدة الىٰ تعيين امام من ائمة الدين يهدى الى الرشد نقتدى به فى اطوارِ الانقلاب التى طرأعلينا وحصل لنا اليقين بانه لا يصلح لهذا المنصب الجليل اِلّامَنْ يكون عارفاً كاملاً فى معرفة الالٰهية اماماً محققا فى العلوم الشرعية ماهرًا فى الحكمة العملية ويكون مع ذلك مَن نشاء فى بلاد نا فى العصر الا ضطرابِ الماضى ليتكامل رسوخه فى معرفة الامراض اجتماعيتنا العامة والخاصة.

فنحمد ربنا الرحمن حمدًا كثيرا اِذْ هدانا الىٰ امام ترنم المشهور فى الورى

"ومن الرديف وقدركبتُ غضنفراً"

وهو امام ائمتنا الذين اخذنا عنهم علوم الدين ومعارف عامةً و تاريخ الاجتماعية الهندية خاصةً ومشائخنا منذ مائتى سنة تجربوا على نظريات ذلك الامام و عملياته وما انخرمت سلسلة اجتهادهم وجهادهم

کابرًا عن کا بر رضی اللہ عنہم ۔

(ترجمہ: ہمارا زمانہ ایک دوَر سے دوسرے دوَر کی جانب منتقل ہونے کا زمانہ ہے' بے شک ملوکیت کا وہ دور ختم ہو چکا' جس کی بنیاد ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی' اور سلطان محمد غوری نے رکھی تھی اور جو سلطان شاہ جہان اور سلطان عالمگیرؒ کے زمانہ تک جاری رہا تھا۔

جس فرد نے فلسفہء تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے' وہ جانتا ہے کہ ہندوستانی حکومت کے زوال سے ذرا پہلے علماء اور امراء کی ایک جماعت نے سلطان ٹیپو کی قیادت میں ایک قسم کا جمہوری انقلابی نظام قبول کر لیا تھا لیکن عام محنت کشوں کی بے توجہی اور غالب سرمایہ داروں کی سازشوں نے ہمارے ملک کے عوام کو نشہ کی نیند سُلائے رکھا وہ اس وقت جاگے جبکہ خلافتِ عثمانیہ کا سقوط ہوا۔

ایسے ہی وہ آدمی جس نے انسانی تاریخ پر غور وفکر کیا ہے' جانتا ہے کہ نظریہء جمہوریت نے یورپ اور اسکے گردونواح کے ممالک میں فطری تدریج کے ساتھ ترقی کی ہے۔ مشرقی ممالک میں سے وہ تمام قومیں جنہوں نے اس دور میں ترقی کی ہے جیسے روس' جاپان' پھر ترکی اور ایران' ان کیلئے اسکے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا کہ عسکری' صنعتی اور پارلیمانی اداروں کی تشکیل میں یورپ کی تقلید کی جائے۔

لیکن یورپ کی اس طرح کی تقلید کر لینے کے بعد ہمارے زمانہ میں ایک خوفناک حقیقت اُبھر کر آئی ہے۔ جس نے ہمارے افکار کو دہشت زدہ کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جمہوریت کی دعوت دینے والے یورپین عام طور پر دین ومذہب کی قطعی نفی کرتے ہیں' اس مرحلہ پر ہم حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم جمہوری انقلاب سے پیچھے رہتے ہیں تو ذلت و رسوائی ہمارا مقدر بنتی ہے۔ اور اگر یورپین طریقہء فکر پر آگے بڑھتے ہیں اور خالص یورپین فکر پر مغربی جمہوریت کو اپناتے ہیں تو وہ ہمارے دین کو مٹانے کا باعث بنتا ہے۔

چنانچہ ہم نے گذشتہ قوموں کی تاریخ میں انتہائی شدید محنت و مشقت برداشت کی۔ اور

گہرائی میں جا کر قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کیا (کہ اگر ان پر ایسے پیچیدہ حالات آئے تو وہ ان کے تجزیاتی مطالعہ میں سے کیسے نکلی اور انہوں نے کیا راستہ اپنایا) اس گہرے مطالعہ کے بعد ہمیں پختہ یقین ہو گیا کہ اس مایوسی اور تھک ہار کر بیٹھ جانے والی حیران کن حالت سے نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ائمہ دین میں سے ایک ایسے امام کو رہنماء بنالیا جائے۔ جو اس انقلاب کے ارتقائی مراحل میں ہماری رہنمائی کرے۔

اور ہمیں یہ بھی پختہ یقین ہو گیا کہ اس منصبِ جلیل کی صلاحیت صرف وہ فرد رکھتا ہے جو معرفت الٰہی میں عارف کامل ہو۔ علوم شرعیہ میں محقق امام ہو' اور سماجی زندگی کی تشکیل میں حکمت عملی کا ماہر ہو' اور اسی کے ساتھ وہ ایسا فرد ہو' جس نے گذشتہ زوال کے دور میں ہماری دھرتی سے ہی نشو ونما پائی ہو تا کہ ہمارے عمومی وخصوصی اجتماعی امراض کی پہچان میں اسے خصوصی مہارت اور رسوخ حاصل ہو۔

پس ہم اپنے انتہائی مہربان رب کی حمد وثناء بیان کرتے ہیں کہ جس نے ہمیں ایسے امام کی جانب راہنمائی کی جن کے بارے میں مخلوقِ خدا میں شہرت کی یہ ضرب المثل بڑے ترنم سے بیان کی جاتی ہے کہ ''ومن الردیف وقدر کبت غضنفراً ترجمہ: جب میں شیر پر سوار ہوں' تو کون ایسا ہے کہ میرے پیچھے بیٹھے؟'' یعنی خطرناک اور مشکل حالات میں سے راستہ بنانے والے کے پیچھے کون جائے گا؟ (یہ ضرب المثل غیر معمولی صلاحیتوں اور پیچیدہ اور مشکل حالات میں بلند قوتِ ارادی کے حامل اور مشکلات میں سے راستہ بنانے والے افراد کے لئے بولی جاتی ہے۔ خود شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اپنے لئے یہی ضرب المثل استعمال کی ہے مولانا سندھیؒ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے.........آزاد)

اور وہ رہنما ایسا ہے کہ جو ہمارے ان ائمہ کا بھی امام ہے' جس سے ہم نے دینی علوم' عمومی معلومات' اور ہندوستان کی خاص اجتماعی تاریخ' کا علم حاصل کیا ہے۔ اور ہمارے مشائخ گذشتہ دوسو سال سے اس امام کے نظریات اور ان کے عملی کاموں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ اور ان کے

جہاد اور اجتہاد کا سلسلہ ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک تسلسل کے ساتھ جاری رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات سے راضی ہو جائے۔.................آمین۔

(۸)

امام ولی اللہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہند کے مسلمانوں سے اپنی حکومت قائم کرنے کی طاقت اس وقت افاغنہ کی طرف منتقل ہو چکی ہے (خیر کثیر)۔

ہم جانتے ہیں کہ افاغنہ بھی ہندوستانی اقوام میں سے ایک قوم ہے۔ جس میں ایرانی، ترکی، اسرائیلی، عربی قبائل مخلوط ہو چکے ہیں۔

(الف) ہمارا خیال ہے کہ اسی غرض سے امام عبد العزیز اپنی انقلابی پارٹی کو افغانوں سے ملانا ضروری کہتے ہیں۔ امام عبد العزیز کے آخری کاموں کا مرکز الامیر الشہید اور مولانا عبد الحئی اور مولانا محمد اسماعیل کا اجتماع تھا۔ ان کے لیے افغانستان کی ہجرت کا فیصلہ امام عبد العزیز نے کیا تھا۔ اگرچہ عمل ان کی وفات کے بعد شروع ہوا۔

(ب) ہمیں معلوم ہے کہ مولانا محمد قاسم کو رسول اللہ ﷺ سے روحانی طور پر معلوم ہوا تھا کہ افغانوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

(ج) مدرسہ دیو بند اور اس کے متخرجین میں مولانا شیخ الہند کا مقام مخفی نہیں۔ وہ تخمیناً چالیس برس مدرسہ چلاتے رہے ہیں۔ ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ دیو بند نے جس قدر طالب علم یو۔پی میں پیدا کیے، اس کے بعد اس نے اپنے طالب علم سب سے زیادہ افغانستان اور اس کے دونوں طرف یاغستان اور ترکستان میں پھیلائے ہیں۔

(د) مولانا شیخ الہند کی خاص تربیت کا نتیجہ تھا کہ ہم کابل میں سات سال حکومت کا اعتماد حاصل کر کے رہ سکے۔ ہمارا خیال ہے کہ جمعیۃ الانصار اور نظارۃ المعارف میں اگر ہم کام نہ کر چکے ہوتے تو ہمارا کابل جانا محض بے کار ہوتا۔ عجب معاملہ

ہے۔حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے ہمیں بغیر پروگرام جانا پڑتا ہے۔ پھر حکومت افغانی کے توسط سے ہمیں ہدایات مل جاتی ہیں۔ہم باہر جا کر سمجھ سکے ہیں کہ امام عبدالعزیز سے مولانا شیخ الہند تک ہمارے تمام اکابر ایک سلسلہ میں کام کرتے رہے ہیں۔

سراج الہند امام عبدالعزیز دہلویؒ

(تسلسل فکر)

امام عبدالعزیزؒ ''بستان المحدثین'' میں مؤطا تذکرہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

حضرت شیخنا وقدوتنا فی کل العلوم والامور شیخ ولی اللہ قدس سرہ، گویا وہ اپنے تمام علمی، اجتماعی اور سیاسی امور میں اپنے والد ماجد کے مقتدی ہیں۔

(ان کے کام کے بنیادی نکات)

(۱)

جو انقلاب امام ولی اللہ اپنے زمانہ میں خواص سے مکمل کرانا چاہتے تھے، وہ اگر نہیں ہوسکا۔تو اسی مقصد کو امام عبدالعزیز اپنے حالات زمانہ کے مطابق عوام سے پورا کرانا چاہتے ہیں۔نصب العین میں کوئی فرق نہیں آیا۔

(۲)

امام ولی اللہ کا شروع زمانہ میں یہ خیال صحیح تھا کہ دہلی کی سلطانی حکومت کو تسلیم کر کے امراء کے ذریعہ سے خیر القرون کے نمونہ کا پروگرام جاری کیا جائے۔مگر امام عبدالعزیز کے زمانہ میں سلطانی حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ داخلی خارجی سارے نظام بدلنے کے سوا

کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے ہند کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔

(الف) اس کامل انقلاب کے لیے عوام مسلمانوں کو تیار کرنا امام عبدالعزیز کا خاص کارنامہ ہے۔ عوام کو سیدھا (براہِ راست) مخاطب کرنا شروع کیا۔ ہندوستانی زبان میں علوم دینی کا ترجمہ امام عبدالعزیز کے اصحاب کا کام ہے۔

(ب) امام ولی اللہ نے جس قدر تصانیف لکھی تھیں۔ وہ فقط اعلیٰ طبقہ کے کام آتی ہیں۔ ان کے مخاطب یا امراء ہیں یا اعلیٰ درجہ کے اہل علم یا کامل المعرفت صوفیائے کرام۔ مگر امام عبدالعزیز کشف وعقل کی عام فہم چیزیں نقلی علوم کی تفسیر میں استعمال کرتے ہیں۔ گویا اپنے والد کے علوم کو عوام کی زبان میں لکھتے ہیں۔ تفسیر ''فتح العزیز'' کو ''فتح الرحمٰن'' سے اور ''تحفہ اثنا عشریہ'' کو ''ازالۃ الخفاء'' سے ملا کر پڑھیے۔

(ج) ہمارا خیال ہے کہ الصدر الشہید مولانا محمد اسماعیل، الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق الصدر العمید مولانا محمد یعقوب بلکہ امام اہل العقل مولانا رفیع الدین اور امام اہل النقل مولانا عبدالقادر سے اگر کوئی اجتماعی کام بن پڑا ہے تو اسے امام عبدالعزیز کے نامہ اعمال میں لکھنا چاہیئے۔

(د) الامیر الشہید کے مبایعین سب کے سب ان سے بیعت کرتے ہیں تو امام عبدالعزیز کے طریقہ میں بیعت کرتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ امام عبدالعزیز کے لیے یہی ایک کمال کفایت کرتا ہے کہ ان کی تربیت سے ہندوستانی مسلمانوں میں سے عوام بھی اپنی سلطنت سنبھالنے کے قابل ہو گئے۔

الصدر الشہید مولانا محمد اسماعیل الدہلوی روح الانقلاب

(تسلسل فکر)

مولانا شہید فرماتے تھے کہ "میرا اس سے زیادہ کوئی کمال نہیں کہ میں اپنے دادا کی بات سمجھ کر اسے اپنے موقعہ پر بٹھا دیتا ہوں۔"

(ان کے کام کے بنیادی نکات)

(۱)

(الف) 'عبقات' کے پہلے اشارہ میں شیخ اکبر اور امام ربانی کے مسالک وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا فرق واضح کر کے ہر ایک فکر کے فوائد ضبط کرنے کے بعد امام ولی اللہ کو دونوں بزرگوں سے بلند ثابت کیا ہے۔

(ب) 'صراط مستقیم' میں الامیر الشہید کے مکشوفات اور ملفوظات لکھتے ہیں۔ مگر امام ولی اللہ کی اصطلاحات سے تطبیق دینے کے بعد گویا وہ ہر ایک امام کو امام ولی اللہ کی میزان پر تولنے کے بعد قبول کرتے ہیں۔

(۲)

(الف) امام ولی اللہ نے خیر القرون کے علوم تحریر کیے ہیں اور خواص کو پڑھایا۔ اس کے بعد امام عبدالعزیز نے خواص کو تعلیم دے کر انھیں عوام کی تعلیم کا واسطہ بنایا۔ الصدر الشہید نے ہند کی مرکزی سوسائٹی (دہلی) کو ان علوم سے رنگین بنایا۔

(ب) ہمارا خیال ہے کہ اگر الصدر الشہید کے ساتھیوں کی خدمات مقبول نہ ہوتیں تو امام ولی اللہ کے علوم پر دو سو برس بعد آج بحث کرنا ناممکن ہو جاتا۔ اسی انقلابی روح

نے ان علوم کو زندہ کر دیا ہے۔

(۳)

ہمارا خیال ہے کہ الصدر الشہید کو اگر خلافتِ کبریٰ سونپی جاتی تو اسے فاروق اعظمؓ کی طرح چلاتے۔ امیر شہید نے انھیں خدمت خلق پر اپنے اسوۂ حسنہ سے لگایا تو وہ گھوڑوں کے لیے گھاس کھودتے تھے۔

(۴)

ان کی کتاب تقویۃ الایمان میرے اہتدا بالاسلام کا واسطہ بنی ہے۔ اس لئے وہ میرے مرشد اور امام ہیں۔

امام محمد اسحاق الدہلوی الصدر الحمید نائب الامیر الشہید

(تسلسل فکر)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے ہیں'' مولانا محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکہؒ تمام ہندوستان کے علماء و محدثین کے استاد و استاد زادہ نواسہ و شاگرد و خلیفہ مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ کے ہیں۔'' (فتاویٰ رشیدیہ)

(ان کے کام کے بنیادی نکات)

(۱)

(الف) ایک انقلابی تحریک میں پہلا درجہ سوسائٹی میں انقلاب کیلئے عقلی نظام (فلسفہ) سوچنا ہے۔ اس درجہ کو ہم امام ولی اللہ میں منحصر مانتے ہیں۔

(ب) اس کے بعد دوسرا درجہ اس کے پراپیگنڈے کا ہے۔ پراپیگنڈہ کی کامیابی پر پارٹی کا نظام بنتا ہے۔ جو اپنے ممبروں پر حکومت کرتا ہے۔ (یعنی خلافت باطنہ) اس درجہ کو ہم امام عبدالعزیز کا کمال مانتے ہیں۔

(ج) اس کے بعد تیسرا درجہ دوسری پارٹیوں سے مقابلہ کر کے ان کے مقبوضات فتح کرنا ہے۔ اس سے انقلابی حکومت (خلافت ظاہرہ) پیدا ہوتی ہے۔ ہم امام ولی اللہ کی تحریک میں یہ درجہ امیر شہید اور ان کے رفقاء میں محدود کر دیتے ہیں۔

(۲)

پارٹی کا نظام مستقل ہوتا ہے حکومت کبھی بنتی ہے اور کبھی ٹوٹتی ہے۔ پارٹی کا وجود اس وقت تک سالم مانا جاتا ہے۔ جب تک اس کی اساسی مصلحت قائم کرنے والی جماعت فنا نہیں ہوتی۔

(الف) اس فرق کو واضح کرنے کے لیے ہم نے امیر اور امام کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہم امام عبدالعزیزؒ کے بعد پارٹی کے نظام کا محافظ امام محمد اسحاق کو مانتے ہیں۔ اور حکومت کے امیر امیر المومنین السیّد احمد الشہید ہیں۔ اس معاملہ میں امام محمد اسحاق ان کے ایک نائب ہیں۔

(ب) یورپ کی سیاسی پارٹیوں میں نظام کا محافظ ایک بورڈ ہوتا ہے۔ اسے ڈسپلن یا انضباط کا نام دیا جاتا ہے۔ اس بورڈ کا حکم پارٹی کے سب ممبروں پر نافذ ہوتا ہے۔ اور حکومت چلانا وزراء کا کام ہے۔ اسی انداز پر ہم نے بالا کوٹ میں حکومت کا خاتمہ ایک حد تک مان لیا ہے مگر ہم پارٹی کے نظام کو دہلی میں محفوظ مانتے ہیں۔

(ج) امام محمد اسحاق نے مکہ معظّمہ ہجرت کر لی۔ بظاہر وہ اپنے کام سے معطل ہو گئے۔ مگر ایسا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر وہ مکہ معظّمہ میں ہندوستانی کام جاری نہ رکھتے تو "کمپنی بہادر" ان کی جاگیر کیوں ضبط کرتی اور بمبئی سے ایسے ہندوستانی کیوں بھیجے جاتے جو انھیں "وہابی" ثابت کر کے حجاز سے نکلوانا چاہتے تھے مگر قدرتی اتفاقات سے وہ بچ گئے۔ اس زمانے کا شیخ الحرم ایک ہندوستانی مہاجر کا بیٹا تھا۔ اور یہ خاندان شاہ عبدالعزیزؒ کا شاگرد اور مرید ہے۔ اس لیے شیخ الحرم کے توسط سے ترکی حکومت نے اپنے گھر میں ایک طرح نظر بند کر دیا۔ وہ مسجد حرام میں نماز پڑھتے تھے مگر کسی کو پڑھا نہیں سکتے تھے۔ اس قسم کی زندگی ہم کابل میں گزار چکے ہیں۔ اس لیے ہم مکہ معظّمہ میں ان کے ملنے والوں سے بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

(۳)

الامیر امداد اللہ جو دیو بندی جماعت کے امام ہیں۔ امام محمد اسحاق کے خواص اصحاب میں سے تھے۔ اس سے پارٹی کے نظام کا تسلسل ہم مولانا شیخ الہندؒ تک ثابت کر سکتے ہیں۔

الصدر العمید مولانا محمد یعقوب الدہلوی

(تسلسلِ فکر)

وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ان کے معاون بن کر کام کرتے رہے ہیں۔ امام محمد اسحاق کی وفات پر وہی امام عبدالعزیزؒ کی امانت کے محافظ رہے ہیں۔

(ان کے کام کے بنیادی نکات)

(۱)

مولانا مظفر حسین انؒ کے خلیفہ تھے جو مولانا محمد قاسم اور سرسید دونوں کے مشترک تسلیم شدہ بزرگ ہیں۔

(الف) نواب صدیق حسن خاں نے روایت حدیث کی اجازت مولانا محمد یعقوب سے حاصل کی ہے۔

(ب) الامیر امداد اللہ نے مولانا محمد قاسم کو صلوٰۃ کا احسانی طریقہ مولانا محمد یعقوب سے تلقین کرایا۔

(۲)

ان کی وفات سے پہلے مدرسہ دیو بند کے بانی ان کی امانت سنبھالنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ یاد رہے کہ مولانا مظفر حسین نے ہی مولانا محمد قاسم کو منبرِ وعظ پر بٹھلایا تھا۔

باب ثانی

امام ولی اللہ کے اَتباع

امام ولی اللہ کی تحریک کا مستقل مرکز ان کے اتباع کے ہاتھ میں رہا ہے۔اس سلسلہ میں ایک محدود وقت تک ان کی اولاد بھی مرکزیت کی مالک رہی ہے لیکن ان سے اول اور آخر اتباع ہی برسرکار رہے ہیں۔امام ولی اللہ کی زندگی میں ان کے سب سے بڑے معاون مولانا محمد امین کشمیری اور مولانا محمد عاشق پھلتی تھے۔ان کی اولاد میں امام عبدالعزیز سب سے بڑے ہیں اور سب کے استاد۔امام ولی اللہ کی وفات کے وقت وہ بھی اپنی طالب علمی پوری نہیں کر سکے تھے۔امام عبدالعزیز نے امام ولی اللہ کے انہی خلفاء سے اپنی علمی تکمیل کر لی تھی۔

امام عبدالعزیز کے بعد تحریک کا مرکز اگرچہ پھر اتباع میں منتقل ہو گیا۔مگر اولاد کا دوسرا طبقہ بھی حصہ دار رہا ہے۔اس طبقہ کے بعد تحریک کی مرکزیت اتباع کے مختلف احزاب میں تقسیم ہو گئی ہے۔

الامیر الشہید السید احمد قدس سرہٗ

(تسلسل فکر)

امام عبدالعزیز کے بعد اتباع کا جو طبقہ تحریک کے مرکز کا مالک بنا ہے' ان کے امام

امیر شہید ہیں۔ ان کی قوتِ کشفیہ نے عوام میں انقلابی لہر پیدا کردی۔ امام عبدالعزیز کے تیار کردہ علماء کو اور عوام کو ایک پروگرام کا پابند بنانا امیر شہید کا کمال ہے۔ خدمتِ خلق اور اتباع سنت کے فطری اوصاف نے انھیں امامت اور امارت کے اعلیٰ رتبہ پر پہنچا دیا تھا۔

(ان کے کام کے بنیادی نکات)

(۱)

امیر شہید کے ذاتی اوصاف اور کمالات میں، ہم انھیں امام معصوم مان سکتے ہیں۔ ہماری تفتیش میں کئی صدیوں سے ان کی نظیر نظر نہیں آتی۔

(الف) ہم امام ولی اللہؒ کے علوم میں نقل، عقل، کشف کے تطابق کو مابہ الامتیاز مانتے ہیں۔ ان سے متقدم شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے علوم میں عقل اور نقل کا تطابق پایا جاتا ہے۔ کشف سے وہ تعرض نہیں کرتے۔

(ب) امام ولی اللہؒ کے بعد اس درجہ کا کامل ہم فقط امام عبدالعزیز کو مانتے ہیں۔ امام عبدالعزیز کے بعد ان کی مثل ہمیں کوئی نظر نہیں آتا جس میں تینوں کمالات جمع ہو گئے ہوں۔

(ج) امام عبدالعزیز کے شاگردوں کے پہلے طبقہ میں امام رفیع الدین عقل ونقل کے جامع ہیں۔ اور امام عبدالقادر کشف ونقل کے جامع۔ دوسرے طبقہ میں امام مولانا محمد اسماعیل شہید عقل ونقل کے اوّل درجہ پر جامع ہیں اور مولانا عبدالحیؒ عقل ونقل کے دوسرے درجہ پر۔

(د) مولانا عبدالحیؒ اور مولانا محمد اسماعیل کے قِران السعدین کے ساتھ اگر کوئی کشف کا امام بھی مل سکے تو امام ولی اللہ کے وحدانی وجود کی دوسری مثال امام عبدالعزیز کے بعد اس اجتماع میں مل سکے گی۔

(۲)

ہمارا یقین ہے کہ امیر شہید اس قدر سلیم الفطرت تھے کہ ان کی قوتِ کشفیہ ہمیشہ سنت رسول اللہ ﷺ کے موافق رہی ہے۔ انھیں خلاف سنت کبھی الہام نہیں دیا گیا۔ انھوں نے کافیہ تک کتابیں پڑھ لی تھیں۔ پھر قرآن عظیم کا ترجمہ اور صحاح کا درس شاہ عبدالقادر سے سنتے رہے۔ اس طرح وہ کشف اور نقل کے جامع بن گئے۔

(الف) جادۂ قویمہ کی حکومت ہند میں پیدا کرنے کا عزم امیر شہید میں فطری تھا۔ اور خدمت خلق ان کا اخلاقی شعار ہے۔ ''جادۂ قویمہ''، ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور ''مسّوی'' پر عمل کرنے کا نام ہے۔

(ب) امام عبدالعزیزؒ نے الامیر الشہیدؒ کے ساتھ الصدر السعید اور الصدر الشہید ان تینوں بزرگوں کے مجموعہ کو اپنا قائم مقام بنا کر اپنے متبعین سے ان کا تعارف کرایا ہے جس سے وہ انقلابی سوسائٹی کا مرکز بن گئے۔ یاد رہے کہ اسی سوسائٹی کے ایک رکن الصدر الحمید کو اپنے ساتھ رکھا جو انقلاب کی مرکزی روح کی محافظت کرے گا۔

(ج) یوسف زئی کے علاقہ میں پہنچ کر جب امیر شہید امیر المومنین مانے گئے اور ہند میں امام ولی اللہ کے اتباع نے اس امارت کو تسلیم کر لیا تو وہ حکومت کے مالک ہو گئے۔

(۳)

حکومت کی مصلحت میں ہماری تحقیق حزب کی آمریت (پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ) تو مان سکتی ہے مگر کسی فرد کے ڈکٹیٹر بننے کو ہم قبول نہیں کر سکتے۔ اسے ہم شاورھم فی الامر کے خلاف سمجھتے ہیں اس کی تشریح ابو بکر رازی کے احکام القرآن میں ملے گی۔ حجۃ اللہ

البالغہ کے بعد اگر کسی کتاب نے ہماری سیاسی بصیرت بڑھائی ہے تو وہ یہی کتاب ہے۔

(الف) ہم اس حکومت کو حکومتِ موقتہ کہتے ہیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ لاہور فتح کر کے یہ حکومت دہلی پہنچتی ہے۔ تو مستقل حکومت کا فیصلہ اس وقت ہوگا۔ یا تو بادشاہ دہلی اس انقلابی حکومت کے رئیس کو وزیر اعظم مان لیتا اور اس کی پارٹی پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) بن جاتی۔ دوسری صورت میں یعنی اگر شاہ دہلی اس حکومت کو تسلیم نہ کرتا تو اسے معزول کر کے اس حکومت کا رئیس ملک کا حاکم ہوتا۔ اور اس کی پارٹی اپنا قانون نافذ کرتی۔

(ب) کیا امام عبدالعزیز کا خلیفہ دہلی کو بھول سکتا ہے جس کو وہ حرمین اور قدس اور نجف کے بعد ساری دنیا سے افضل مانتے ہیں۔

(ج) ''مقاماتِ طریقت'' جس سے ''سوانح احمدیہ'' کا مصنف بھی نقل کرتا ہے۔ ہم نے مکہ معظمہ میں دیکھی ہے۔ اس میں ایک واقعہ مذکور ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وکیل نے امیر شہید سے پوچھا کہ اگر مہاراجہ اسلام قبول کر لے تو آپ کی حکومت ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرے گی؟ مہاراجہ بادشاہ ہوں گے۔ اور میں اپنی بیٹی ان سے بیاہ دونگا۔ محض دینی معاملات میں اس وقت تک اس کا نائب رہوں گا جب تک وہ شریعت کا حکم چلانا سیکھ لیں (اوکما قال) یہ وہ اساس ہے جس پر ہم امیر شہید کی حکومت کو حکومت موقتہ کہنا جائز سمجھتے ہیں۔

(د) ''مقاماتِ طریقت'' میں مذکور ہے کہ امیر شہید کے اصحاب میں سے ایک مجاہد عالم جو پہلے بھی حاکم لاہور سے مل چکا تھا' بالاکوٹ کے معرکہ میں گرفتار ہو کر لاہور آیا۔ حاکم نے اس مجاہد سے پوچھا اب خلیفہ کہاں ہے۔ اس عالم نے جواب دیا۔ میں خلیفہ ہوں'' ہم امام ولی اللہ کی تحریک کو مساوات اور جمہوریت کا

نمونہ مانتے ہیں۔اس لیے ہم مسلم اور غیر مسلم سے اس کا تعارف کراتے ہیں۔

(۴)

ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس وقت کی حکومتیں امیر شہید کی تحریک کونا کام بنانے میں حصہ لیتی رہی ہیں۔

(الف) یہ حکومتیں حکومت لاہور سے ساز باز کر کے امیر شہید اور حکومت لاہور کو مصالحت کا موقعہ نہیں دیتی تھیں۔

(ب) جن مسلمانوں کو امام ولی اللہ کی تحریک سے مذہبی مخاصمت ہے جیسے شیعہ اور جہال اہل سنت۔ان کے توسط سے امیر شہید کی جماعت میں انتشار پیدا کراتی رہی ہیں۔اس کی بعض مثالیں ہمیں مولانا حمید الدین مرحوم نے بتلائیں۔

(ج) جب سوانح احمدیہ کے مصنف جیسا فدائی کسی اثر سے امیر شہید کی پوزیشن بیان کرنے میں اور ان کے مقصد کے تعین میں صریح غلط بیانی اختیار کر سکتا ہے تو بعض عرب رہنماؤں کے ذریعہ سے ایسا پراپیگنڈا کیوں ناممکن سمجھا جاتا ہے جس کے اثر سے تحریک اپنے اصلی مرکز سے منقطع ہو جائے اور جمہور کارندے قبل از وقت بلند پردازی کو اپنا مقصد قرار دیں۔کیا اس طرح دوستی کے لباس میں اسے ناکام نہیں بنایا جاتا۔

(د) امیر شہید کی تحریک کو جاہل افاغنہ کے رہنماؤں سے جس قسم کا نقصان پہنچا ہے۔اس کے مطالعہ کے لیے سید جمال الدین افغانی کی تاریخ افاغنہ (عربی) اور امیر حبیب اللہ خاں کی لکھوائی ہوئی ''تاریخ افغانستان'' فارسی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

(۵)

(الف) آخر میں ہم دوبارہ امیر شہید کے متعلق اپنا عقیدہ صاف صاف بیان کرتے ہیں۔ ہم امیر شہید کو ایک معصوم امام مان سکتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا شہید انھیں اسی طرح منوانا چاہتے ہیں۔

(ب) مگر جس وقت ہم انہیں امارت کی ذمہ داری سپرد کرتے ہیں تو اجتماعی غلطیوں کی مسؤلیت سے انہیں مبّرا ثابت نہیں کریں گے۔ ورنہ اس نادر مثال سے تحریک کی آئندہ ترقی میں استفادہ ناممکن ہوجائے گا۔

الامیر ولایت علی صادق پوری کی جماعت صادقہ

جب کوئی امیر میدان جنگ میں شہید ہوجائے تو بقیۃ السیف مجاہدین کے لیے ضروری ہے کہ اپنا امیر انتخاب کریں۔ معرکہ بالاکوٹ کے بعد اس قسم کی امارت مولانا ولایت علی کے خاندان میں منحصر ہوگئی۔

(۱)

ہم اس امارت کو ایک مستقل پارٹی مانتے ہیں' جو امام ولی اللہ کی تحریک میں پہلی امارت کی راکھ سے پیدا ہوئی۔ اس پارٹی کی عظمت کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ مگر نہ تو ہم کبھی اس پارٹی کے ممبر بنے اور نہ اس کی دعوت دینا کبھی ہمارا مقصد رہا ہے۔

(۲)

(الف) ہم اس پارٹی کے مجاہدین کے ساتھ ان کے مختلف مرکزوں میں کافی زمانہ تک ملتے رہے ہیں۔ اس پارٹی کے بہت سے راز ہمیں معلوم ہیں مگر وہ ایک امانت

ہے ہم اسے افشا نہیں کر سکتے۔ لیکن اس قدر تصریح میں عیب نہیں کہ ہماری ذہنیت اس اجتماع کا جزو بن کر مطمئن نہیں رہ سکتی۔

(ب) ہمارے دیوبندی رفقاء کو یاغستان میں اور ہمیں وکیل مجاہدین چمرقند کے ساتھ کابل میں ساتھ مل کر کام کرنے کا تجربہ ہے۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے تعاون و تناصر سے کبھی دست کش نہیں ہوئے لیکن ایک پارٹی کے ممبر سمجھ کر ہمیں کسی نے قبول نہیں کیا۔ نہ حکومت کابل نے نہ کسی بیرونی سیاسی جماعت نے' یہ وہ اساس ہے جس پر ہم دونوں پارٹیوں کا علیحدہ علیحدہ تعارف کرانا ضروری سمجھتے ہیں ورنہ ہم اپنا کام آگے نہیں بڑھا سکتے۔

(۳)

(الف) نواب صدیق حسن خان نے جس "اربعین" کا ذکر کیا ہے' وہ ہم نے دیکھی ہے' وہ خرافات کا مجموعہ ہے۔ اس میں اس قسم کے الفاظ بھی مرفوعاً موجود ہیں کہ امام مہدی ہند کے شمال مغربی کوہستان سے نکلے گا۔ وہ پنجاب کے کسی غیر معروف مطبع میں چھپی ہے اور خاص لوگوں میں تقسیم ہوئی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت کے امیروں نے اس کی اشاعت ممنوع قرار دے رکھی ہے۔

(ب) غالباً مولانا ولایت علی صاحب نے اپنے "رسائل تسعہ" میں امیر شہید کو مہدی متوسط قرار دے کر ان کی غیبوبت کا ذکر کیا ہے۔

(ج) امیر ولایت علی کے رفیق مولانا عبدالحق کا ترجمہ "سلسلة العسجد" میں دیکھنا چاہیئے۔ کیا نواب صاحب ان کی زیدیت یا تشیع سے ناواقف ہیں۔ ہم نے ایک رسالہ دیکھا ہے جو شاہی زمانے کی دہلی میں چھپا ہے۔ اس میں مولانا

محمد اسحاق اور سید محمد علی رام پوری کے بعض بیانات بھی موجود ہیں۔ ان میں لکھا ہے کہ امیر شہید نے مولانا عبدالحق کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا تھا۔ وہ رسالہ مکہ معظّمہ میں مولانا احمد سعید کے خاندانی کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس پر مولانا عبدالغنی کی مُہر ہے۔

(د) جب سے اس پارٹی میں امام عبدالعزیز کے طریقے سے انکار کا غلو پھیلا ہے۔ عوام مس ایک طبقہ ائمہ فقہا پر سب وشتم کرنے والا بھی پیدا ہو گیا ہے۔ انہیں لوگوں کو چھوٹا رافضی کہا جاتا ہے۔ حاشا وکلّا اس پارٹی کے کسی محترم رکن کو اس قسم کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ ہم نے سرحدی مراکز میں امیروں کو حنفی طریقہ پر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ ہم سے کہا گیا کہ یہ اس خاندان کا متوارث طریقہ ہے۔

الامیر امداد اللہ کی دہلوی جماعت

(تسلسل فکر)

مولانا محمد اسحاق کو ہم ان کے جدامجد کی تحریک کا ایسا امام مانتے ہیں جن کے متعلق الہامی پیشین گوئی اس خاندان میں متوارث ہے یعنی ہم امام محمد اسحاق کو اس تحریک کی علمی اور سیاسی مصلحت کا محافظ مانتے ہیں۔ اور حکومت کا ایک نائب امیر' اس لیے امیر کی شہادت کے بعد وہ ایک امیر بن جائے گا۔

سیاسیات میں اگر کسی جماعت کا امام محمد اسحاق سے تعلق ثابت ہو جائے تو ہم اسے امام ولی اللہ کی تحریک میں ایک مستقل پارٹی تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس تفریق کا باعث ہم بنتے ہیں یا ہمارے مقابل' یہ بحث دوسرے درجہ کی مانتے ہیں۔

(ان کے کام کے بنیادی نکات)

(ا)

(الف) الامیر امداد اللہ کا تعلق امام محمد اسحاق سے اولاً و آخر ثابت ہے۔ شروع میں امیر امداد اللہ مولانا محمد اسحاق کے مدرسہ میں طالب علمی کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد اسحاق کے داماد اور خلیفہ مولانا نصیر الدین سے کسبِ طریقہ کیا۔ یہ وہی مولانا نصیر الدین ہیں جنہیں مجاہدین نے بالا کوٹ میں اپنا پہلا امیر بنایا تھا۔ ان کی جگہ پر آگے چل کر مولانا ولایت علی کا خاندان آیا ہے۔

(ب) امام محمد اسحاق جس سال وفات پاتے ہیں۔ اسی سال امیر امداد اللہ حج کے لیے گئے۔ امام محمد اسحاق نے اپنے طریقہ کی خاص ہدایتیں دے کر انہیں ہند واپس بھیجا۔ یہ بھی روایت ہے کہ انھیں یہ پیشین گوئی بھی سنائی کہ ایسا وقت آئے گا جب تم مکہ معظمہ میں بیٹھ کر کام کرو گے۔

(ج) امیر امداد اللہ شیخ نور محمد جھنجھانوی کے خلیفہ ہیں اور وہ شاہ عبدالرحیم افغانی کے۔ یہ دونوں حضرات، حضرت امیر شہید کے نامور خلفاء میں سے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم تو بالاکوٹ میں شہید ہوئے ہیں۔

(د) الامیر امداد اللہ کے رفقاء میں حکیم ضیاء الدین رام پوری ہیں (رام پور منہیاران)۔ ان بزرگوں میں مولانا محمد حسن رام پوری ہیں جو مولانا شہید کے خواص اصحاب میں تھے۔ ان کا ذکر سوانح احمدیہ میں موجود ہے۔

(۲)

مولانا مملوک علی دہلی کالج کے مدرس تھے۔ دیو بندی تحریک کے اکثر اساتذہ مولانا مملوک علی کے شاگرد ہیں۔ جس سال مولانا محمد اسحاق مکہ معظّمہ پہنچے' اسی سال وہ حج کو گئے۔ مولانا محمد یعقوب نے ''سوانح مولانا محمد قاسم'' میں کسی خاص مقصد کو ملحوظ رکھ کر اس کا اجمالی ذکر کر دیا ہے۔

(الف) مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب کی جاگیر سے جو روپیہ حاصل ہوتا تھا' اس کا انتظام ایک جماعت کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اس میں مولانا مملوک علی اور مولانا مظفر حسین خاص حیثیت رکھتے تھے۔

(ب) مکہ معظّمہ سے واپس آ کر الامیر امداد اللہ بھی اسی سوسائٹی میں شامل ہو گئے۔

(ج) یہ سوسائٹی مولانا ولایت علی کی جماعت سے علیحدہ مانی جاتی تھی۔ چنانچہ یہ روایت بھی موجود ہے کہ مولانا ولایت علی سرحد کو گئے تو مومن خاں نے مولانا امداد اللہ سے دریافت کیا کہ آپ کی نظر (کشفی) میں انھیں کامیابی ہوتی نظر آتی ہے؟ مولانا امداد اللہ نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر مومن خاں خفا ہو گئے۔ مولانا امداد اللہ نے معذرت کی کہ اگر آپ نہ پوچھتے تو ہم کچھ نہ کہتے۔

(د) ان لوگوں کے متبعین کو ہم امام محمد اسحاق کی دہلوی پارٹی کہتے ہیں جس کے ایک رہنما الامیر امداد اللہ تھے۔

مولانا شیخ الہند کی دیو بندی جماعت یا مولانا محمد قاسم کے اتباع
(تسلسل فکر)

سقوط دہلی کے بعد اس دہلوی پارٹی کے افراد منتشر ہو گئے۔ یہاں تک کہ الامیر

امداداللہ مکہ معظمہ پہنچے اور مولانا محمد قاسم بھی نام بدل کر حج کے لیے نکلے۔ مولانا محمد یعقوب کے مکتوبات میں اس سفر کا پورا تذکرہ موجود ہے۔

(ان کے کام کے بنیادی نکات)

(۱)

امیر امداداللہ نے مکہ معظمہ میں فیصلہ کیا کہ امام عبدالعزیز کے مدرسہ کی طرح دہلی سے باہر مدرسہ بنایا جائے اور امام محمد اسحاق کے طریقے پر نئی جماعت تیار کی جائے۔

(الف) مولانا محمد قاسم نے چند سال محنت کر کے دیوبند میں مدرسہ بنایا۔

(ب) ہم جہاں تک سمجھ سکے ہیں، اس جماعت کے اولین موسس امیر امداداللہ اور ان کے دو رفیق مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد ہیں۔ امیر امداداللہ کے سوا اس اجتماع کے ربط کو زیادہ مضبوط کرنے والے مولانا مملوک علی اور مولانا عبدالغنی بھی ہیں۔

(ج) اس جماعت کے امتیازی اوصاف میں ہم وحدت الوجود، حنفی فقہ کا التزام، ترکی خلافت سے اتصال، تین اصول معیّن کر سکتے ہیں جو اس جماعت کو امیر ولایت علی کی جماعت سے جدا کر دیتے ہیں۔

(۲)

مدرسہ دیوبند کی سالانہ روئداد مسلسل ملتی ہے۔ مولانا محمود حسن کی طالب علمی اور پھر مدرسی، پھر صدارت اور اپنے مشائخ ثلاثہ کی خلافت، پھر شیخ الہند بننے کے واقعات مشہور و معروف ہیں۔

دیوبند کے ایک نومسلم طالب علم کا مولانا شیخ الہند سے تعلق

(تسلسل فکر اور ان کے بنیادی نکات)

(ا)

میں چاہتا ہوں کہ حضرت مولانا شیخ الہند سے اپنا تعلق واضح کر دوں۔ غالباً پچاس برس سے زیادہ عرصہ گزرا کہ میں نے بتوفیقہ تعالی مدرسہ دیوبند کی طالب علمی سے فارغ ہو کر امام ولی اللہ کی حکمت وسیاست کے تدریجی مطالعہ کو اپنا مقصد حیات بنایا۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس سارے سفر میں میری رہنمائی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ارشاد سے ہوتی رہی۔

(الف) اس سفر کی پہلی منزل ہم نے سات سال میں طے کی ہے۔ میرا یہ وقت سندھ میں گزرا۔ مولانا محمد قاسم کے نظریات سے شروع کر کے مولانا محمد اسماعیل شہید، مولانا رفیع الدین، امام عبدالعزیز کے توسط سے امام الائمہ امام ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ تک ہم پہنچ گئے۔

(ب) ہمارے دل میں اس کتاب کے مطالب کا آہستہ آہستہ یقین اور پھر یقین میں رسوخ پیدا ہوتا رہا۔ اس سے ہم کتاب وسنت کو اطمینان سے سمجھنے کے قابل ہو گئے۔ اور طالبعلموں کی کئی جماعتوں کو ہم نے حجۃ اللہ پڑھائی۔ اس کے بعد ہمیں موقعہ ملا کہ حضرت شیخ الہند سے اس کتاب کے بعض اسباق سنے۔ اسی زمانہ میں میں نے مولانا محمد قاسم کا رسالہ ''حجۃ الاسلام'' مولانا شیخ الہند سے سبقاً سبقاً پڑھا۔

(ج) اس میں مبالغہ نہ سمجھا جائے کہ ہمیں حضرت شیخ الہند کے علمی مقام کی حقیقت اس

کے بعد کسی قدر نظر آنے لگی۔ وہ بظاہر تو قاسمی سیرت کے نمونہ تھے۔ مگر باطن میں امام ولی اللہ کی حکمت کے متبحر ترجمان نظر آنے لگے۔ دیکھئے شیخ الہند اپنے ''موضح فرقان'' کے مقدمہ میں امام ولی اللہ کا نام کس کس مزے سے لیتے ہیں۔

''حجۃ اللہ علی العالمین شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ''

(۲)

''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے اصول سمجھنے میں ہمارے لئے مولانا محمد قاسم کی کتابیں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ہم نے بچپن میں اسکول میں تعلیم پائی۔ ہماری ذہنیت ریاضی سے بہت مناسبت رکھتی تھی۔ آریہ سماج اور عیسائیوں کے مقابلہ میں مولانا محمد قاسم جو کچھ لکھتے ہیں' اور شیعہ کے شبہات کا جس طرح ازالہ کرتے ہیں۔ اسے میں نے خوب سمجھا۔ اس نے میرے زہن کو عام اہل علم سے علیحدہ ہو کر عقلی مسائل کو محض مولانا محمد قاسم کے طریقہ پر سوچنے کے لیے تیار کر دیا۔

(الف) مولانا محمد قاسم محدود مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ اور مجھے قرآن عظیم اور صحاح کی ہر حدیث کو اسی طرح سمجھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح میری پیاس مجھے امام ولی اللہ کے اتباع سے مانوس بناتی رہی۔ آہستہ آہستہ ان کے مخالف علماء کے نظریات سے انکار بھی پیدا ہونے لگا۔

(ب) مولانا محمد قاسم کے نظریات میں رسوخ کا پہلا فائدہ ہمیں یہ ملا کہ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے اصول سمجھنے سمجھانے میں ہم نے:

(۱) سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریروں۔

(۲) مولانا محمد حسین بٹالوی اور ان کی جماعت کی کتابیں ۔

(۳) ۔ قادیانی تحریک کی تالیفات اپنے سامنے رکھیں۔اس طرح اپنے دیو بندی رفقاء کی طرح اپنے خاص فرقے کے معلومات میں محدود نہیں رہے۔

(ج) ہماری تحقیق میں متکلمین کی یہ جماعتیں دیو بندی اکابر کے سوا امام ولی اللہ کے تمام اصول تسلیم نہیں کرتیں۔اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دیو بندی جماعت (اتباع مولانا محمد قاسم) کی حکمت اور سیاست کو امام ولی اللہ کی حکمت وسیاست کا مقدمہ بناتے ہیں۔

(د) جس قدر عرصہ ہم ہند میں علمی کام کرتے رہے "دارالرشاد" (سندھ) "جمعیۃ الانصار" (دیو بند) "نظارۃ المعارف" (دہلی) میں ہمارا مرکز فکر "حجۃ اللہ البالغہ" ہی رہی۔اس کے بعد بیرونی سیاحت کے مختلف مقامات کابل، ماسکو، انقرہ، روما لوزان میں بھی ہم نے حجۃ اللہ البالغہ کے عقلی اصول سے باہر جانا پسند نہیں کیا۔

(ھ) مکہ معظمہ میں بیٹھ کر ہم نے اپنا پروگرام بنالیا کہ ان تبدیل شدہ حالات میں ہم کس طرح اپنے مسلک پر قائم رہ سکتے ہیں۔یورپین فلاسفی اور ہندو فلاسفی کے ماہرین سے ہم ولی اللہ فلاسفی کا کس طرح تعارف کرا سکتے ہیں۔ہم اس راستہ پر گرتے پڑتے قدم بڑھا رہے ہیں۔اور اپنی ہر ایک غلطی کی اصلاح کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔لیکن امام ولی اللہ کی حکمت وسیاست کی جو انقلابی روح ہماری سمجھ میں آچکی ہے اس میں ایک ذرہ کا فرق بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

واللہ ہو المستعان و اٰخر دعوٰنا ان الحمدللہ رب العالمین.

مقالہ نمبر ۲۰

سندھ ساگر اکیڈمی

۱۲ جولائی ۱۹۴۳ء

لیاری ۔ کراچی

پس منظر

[جولائی ۱۹۴۳ء میں دارالرشاد' گوٹھ پیر جھنڈا سندھ میں حضرت سندھیؒ نے ایک قطعہ زمین خریدا' اور امام ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کی نشرواشاعت کیلئے ایک علمی ادارہ ''سندھ ساگر اکیڈمی'' کے نام سے قائم کیا' اوراس جگہ کا نام ''محمودنگر'' تجویز فرمایا۔ اس کے تعارف کیلئے حضرت مولانا نے یہ تحریر لکھی' آغاز میں اپنی ان مشکلات کا تذکرہ فرمایا' جو حضرت الامام دہلویؒ کے حکمت کی نشرواشاعت کے سلسلے میں آپ کو پیش آئیں۔ یہ اہم تحریر کافی عرصہ غیر مطبوعہ شکل میں حضرت مولانا عزیز احمدؒ کے پاس محفوظ رہی۔ اوران سے مولانا عزیز اللہ جروار کے پاس آئی' ان کے شکریہ کے ساتھ شامل اشاعت کی جارہی ہے۔

آزاد]

سندھ ساگر اکاڈیمی

بِسمِ اللہِ الرّحمٰن الرَّحِیمِ

الحمد للہ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

امابعد: ہم جب واپس وطن پہنچے تو ہم نے مقرر طے شدہ پروگرام کا فوراً تعارف کرانا ناممکن دیکھا، ہم نے اسے تقسیم کرلیا۔ ۱۹۳۹ء کے مارچ میں ہم کراچی اترے۔ ہم انڈین نیشنل کانگریس میں آگے بڑھنے والوں کا نام لے کر کانگریس پارٹی سے علیحدہ ہو جاتے، فقط عدم تشدد اور وطنی اتحاد اور عوام کی بیداری کے خدام کی ہم تعریفیں کرتے، ہماری شخصی رائے کوئی پوچھتا تو ہم اپنا مقصد حیات فقط حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسن دیوبندی کی یادگار قائم کرنے پر منحصر کردیتے۔ تفصیلی بحث میں ہم سب سے پہلے شیخ الہند کے ہند سے باہر کے کام کا تعارف کراتے، سمجھدار حیران رہ جاتے۔ اس کے بعد شیخ الہند کا وہ فیصلہ جو حضرت مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم دیوبند کی سوسائٹی کا اتباع کرنے کا ہے، اسے واضح کرتے، لوگ فہمیدہ اور واقف اگر ملتے تو حیران ہوتے، انھوں نے فقط جہاد اور لڑائی کے واقعات تو یاد کررکھے ہیں مگر جہاد کا فلسفہ اور فتح وشکست کے بعد کے پروگرام پر کبھی غور ہی نہیں کیا جب ہم اپنے دوستوں کو مولانا شیخ الہند کے ان مقولوں کا مطلب بتلاتے جو انھوں نے بھی خود حضرت سے سُنے تھے تو ہماری فی الجملہ تعریف کرتے۔

مولانا محمد قاسم کی سوسائٹی کے فیصلے سے آگے بڑھ کر ہم حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت مولانا مملوک علی اور مولانا مظفر حسین (کاندھلوی) اور مولانا عبدالغنیؒ اور مولانا محمد یعقوب دہلوی اور اس درجے کے اور چند حضرات کا نام لے کر ان کے فیصلے بتلاتے جو

الصدر العمید مولانا محمد اسحاق کے بعد دہلی میں ان کے قائم مقام تھے۔جس کے پروگرام بالا کوٹ کی شکست کے بعد فیصل ہوئے۔اس وقت ہمارے بعض دوست ہمیں ملامت کرنا چھوڑ دیتے۔مگر سو میں سے پانچ بھی ایسے نہیں ملتے رہے جو آخر تک ہماری بات ہی سن لیں ہمارے لیے اور بھی مشکلات تھیں۔

(۱) روپیہ ضرورت کے موافق نہ ہونا۔

(۲) گورنمنٹ کی طرف سے نگرانی کرنے والوں کو ناراض نہ ہونے دینا۔

(۳) اور اپنے لوگوں میں بیٹھ کر غلط صحیح الزام لگانا' برٹش حکومت کو کوسنا' جہاد سمجھنے والوں کی بقدر ضرورت ہم نوائی بھی کرتے رہنا۔ ورنہ ڈر تھا کہ ہمیں اسلام سے نہ خارج کر دیا جائے۔اس حالت میں اپنا اصلی پروگرام بھی کہیں نہ کہیں بتلاتے رہیں۔اس طرح ہم نے تین سال برباد کیے۔

بحمدہٖ تعالیٰ جب ہم ان خرافات سے فارغ ہوئے تو ہم نے اپنی مستقل پارٹی انڈین نیشنل کانگریس میں بنانے کا اعلان کیا۔اب یادگار شیخ الہند کی تفصیل کے لیے ایک موقع ملتا ہے۔ہم پارٹی بنائیں گے امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفے پر اسے ملک میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔اس لیے ہم یادگار شیخ الہند ایک تعلیم گاہ کی صورت میں پہلے قائم کریں گے۔وہ ہے بیت الحکمت۔سب سے پہلے ہم نے دارالعلوم دیوبند کے پہلے دورے میں اپنے طالب علمی والے تجربے میں بیٹھ کر اپنے ایک دو مخصوص عزیزوں اور دوستوں سے تذکرہ کیا۔یہ ہے ''بیت الحکمت'' کی تاسیس۔نہ ہم نے دارالعلوم میں اعلان کیا۔غالباً نہ آج تک باہر ہم نے کسی سے اس چھوٹی سے بات کا تذکرہ کیا۔

اس کے بعد دہلی جامعہ ملّیہ کی فضا دیکھ آئے تو سندھ پہنچ کر ہم نے دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) کے اپنے کمرے میں اپنے ایک دو ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر بیت الحکمت قائم کر دیا اور اس کا اعلان کراچی کے اخباروں میں کرا دیا۔مولانا محمد صادق نے مظہر العلوم

کراچی میں بیت الحکمت بنا دیا۔ مہینہ چالیس دن ہم وہاں بھی کام کرتے رہے ہیں۔

اس کے بعد ہم جامعہ ملیہ پہنچے اور ''بیت الحکمت'' کا مستقل مرکز بنانے میں پرانی نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کے زندہ کرنے کے لیے مصروف ہو گئے۔

اب ہمارے پروگرام سیاسی انقلابات سے متاثر ہو چکے ہیں اس لیے عام طور پر طالبعلم نہیں ملے پھر بھی ہم تین سال تک کام کرتے رہے جو طالبعلم تیار ہوتے ان کو نظام عمل بتاتے۔ ہم پھر سندھ واپس آئے اور (گوٹھ پیر جھنڈا میں) دارالرشاد کے متصل ایک قطعہ زمین اپنی ملکیت میں حاصل کرنے میں غالباً تین سال مصروف رہے۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں وہ قطعہ ہم کو مل گیا۔ اب ہم اپنے پروگرام پر اس میں مستقل یادگار شیخ الہند قائم کرنا چاہتے ہیں اس نئی بستی کا نام ہم نے ''محمود نگر'' تجویز کیا ہے محمود نگر میں ہمارا جس قدر کام ہے ہم اسے سندھ ساگر انسٹی ٹیوٹ کے ضابطے میں لا کر امام ولی اللہ کے فلسفے پر سوسائٹی میں انقلاب لانا چاہتے ہیں، جس قدر دوسرے درجے کے کام ہیں ہم ان کو سندھ ساگر اکاڈیمی کا نام دیتے ہیں۔

اس طرح ہمارا علمی مرکز بیت الحکمت جامع ملیہ دہلی میں اور ہمار علمی ادارہ (سندھ ساگر اکاڈیمی) ''محمود نگر'' (ضلع حیدرآباد سندھ) میں آہستہ آہستہ ترقی کرتا رہے گا۔

واللہ ھوالموفق و ھو المستعان ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العظیم و صلی اللہ علی سیدنا محمد و الہ واصحابہ واتباعہ اجمعین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین.

عبیداللہ سندھی

۱۲ جولائی ۹۴۳ء ہندی

دفتر سندھ ساگر اکاڈیمی لیاری، کراچی

مقالہ نمبر ۲۱

محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج لاہور

(قیام/نصاب/اغراض و مقاصد)

۲۲/۲۴ مارچ ۱۹۴۴ء

قاسم العلوم۔لاہور

پس منظر

[حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ولی اللّٰھی علوم و معارف اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ پڑھانے کیلئے جو ادارے قائم کئے۔ ان میں ''محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج'' نمایاں ترین ہے۔ اس ادارے کے اغراض و مقاصد' دائرۂ کار اور نصاب تعلیم و تربیت' کن خطوط پر مشتمل ہونگے۔ ان امور پر حضرت سندھیؒ نے انتہائی جامع اور مفصل اظہار خیال کیا ہے۔ چنانچہ کالج کا نصاب' دستور العمل' پڑھائے جانے والے مضامین اور اس کے مقاصد و نتائج پوری شرح و بسط کے ساتھ اس مقالہ میں بیان کئے ہیں۔ ۱۵ مارچ ۱۹۴۴ء کو حضرت سندھیؒ نے یہ تحریر لکھی۔ اور ''امام ولی اللہ اکیڈیمی'' کی جانب سے پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی۔ یہ حضرت سندھیؒ کے آخر زمانہ کی اہم تحریرات میں سے ایک ہے۔ جو اس مجموعہ میں شامل کی جا رہی ہے۔ آزاد]

"ونفسٍ وما سوٰھا فألھمھا فُجورھا وتقوٰھا"

(القرآن العظیم)

محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی اور اس کے توسط سے

محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج

کا قیام

جسے

شمال مغربی ہند کے تاریخی مقام لاہور میں

مولانا عبید اللہ سندھی کے بیت الحکمت لاہور

نے

۱۵ مارچ ۱۹۴۴ء ہندی سے شروع کر دیا ہے۔

محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج کے اساسی اصول

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

الحمد للہ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

امّا بعد: لاہور میں محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی کے اساسی اصول کا یہ مختصر مسودہ ہے۔نوجوانوں کے متیقظ (باشعور) عنصر تک اگر یہ آواز پہنچ گئی تو وہ اس کی تکمیل میں پوری جدوجہد کریں گے۔ واللہ المستعان۔

اللہ رب العالمین ارحم الرحمین سے اس کے ایک عاجز بندہ کی دعا رب انی و ھن العظم منی واشتعل الرآس شیبا ولم اکن بدعآ ئک رب شقیا۔ (القرآن) (ترجمہ: اے میرے رب! بوڑھی ہوگئیں میری ہڈیاں اور سر سے بڑھاپے کا شعلہ نکلا۔ اور اے رب! تجھ سے دعا کر کے میں کبھی محروم نہیں رہا)۔ (الداعی عبیداللہ سندھیؒ)

محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی کے تخیل کی ابتداء اور اس کا ارتقاء

میں ایک عاجز بندہ تھا۔ تو نے سمجھ دی۔ طالبعلمی کی توفیق دی۔ علمی خزانوں کے دروازے کھولے۔ ان سے استفادہ کی میرے لئے ایسی سہل صورتیں میسر ہوتی رہیں جن پر شاید دنیا کا ایک بہت بڑا بادشاہ بھی قادر نہ ہوسکتا۔ محض تیرے فضل اور تیری امداد سے میں اپنا مطالعہ بڑھاتا رہا۔

مجھے ''حجتہ اللہ البالغہ'' اچھی طرح دل نشین ہوئی۔ اس کی نچلی سطح پر ''ازالۃ الخفاء''
اور ''المسوی من الموطا'' ظاہر ہوئے' ان کے مطالعہ سے میں فقہ وحدیث کی تطبیق پر قادر ہو
گیا۔ محققین اہل السنتہ اوران کے بعد محققین حنفیہ کا مسلک معین کرسکا۔ میری تحقیق میں کسی
حدیث سے ان ائمہ کا مسلک معارض نہیں۔ حدیثِ صحیح اور فقہ کی تطبیق میں میرے سات
سال صرف ہوئے۔

''حجتہ اللہ البالغہ'' کی اوپر کی سطح پر ''فتح الرحمٰن'' اور الفوز الکبیر'' اوران کے ساتھ
''تاویل الاحادیث'' نمودار ہوئے۔ (یہ کتاب فصوص الحکم کا جواب ہے مگر عموماً اہل علم اس
کی جلالتِ شان کو سمجھ نہیں سکے)۔ ان کے توسط سے قرآن عظیم کی حکیمانہ تفسیر کا دروازہ
کھلا۔ اس کا پہلا مرحلہ دس سال میں اور دوسرا مرحلہ غالباً بیس سال میں طے ہوا' تیسرے
مرحلے کی سیر اب تک جاری ہے۔ بحمدہٖ تعالیٰ سمجھ بڑھ رہی ہے۔ اور اپنی پہلی غلطی کی تصحیح میں
تامل نہیں ہوتا۔

میرے بچپن کی تعلیم اچھی تھی۔ ریاضی اور تاریخ سے خاصی دلچسپی پیدا ہوچکی تھی۔
اظہار اسلام کے ایک سال بعد کافیہ پڑھتا ہوا دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا۔

مولانا محمد قاسم کے علمی کمالات میں شیفتگی

عربیت و معقول اور فقہ و اصول' معانی و بیان سے فراغت کے قریب پہنچ کر
حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند کے اسباق میں شامل ہوا۔ ان کی صحبت میں علمی ذوق کی
چاشنی محسوس ہوئی' اس سے پہلے جس قدر اساتذہ سے پڑھتا رہا وہ کتابیں پڑھاتے تھے۔
حضرت شیخ الہند کے اس امتیاز کا منبع تلاش کیا تو حضرت مولانا محمد قاسم کا نام

سامنے آیا۔ان کا رسالہ ''قبلہ نما'' پڑھا تو وہ میرے دل ودماغ پر حاوی اور حاکم ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جس علم کا بیج میری فطرت میں مستور ہے اس کی آبیاری اسی دریا سے ہوگی۔

میرے ساتھی طالب علم بعض بزرگ اساتذہ اور بعض ائمہ کا نام محبت اور تعظیم سے لیتے تھے۔ میرے لئے اگر استاد تھا تو محمود حسن اور امام تھا تو محمد قاسم۔ میں ہر ایک بزرگ کا ادب ان کے توسط سے کرتا رہا۔ان کے مخالفین کی عظمت یا احترام میرے قلب سے نکل گئی یا نکالی گئی۔

(ایک استثناء یہاں بطور جملہ معترضہ یاد رکھنا چاہیئے کہ میں اپنے خیال میں اس منزل کو اپنے رتبہ سے بہت بلند مانتا تھا۔ اس لئے سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ میرے مرشد سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق سندھی کی دعاء کی ایک برکت ہے۔ حضرت حافظ صاحب نے مجھے سب سے پہلے کلمۂ توحید تلقین کیا۔اور ایک موقعہ پر فرمایا کہ عبید اللہ نے اپنا ماں باپ اللہ کے لئے چھوڑا ہے۔اب اس کے ماں باپ ہم ہیں۔اسی مناسبت سے میں سندھی بنا)۔

امام الائمۃ امام ولی اللہ دہلوی تک وصول

حضرت مولانا محمد قاسم کی کتابوں اور حضرت شیخ الہند کی صحبت نے مجھے مولانا محمد اسماعیل شہید اور ان کے رفقاء کی تحریک سے آشنا کر دیا۔ دیوبند کے خاص حلقہ میں مولانا محمد قاسم، مولانا محمد اسماعیل کی شبیہ مانے جاتے ہیں، ان کے اساتذہ انہیں ''اسماعیل ثانی'' کہا کرتے تھے۔

ان سے آگے بڑھ کر میں امام الائمہ امام ولی اللہ دہلوی اور امام عبد العزیز دہلوی

تک پہنچ گیا۔ امام ولی اللہ کے طریقہ کو قائم کرنے والے امام عبدالعزیز ہی تھے۔ ''قبلہ نما'' میں جس ''تجلی الٰہی'' کا مولانا محمد قاسم نے تعارف کرایا تھا اس کی تحقیق مولانا محمد اسماعیل، امام عبدالعزیز، امام الائمہ امام ولی اللہ کے توسط سے تکمیل کو پہنچی۔

مسلمانانِ ہند کے لئے دہلی کو ایک مقدس مقام سمجھنا

امام ولی اللہ اپنے والد شاہ عبدالرحیم بن وجیہہ الدین دہلوی کے جانشین ہیں جو فتاویٰ عالمگیری کے مصنفین میں شامل ہیں۔ اس طرح میری علمی تاریخ کا سلسلہ سلطان عالمگیر تک پہنچ گیا۔ اور میں شاہجہان آباد کو اپنا علمی سیاسی ایک مقدس مرکز (آئیڈیل سنٹر) سمجھنے لگا۔

اس سفر میں راستہ کے دونوں طرف مجھے بڑے بڑے علمی مرکز نظر آئے۔ مگر میں امام الائمہ امام ولی اللہ کے طریقۂ تطبیق سے ہٹ کر اپنے لئے قلبی تسکین نہیں پاتا رہا۔ اس لئے انہیں ائمہ کے مسلک پر چلتا رہا۔ دوسری طرف رخ نہیں پھیر سکا۔

یہاں پہنچ کر اگر کوئی طالب علم میری رفاقت منظور کرتا تو اسے مولانا محمد قاسم کی امامت اور شاہ ولی اللہ کا مجدد اور امام الائمہ ہونا بتلا دیتا۔ اگر وہ اسے قبول نہ کر سکتا تو ہماری رفاقت دیرپا نہ ہوتی۔

بیرونی سیاحت کے دوران میں امام الائمہ کے اعلیٰ اصولِ سیاست پر انتباہ

میں ۱۸۸۷ ہندی = ۱۸۸۷ء عیسوی میں مسلمان ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں کابل گیا۔ یہ تیس بتیس سال میں نے زیادہ تر سندھ اور دیوبند و دہلی کے قرب و جوار میں

گذارے۔ لیکن پنجاب و پشاور و لاہور سے بالکل منقطع نہیں ہوا۔ میرا مولد ضلع سیالکوٹ ہے اور میری رشتہ داری اور دوستی پنجاب میں مسلسل قائم رہی ہے۔

اس کے بعد بیس بائیس سال بیرونی ممالک میں رہا۔ جب واپس آیا تو میں محسوس کرتا ہوں کہ مختلف صحبتوں کے اثر سے ذہنیت میں کافی تبدیلی آ چکی ہے۔ لیکن ''حجۃ البالغہ'' کا علم وحکمت اپنی اصلی شان سے محفوظ وقائم ہے۔ بلکہ اس میں زیادہ رسوخ نصیب ہو چکا ہے' اس کے ساتھ یورپ کی سیاحت نے امام ولی اللہ کی حکمت کا نیا باب پڑھا دیا۔ جسے اقتصادیات واجتماعیات یا سیاسیات کہا جاتا ہے۔

(۱) امام ولی اللہ دہلویؒ اخلاقیات کو اقتصادیات سے مرتبط کر دیتے ہیں۔

(۲) رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی میں حکومت کی تاسیس مانتے ہیں۔

(۳) خیر القرون کی تفسیر مدنی خلافت کے اتفاقی دور پر ختم کر دیتے ہیں۔

(۴) مبعث سے اسلام کے پہلے ۴۸ سال کے دور کو قرآنی تعلیمات کا عملی نمونہ بناتے ہیں۔

اس نظریہ کی تدوین میں وہ منفرد ہیں۔ اگر ایک دماغ اس فکر پر محیط ہو جائے تو وہ آج بھی قرآنی تعلیم کو دنیا کی بین الاقوامی رہبری میں امام سمجھ سکتا ہے۔ اور یہ بھی مان لے گا کہ دوسرا کوئی پروگرام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی روح یہی مسئلہ ہے جسے بحمدہٖ تعالٰی اس سیاحت میں ہم بخوبی سمجھ سکے۔

امام ولی اللہ کی سیاست کا تعارف کرانے کیلئے بیتابی

میں بیرونی سیاحت کے آخری بارہ سال مکہ معظمہ میں مقیم رہا۔ اس وقت سیاسی جھگڑوں سے دور محض اپنے تجربات کا جائزہ لیتا رہا۔ امام ولی اللہ کے مقرر کردہ نصب العین

پر ہند کے لئے اپنا پروگرام سوچتا رہا۔ شمال مغربی ہند جو ہمارا موطن ہے اسی کو اپنا میدان عمل سمجھ کر ایسی پارٹی بنانے کے فکر میں منہمک رہا جو امام ولی اللہ کی حکمت کو اساس مانتی ہو۔ جس طرح پہلے زمانہ میں اتحاد اسلام کے لئے ''شرعی قانون'' پر اجتماع سوچتے تھے اب حکمۃ اور فلسفہ پر انسانیت کا اجتماع زیر غور ہے۔

قرآن عظیم کی تفسیر پر نظر ثانی

امام ولی اللہ کے بتلائے ہوئے نمونہ پر جس طرح امام عبدالعزیز نے اپنے زمانہ کی ذہنیت کا لحاظ کر کے ''فتح العزیز'' لکھی۔ انہیں کی اتباع میں مَیں نے اپنی تفسیر پر نظر ثانی شروع کر دی۔ قرآن عظیم کے عموم کو جس قدر احادیث سے مقید کیا گیا ہے اب وہ عموم کی مثالیں بن گئیں۔ بہت سی اسرائیلیات جو غلطی سے بعض ائمہ محدثین کی کتابوں میں داخل ہو گئی تھیں وہ سب پاش پاش ہو گئیں۔ پہلے مرحلہ میں جو مقامات بیس سال تک سمجھ میں نہیں آئے تھے اور اس لئے طالب علموں کو کبھی بحث کی اجازت نہیں دیتا تھا' وہ مشکلات بفضلہ تعالیٰ سب حل ہو گئیں۔ تفسیر کے مطالعہ کے لئے کافی سامان ملتا رہا۔ اور اس مقدس مقام کی برکت بھی شامل حال رہی۔ اہل علم سے مذاکرات ہوئے' جو لوگ ہماری طرح مشکلات سے دوچار ہو چکے تھے۔ وہ ہمارے مطالعہ کی بہت قدر کرتے رہے۔ ان میں موسیٰ جار اللہ آفندی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ہمارے مطالعہ کی ضرورت دوسری نسل محسوس کریگی

ہند سے باہر کے اہل علم دیوبندی دہلوی استادوں کی تقلید نہیں کر سکتے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے ہم عصر علماء تو زیادہ تر سمجھ بھی نہیں سکیں گے۔ ایسا ہی جن احباب نے ہم سے

پہلے ترجمہ قرآن پڑھا ہے وہ بھی نہیں مانیں گے۔ مگر ان کی اولاد اس کی قدر کرے گی۔ اور ہندوستانی نوجوان جو کالجوں سے نکلے گا اسے بہت زیادہ ضرورت ہو گی۔ اسے اسلامی تعلیمات کا راستہ صاف نظر آ جائے گا۔

ہمارے نظریہ میں ایک خاص امتیاز ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے توسط سے قومی قانون بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہم اپنے تمام افکار اور اپنی تاریخ' اپنے مرکز شاہجہان آباد سے لیتے ہیں۔ دوسری قوموں کے علوم و تجارب سے ہم دوسرے درجہ پر استفادہ کرینگے۔ اس کا پہلا فائدہ ہمیں یہ ملتا ہے کہ ہماری قومیت میں اور ہمارے مذہب میں تعارض پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح ہم عام مسلمان اقوام کے پہلو بہ پہلو بآسانی چل سکتے ہیں۔

مولوی حبیب اللہ سلمہٗ اس وقت دیوبند سے فارغ ہو کر ہمیں مکہ معظمہ میں ملا۔ ہم نے اسے حجۃ اللہ پڑھانا شروع کر دی۔ ہم دعا کرتے رہے کہ کاش یہی نوجوان ہمارے اساتذہ کے متبعین تک ہمارے مطالعہ کی بھنک پہنچا دے۔

ہم اپنے پرانے سیاسی فکر کی تبدیلی پر مجبور ہو چکے تھے یہی تبدیلی ہماری واپسئ وطن کا ذریعہ بنی

مکہ معظمہ میں ہماری زندگی نئے اسلوب پر شروع ہوئی تھی۔ ہم پرانے پروگرام کی شکست' ترکی کے مطالعہ کے بعد مان چکے تھے۔ ترکی تجدید کی حقیقت سے بقدر ضرورت ہم ماسکو میں واقف ہو چکے تھے۔ ہم اپنے اساسی افکار جو ''حجۃ اللہ البالغہ'' سے ماخوذ تھے ہم انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم دوسری مسلم اقوام کی طرح اپنے لئے نیا پروگرام بنانا چاہتے تھے۔ اس میں ہند کی تاریخ اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا فلسفہ تو کھپ سکتا ہے۔ لیکن بیرون

ہند کے مراکز سے بے تعلق ہونا ضروری تھا۔ ورنہ مکہ معظّمہ میں ہمارا قیام ناممکن بنا دیا جاتا۔ اس نئے ہمارے طرز تفکر کو بدل دیا۔ ہم ''پین اسلامسٹ'' سے ''ہندوستانی نیشنلسٹ'' بن گئے۔ بلکہ ہم نیشنلزم کے داعی بنے اور شدت سے دعوت شروع کر دی۔ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے باہمی جدال وشقاق سے علیحدہ رہنا اس طرح ہمارے لئے آسان ہو گیا۔

اگرچہ ہندوستانی نیشنلزم ہم کابل میں اختیار کر چکے تھے مگر ہمارے ہندوستانی دوست عموماً اس سے واقف نہیں ہو سکے تھے۔ یا اسے ہمارے عذر پر محمول کر لیتے تھے۔ مگر اب ہماری دعوت سے واقف ہو کر سخت مخالف ہو گئے۔ اسکے بعد جس قدر احباب ہمیں مکہ معظّمہ میں ملے نہ وہ ہم سے مطمئن ہوئے اور نہ ہمارا فکر ان کے توسط سے ملک میں پہنچ سکا۔

ہمارا خیال ہے کہ ہماری اس تبدیلی سے متاثر ہو کر ہی برطانوی گورنمنٹ نے ہمیں واپسیٔ وطن کی اجازت دی۔ ہم نے اپنے فیصلہ سے ان تمام شرائط کی پابندی اپنے لئے لازمی قرار دے لی تھی۔ جو ایسے موقعہ پر ہر گورنمنٹ ضروری سمجھتی ہے۔

ہم نے واپسی کے بعد اپنی پوزیشن بہ لطافت دوستوں کو سمجھائی۔ اور جو اس طرح سمجھنا نہیں چاہتے تھے وہاں ہم نے سختی بھی اختیار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ پانچ سال سے ہم بحمدہٖ تعالیٰ وطن کی قدرتی برکات سے مستفید ہو رہے ہیں مگر ہمیں سمجھنے والے دوست انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

بیت الحکمۃ کی حقیقت

اس حالت میں ہم نے اپنے افکار انہی تین علمی، سیاسی مسائل میں منحصر کر دیئے ہیں جن کی اہمیت ہم سب سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔

(۱) امام ولی اللہ دہلوی کی حکمۃ اور سیاست کا تعارف۔

(۲) اس فلسفہ سیاست کی بنیاد پر انڈین نیشنل کانگریس میں مستقل پارٹی کی تاسیس۔

(۳) ڈومینین اسٹیٹس جس قیمت پر ملے حاصل کرکے برٹش کامن ویلتھ میں اشتراک۔

عجیب بات ہے کہ پہلا مسئلہ جسے ہم اپنی جماعت کیلئے بدیہیات میں مانتے تھے وہی سب سے زیادہ محل توجہ ومحل تعجب بن گیا۔ یہاں تک کہ دیوبند کے متعلق علمی مرکزوں میں سیاسی رہنما پوچھتے ہیں۔ کیا شاہ ولی اللہ یا مولانا شیخ الہند کوئی سیاسی مسلک بھی رکھتے تھے؟ ہم نے اس جہالت یا تجاہل کو دور کرنے کیلئے خاص جماعتیں بنائیں۔ بیت الحکمۃ کے نام سے انہیں ایک سلسلہ میں منسلک کردیا۔ اور مرکزی بیت الحکمۃ جامعہ ملیہ دہلی میں بنایا۔

بیت الحکمت کے دو تین سال کام سے ہمیں اس فلسفہ کے پڑھانے والے استاد بھی مل گئے۔ اور ہم فکر دوست بھی بڑھنے لگے۔

دوسرے اور تیسرے اصول کے متعلق اس وقت ہم یہی بتلا سکتے ہیں کہ ہمارا پارٹی نظام سندھ اسمبلی میں نمودار ہوگا۔ ہمارا یہ کام بڑھ رہا ہے مگر بہت آہستہ آہستہ۔

محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج کی ضرورت

بیت الحکمت کی حقیقت سے واقف ہونے کے بعد کالج کی اسکیم بآسانی ذہن نشین ہوسکتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بیت الحکمت کے لئے طالبعلم ملیں اور بکثرت ملیں۔ جن میں یہ تین صفتیں ضرور ہوں۔

(۱) وہ فلسفہ سے مناسبت رکھتے ہوں۔

(۲) وہ آج کے انقلابی یورپ کو سمجھنے کی استعداد رکھتے ہوں۔

(۳) وہ شاہجہان آباد کے تاریخی علوم بھی پڑھ چکے ہوں (وہی علوم دارالعلوم دیوبند کا نصاب ہیں) تاکہ امام ولی اللہ اور ان کے مشائخ کی اصطلاح کو صحیح طور پر سمجھ

سکیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کی نئی پرانی تعلیم گاہیں اس قسم کے طالب علم مہیا نہیں کر رہی ہیں اس لئے ہمیں بیت الحکمت کی تعمیر کیلئے اس قسم کی تعلیم گاہ کا خود ہی اہتمام کرنا ہو گا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس ضرورت کو لاہور میں اپنا مخصوص کالج کھولے بغیر پورا نہیں کر سکتے۔

محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج کیلئے لاہور (کا) کیوں انتخاب کیا گیا

ہندوستانی مسلمانوں کے دوسرے مراکز سے لاہور کو ہم محض اس لئے مقدم سمجھتے ہیں کہ

(۱) فعال مسلمانوں کا نوجوان عنصر لاہور میں زیادہ ملتا ہے۔

(۲) پنجاب یونیورسٹی اپنے ابتدائی زمانہ سے اورنٹیل افکار و علوم کی مربیّ بنی رہی ہے اس لئے ہمارا فکر یہاں زیادہ نشو و نما پا سکتا ہے۔

(۳) لاہور میں مختلف اقوام کے مذہبی ادارے اپنے مراکز قائم کر چکے ہیں اس سے حریت مذاہب کی روح اس فضا میں زیادہ ملتی ہے۔ ورنہ اس قسم کے کالج ہم چاہتے ہیں کہ سندھ اور دہلی میں بھی ضرور قائم ہوں۔

محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی لاہور

کالج کی اسکیم سے پہلے سوسائٹی کا قیام ضروری ہے۔ اس سے مختلف شعبہ جات (۱) تھیالوجیکل (۲) ایجوکیشنل (۳) پولیٹیکل نکلتے رہیں گے۔ اور آپس کے جھگڑوں سے بچ کر اپنے اپنے مقصد کی خدمت کرتے رہیں گے۔ اس وقت محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی کا پہلا کام محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج بنانا قرار دیا گیا ہے۔

توکلاً علی اللہ ۱۵ مارچ ۹۴۴ ہندی (۱۹۴۴ء) کو ہم نے اپنے ایک گریجوایٹ رفیق کو محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی لاہور کا سیکرٹری مقرر کر دیا ہے۔ لاہور میں ہمارے بیت الحکمت کی شاخ عرصہ سے قائم ہے اور ابھی تک ابتدائی حالت میں ہے۔ اس نے محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی کا مرکز بن کر کام کرنا منظور کر لیا ہے۔

(محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی در حقیقت امام ولی اللہ کی تجدید و تحریک کے اس دوسرے دور کی ترجمان ہے جسے ہم دیوبندی سیاسی تحریک کہتے ہیں۔ یہ دوسرا دور بالا کوٹ کے حادثہ کے بعد ان کی دختری اولاد الصدر الحمید مولانا محمد اسحٰق اور الصدر العمید مولانا محمد یعقوب کی صدارت سے منظم ہو کر ترکی خلافت کے منسوخ ہونے تک جاری رہا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے اتباع میں ہم اس تحریک کو نوجوان تعلیم یافتہ کے مزاج سے مناسب بنا کر تیسرا دور شروع کرتے ہیں۔ ہماری اصطلاح میں محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی اس تیسرے دور کا نام ہے)۔

یہ ہے ہماری دعا کا خلاصہ: اللھم تقبل منا انک انت السمیع العلیم ٥

مابدیں منزل عالی نتوانیم رسید۔ ہاں مگر لطف شماپیش نہد گامے چند

(ترجمہ: ہم از خود اس بلند منزل تک نہیں پہنچ سکتے ہاں مگر اے رب تیرا لطف و کرم کچھ دور تک ہماری رہنمائی کرے۔)

عبید اللہ سندھیؒ

۲۴ مارچ ۹۴۴ ہندی قاسم العلومؒ لاہور۔

(تھیالوجیکل کالج کا نصاب اور اغراض ومقاصد)

ہماری تجویز کا دوسرا اہم حصہ ہے۔محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج کا:۔

(الف) نصاب ودستور العمل۔

(ب) اس کا مقصد ونتیجہ۔

کالج کا نصاب ودستور العمل

(کالج کا رتبہ)

(۱)

محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج کو ہم یورپ کے اول درجہ کے کالجوں کا ہم رتبہ بنانا چاہتے ہیں۔اس قسم کے کالج ہم دیکھ چکے ہیں جو سلاطین عثمانیہ نے باسفورس کے کنارے پر بنائے ہیں ظاہر ہے کہ اس تحریک کو اپنی تکمیل میں لمبا وقت درکار ہوگا۔ہمارا کام فقط یہ ہے کہ ہم اس وقت اسے شروع کر دیتے ہیں۔انتظار نہیں کرتے۔

(شرائط داخلہ)

(۲)

محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج کیلئے داخلہ کا خاص امتحان ہوگا۔

(الف) ایسے میٹرک پاس طالب علم کو ترجیح دی جائے گی جس کی دوسری زبان عربی ہو۔

(ب) نوجوان مسلمانوں کا وہ فرقہ جو اپنے وطن سے وابستہ رہ کر صحیح معنی میں اسلام سیکھنا چاہتا ہے۔ ہمارا کالج اس قسم کے نوجوانوں کو آئیڈیا اور پروگرام بنانے میں بہترین رہنما ثابت ہوگا۔

(ج) ایسے نوجوان جو اتحاد اسلام یا انٹرنیشنل ازم کو وطنی تحریک سے پہلے شروع کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارے بیت الحکمت میں تو شامل ہو سکتے ہیں لیکن اس کالج میں قبول نہیں کیے جائیں گے۔

(د) ضرورت مند طالبعلموں کو دارالعلوم دیو بند کی طرح امداد دی جائیگی۔ کورس چھ سال کا ہے۔ مگر جو محنتی طالب علم تھوڑے وقت میں اپنا کام پورا کرلیں گے۔ ان کا خصوصی امتحان لے کر سند دی جائیگی۔ تمام طالب علموں کو دارالاقامۃ میں رہنا ضروری ہے۔

(سیاسیات کی تعلیم)

(۳)

سیاسیات کی مکمل تعلیم دی جاسکتی ہے۔ مگر کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنائی جائے گی۔ خصوصی اجازت کے سوا کسی سیاسی مظاہرہ میں شرکت ممنوع ہے۔

(تاریخ اسلام ہند)

(۴)

مسلمانوں کی اجتماعی تاریخ کا ہندوستانی حصہ جو سات سو سال تک جاری رہا ہے۔ جس میں ائمہ دین، صوفیائے کرام، سلاطین عظام، شعراء کرام، عوام کے ساتھ مل کر کام

کرتے رہے ہیں۔ وہ ہمارے کالج کورس کا آئیڈیل حصہ ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہمارے نوجوان کی ذہنیت قومی تاریخ سے منقطع ہوگئی تو وہ اپنی ہستی سنبھال نہیں سکے گا۔

(خاص طور پر یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ عربوں کی تاریخ کا بہترین حصہ بھی سات سوسال سے زیادہ نہیں ہے)۔

(الف) ہم ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ ۱۰۰۱ء عیسوی سے شروع کرتے ہیں۔ اس سال سلطان محمود غزنوی نے "ہنڈ" کا قلعہ یعنی ہند کا پہلا قلعہ فتح کیا۔ اور ایک نو مسلم راجہ کو اس کا حاکم بنایا۔ اسلامی انٹرنیشنل ازم کی تاثیر سے ہمارے وطن کی یہ شاندار ترقی اور اس کا اجتماعی دور سات سوسال تک جاری رہا۔

(ب) اس کی آخری کڑی وہ اولوالعزم سلطان ہے:۔

(۱) جو پچاس سال تک سارے ہندوستان کو ایک قانون کا تابع بنانے میں کامیابی سے مصروف رہا۔

(۲) جو ساری دنیائے انسانیت کو اپنا پیغام نجات (فلسفہ امام ربانی مجدد الف ثانی) پہنچانا چاہتا تھا۔

وہ خاتم السلاطین سلطان محی الدین اورنگزیب عالمگیر ہے۔ وہ ۱۷۰۷ء میں فوت ہوئے۔

(ج) جو مؤرخ پہلے دور ہند کا مہاراجہ اشوکا کو اور دوسرے دور میں سلطان عالمگیر کو مفاخرِ ہند میں شمار نہیں کرتے۔ ہم انہیں ہندوستانی نہیں مانتے۔

(د) اس نئی ہندی تاریخ کی جنتری بنانے کیلئے ہم مہینے اور تاریخیں انگریزی تقویم سے لیتے ہیں۔ انگریزی سنین سے پہلا ہزار حذف کرنے پر ہماری ہندی تقویم بن جائے گی۔

(دارالعلوم دیوبند کا نصابِ تعلیم کالج میں کیوں رکھا جاتا ہے)

(۵)

ہم جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کا نصاب شاہجہانی دور کا بقیہ صالحہ ہے' اس لئے ہم اس کی حفاظت پر زور دیتے ہیں۔

(الف) مگر ہم اپنے زمانہ کی ترقی یافتہ تحریکوں کے مطالعہ کے لئے حاشیہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اردو' عربی' انگریزی کی بہترین کتابیں مطالعہ کے لئے جمع کی جائیں گی۔

(ب) اس کے لئے ممکن ہے ہمیں وقت میں قدرے اضافہ کرنا پڑے گا۔ ہمارے خیال میں اس اہم معاملہ میں وقت کا سوال دوسرے درجہ پر آتا ہے۔

(حنفی فقہ کالج کورس میں کیوں لازمی بنائی گئی)

(۶)

ہند میں اسلامی تاریخ کے ابتداء سے حنفی مذہب ہی ''قانونی تنظیم اور انصاف'' میں سلاطین کا رہنما بنتا رہا۔ یہاں تک کہ سلطان عالمگیر نے اسے ہند کا قومی قانون بنا دیا جو اس کے بعد بھی پچاس سال چلتا رہا۔ نادر شاہ کے حملہ پر وہ نظام مختل ہوا۔

(الف) اس لئے ہم ہندی قانون کو حنفی فقہ میں متعین کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ امام ولی اللہ نے علمِ حدیث کی تجدید سے ہمارا راستہ آسان کر دیا ہم حنفی فقہ اور صحیح حدیث کو جمع کر سکتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند اس تطبیق کا بے نظیر مرکز ہے۔

(ب) فقہ حنفی جیسے حدیث صحیح سے تطبیق پا سکتی ہے۔ اس کے اندر عقلی نظام قانون بھی پورا موجود ہے۔

حکمۃ الامام ولی اللہ تاریخ اسلامی ہند کی روح کا خلاصہ ہے

(۷)

ہم جانتے ہیں کہ امام ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کے مؤسس (بانی) ان کے والد شیخ عبدالرحیم بن وجیہ الدین العمری اور ان کے چچا شیخ ابوالرضا محمد بن وجیہ الدین ہیں۔

(الف) امام ولی اللہ نے ''انفاس العارفین'' میں ان کے علمی افادات جمع کر دیئے ہیں۔ اور اپنی حکمت کے استنباط کا نمونہ بھی تحریر کر دیا ہے۔

(ب) شاہ عبدالرحیم اور شیخ ابوالرضا عالمگیری دور کے اکابر میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم امام ولی اللہ کی حکمۃ کو عالمگیری دور کا نتیجہ مانتے ہیں۔ اگر چہ اس کی تدوین محمد شاہی دور یعنی زوال دہلی کے بعد شروع ہوئی۔

(ج) ہم اس کالج کے ذریعہ سے حکمۃ الامام ولی اللہ کو ہندوستانی مسلمان کی قومی عقلیت کا منبع بنانا چاہتے ہیں۔ واللہ المستعان.

کالج کے درجات ثلثہ

(۸)

محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج کے درجات تین ہیں (۱) ابتدائی (۲) متوسط (۳) اعلیٰ۔ ہر ایک درجہ کی تعلیم مکمل کرنے پر سند مل سکتی ہے۔

پہلا درجہ

(۹)

پہلے دو سال میں طلبہ دارالعلوم دیوبند کی تمام کتابیں اردو میں پڑھیں گے۔

(الف) منطق، فلسفہ، فقہ و اصول فقہ، معانی و بیان، حدیث و تفسیر ہر قسم کی کتابیں اردو میں پڑھ کر باقاعدہ امتحان دینا ہوگا۔

(ب) اس کے ساتھ ایک گھنٹہ عربی سیکھنے کیلئے اور ایک گھنٹہ انگریزی زبان کا لازمی ہوگا۔

(ج) مولانا محمد قاسم کی تقریر دلپذیر وغیرہ پڑھائی جائیں گی۔ ان کے معاصرین کی بہترین کتابیں مطالعہ میں رہیں گی۔

دوسرا درجہ

(۱۰)

دوسرے درجہ میں یہ تمام کتابیں عربی میں پڑھائی جائیں گی۔ اس سے طلبہ اس قابل ہو جائینگے کہ ان کتابوں کے شروح و حواشی سے استفادہ کر سکیں۔ محققین فنون اور ائمہ سے ان کا تعارف ہوگا۔

(الف) اس کے ساتھ ایک گھنٹہ جدید عربی سیکھنے کیلئے اور ایک گھنٹہ انگریزی کا روزانہ لازمی ہوگا۔

(ب) اگر طالبعلم پسند کرے تو اس درجہ کے آخر میں مولوی فاضل کا امتحان دیکر بی۔ اے کی ڈگری لے سکے گا۔

(ج) اس زمانہ کے عرب مفکر جو کچھ لکھتے ہیں ان کی بہترین کتابیں اور انگریزی میں اسلامی تحریکوں کے متعلق جو اچھی کتابیں مل سکتی ہیں۔ مطالعہ کے لئے جمع کی جائیں گی۔

تیسرا درجہ

(۱۱)

اس میں بیت الحکمت کا نصاب شروع ہوگا۔

(الف) حجۃ اللہ البالغہ۔ ازالۃ الخفاء۔ فتح الرحمٰن۔ الفوز الکبیر۔ المصفی۔ المسوی۔ تکمیل الاذہان، فقہ وحدیث کے متفرق رسائل۔

(ب) سطعات۔ عبقات۔ لمحات۔ ہمعات۔ تاویل الاحادیث۔ خیر کثیر۔ بدور بازغہ۔

(ج) امام عبدالعزیز کی تمام کتابیں، مولانا رفیع الدین۔ مولانا محمد اسماعیل شہید۔ مولانا محمد قاسم کی تمام کتابیں۔

(د) انگریزی زبان کے توسط سے یورپ اور ہند کے مختلف فلاسفروں کی تعلیمات کا مطالعہ اور مقابلہ

یہ حصہ بھی دو سال میں پورا ہوگا۔

مقصد اور نتیجہ

(۱۲)

اس کالج سے فارغ ہونے والے طلبہ محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی کے ساتھ عمر بھر کے لئے وابستہ رہیں گے، الّا بالاجازت۔

سوسائٹی، طلبہ کو دو حصوں میں تقسیم کرے گی۔

پہلا حصہ

(۱۳)

وہ اساتذہ ہیں جو قرآن عظیم اور اس کے ساتھ ادیان عالم کی تعلیمات کو فطرت انسانیہ کے عقلی اساس سے تطبیق دے کر پڑھانے کے لئے دنیا کی تعلیم گاہوں میں پھیل جائیں گے۔

(الف) ہم امید کرتے ہیں کہ محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج کے فلاسفروں کیلئے ہندو، کرسچین، نیچرل کالجوں میں بھی فلاسفی کی چیئر اعزازی طور پر محفوظ رہے گی۔

(ب) ہم اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں۔ کہ ہمارے اساتذہ دنیا کے متدین عقلمندوں کو شاہجہان آباد میں مجتمع الادیان کی دعوت دینے میں کامیاب ہوں گے۔ یورپ سائنس اور صنعت کی ترقی میں اگر لادینی اجتماع پیدا کرتا ہے۔ تو شاہجہان آباد انسانی نظر و فکر کو دینی اجتماع میں منظم کر دیتا ہے۔ اس نقصان کا اس سے انجبار ہو جائے گا۔ محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی سائنس کی ترقی میں یورپ کو اپنا مرکز قبول کرتی ہے۔

دوسرا حصہ

(۱۴)

سوسائٹی کالج کے ان استادوں کو جو سیاسیات سے دلچسپی رکھتے ہیں اس دوسرے حصہ میں جمع کرے گی۔

(الف) کالج سے فارغ ہونے والے سیاسی ماہر محمد قاسم ولی اللہ کے نام سے ایک نئی سیاسی پنچایت بنائیں گے۔ وہ ہند کی مرکزی طاقت اس پارٹی کو دلائے گی۔ جو امام ولی اللہ کے اصول پر انسانیت کی خدمت کو اپنا نصب العین بنائے گی۔

(ب) یہ پارٹی انڈین نیشنل کانگریس کے اندر کامل مستقل پارٹی کے طور پر کام کرے گی۔

(ج) طبقہ علماء ان سیاسیین کی رہنمائی میں خدمتِ خلق کی جماعتیں بنائیگا۔ ملک کے ادنیٰ طبقہ کو مذہبی اور سیاسی تعلیم دے گا۔ ان کے اقتصادی حالات کو درست کرنے کے لئے کواپریٹو سسٹم جاری کرے گا۔

(د) ادنیٰ طبقہ کو ووٹ کی قیمت سمجھائے گا۔ اور کسی پارٹی کو ان کے ووٹ سے ناجائز فائدہ حاصل نہیں کرنے دے گا۔

(ہ) اس حصہ میں سیاسی رہنمائی انہی سیاسیین کے لئے مخصوص رہے گی۔ جو یوروپین ممالک میں زندگی بسر کر چکے ہیں۔

واللہ المستعان. وصلی اللہ علی سید المرسلین وعلی الہ و اصحابہ اجمعین. وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

عبید اللہ سندھیؒ

۲۲ مارچ ۱۹۴۴ھ ہندی قاسم العلوم لاہور۔

مقالہ نمبر ۲۲

خطبہ صدارت

جمعیت الطلبہ سندھ

۱۷۔اپریل ۱۹۴۴ء

حیدرآباد سندھ

پس منظر

[مارچ 1944ء میں دہلی سے دیوبند لدھیانہ اور قصور ہوتے ہوئے مولانا لاہور پہنچے تو آپ کی صحت خراب ہو چکی تھی۔ لاہور کے قیام میں اسہال کی شکایت بہت بڑھ گئی۔ علاج ہوا لیکن چونکہ مولانا اپنے زیرِ تجویز کاموں کی فکر میں جسم اور دماغ کو بیماری میں بھی آرام نہ لینے دیتے تھے' اور عمر کے ساتھ ساتھ اس سلسلہ میں آپ کی بے تابی اور اضطراب اور بڑھتا جاتا تھا۔ اس لیے علاج سے چنداں فائدہ نہ ہوا۔

اسی زمانہ میں سندھ کے عربی طلبہ نے حضرت مولانا کو جمعیت الطلبہ کے اجتماع کی صدارت کے لیے باصرار بلایا۔ مولانا باوجود صحت کی خرابی کے حیدر آباد پہنچے اور نوجوان طلبہ کو خطاب فرمایا۔ جمعیت الطلبہ سندھ کا یہ اجلاس ۱۷ اپریل 1944ء کو منعقد ہوا تھا۔ حضرت مولانا سندھیؒ نے یہ خطبہ سندھی زبان میں دیا' آپ بولتے جاتے تھے' اور بعض نیازمند شاگرد اسے لکھتے جاتے تھے' بعد میں اس خطبہ کو ایک پمفلٹ کی شکل میں چھاپ دیا گیا' مولانا کے ایک شاگرد شیخ الصدیق ابوسعید عبدالمجید سندھیؒ نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے' جو پیش خدمت ہے]

خطبۂ صدارت

نحمده ونصلی علٰی رسوله الکریم۔

اما بعد: میں سولہ برس کا تھا' اور اردو میں میٹرک کے درجہ تک تعلیم پا چکا تھا کہ میں مسلمان ہوا۔ مجھے کلمۂ توحید حضرت حافظ محمد صدیق قدس سرہ' بھر چونڈی والوں نے پڑھایا۔ حضرت میرے لئے ماں باپ کی بجا تھے' اور ماں باپ کی طرح میرے مربی بنے۔ ان کی دعا کی تاثیر سے میں اپنے اندر بڑی برکتیں محسوس کرتا ہوں۔ میں نے کتنی ہی غلطیاں کی ہوں گی۔ لیکن حضرت حافظ صاحب کی دعا کی برکت سے مجھے خدا تعالیٰ نے ان کے شر سے بچالیا۔ میں اپنے آپ کو حضرت صاحب کی جماعت کا ایک فقیر سمجھتا ہوں۔ ان کی دعا سے میں طالب علمی کرتے کرتے حضرت مولانا شیخ الہند ؒ کی خدمت میں پہنچا۔ اور ان کی جماعت کا ایک طالب علم بن سکا۔ میری حیثیت حضرت مولانا شیخ الہند ؒ کی جماعت کے ایک طالب علم سے زیادہ نہیں۔

میرا علمی تعلق بنیادی طور پر حضرت مولانا شیخ الہند سے ہے۔ میرے استاد مولانا محمد قاسم قدس سرہ' کے شاگردوں میں ایک خاص مرتبے کے مالک تھے۔ میں اپنے استاد کا یہ مرتبہ پہچانتا ہوں۔ اور میری کوشش یہ ہے کہ حضرت کے اس مرتبہ کو زندہ رکھوں۔ ان کو حضرت مولانا محمد قاسم ؒ کے واسطہ سے جو علم بطور وراثت کے امام ولی اللہ قدس سرہ' سے ملا تھا۔ خدا کے فضل سے مجھے اس کی بہت کچھ سمجھ حاصل ہے۔ میری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ یہ علم ہندوستان کے مسلمانوں میں بالعموم اور دہلی اور جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے اور صوبہ سندھ میں خاص طور پر محفوظ ہو جائے۔

(مسئلہ توحید)

قرآن شریف کے معانی و مطالب کو سمجھنا' میری طبیعت کو سب سے زیادہ رغبت اس موضوع علم سے رہی ہے۔ اور چونکہ قرآن شریف کی تعلیمات میں سب سے اہم مسئلہ توحید کا اثبات اور شرک سے انکار ہے۔ اس لیے مجھے اس مسئلہ سے خاص دلچسپی تھی۔ میں نے اسلام کا اعلان کرنے سے پہلے اس سلسلہ میں خود گھر میں جو مطالعہ کیا تھا' اس میں یہی بات مجھ پر ظاہر ہوئی تھی کہ اسلام ہی دراصل توحید کی صحیح تعلیم دیتا ہے۔ اور اسی بناء پر میں نے اسلام کو دوسرے مذاہب پر ترجیح دی تھی بے شک ہندو مذہب' عیسائیت اور یہودیت کی طرح پُرانے زمانے میں سچائی کا مالک تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس میں اب شرک مل گیا ہے۔ آپ کو اگر ہندو مذہب کی حقیقت معلوم کرنا ہو تو حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے مکتوبات پڑھیئے جو ''کلماتِ طیبات'' نام کی کتاب میں آپ کو ملیں گے۔

قرآن شریف کی تعلیمات کے اصل اصول یعنی اس مسئلۂ توحید کو صحیح طرح سمجھنے میں مولانا شاہ اسماعیل شہید کی کتاب ''تقویت الایمان'' نے میری رہنمائی کی تھی۔ چنانچہ میں حضرت مولانا شہیدؒ کو شروع ہی سے اپنا ہادی اور مرشد مانتا آیا ہوں۔ بعد میں جب میں نے مسئلۂ توحید کے متعلق اپنا مطالعہ بڑھایا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس توحید کے مسئلہ کے ضمن میں مسلمانوں میں وہابی اور غیر وہابی کا جھگڑا بڑے زوروں پر چل رہا ہے۔ مجھے مسلمانوں کا یہ اختلاف پسند نہ آیا۔ اور اس کا حل آخر میں نے یہ ڈھونڈا کہ میں قادری طریقے کا ایک فقیر ہوں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کی کتاب ''فتوح الغیب'' کو مانتا ہوں۔ اس میں توحید کا مفصل بیان ہے اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی اس کتاب کو وہابیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اب اگر میں توحید کو سمجھانے کے لیے ''فتوح

الغیب'' کو اپنے لئے مرکزی اور اساسی کتاب بناتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سندھ سے مسئلۂ توحید کے ضمن میں وہابیت کا سوال گم ہو جائے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے اس طرز فکر سے سندھ کی پوری سرزمین سے یہ ناگوار بحث ختم ہوگئی' لیکن اتنا تو ضرور ہوا کہ میرے ساتھیوں اور میرے ساتھ کام کرنے والوں میں وہابی اور غیر وہابی کا جھگڑا زور نہ پکڑ سکا۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی کتاب ''فتوح الغیب'' کو بڑی محبت سے پڑھتا ہوں۔ اور مولانا محمد اسماعیل شہید کی کتاب ''تقویت الایمان'' کو اس کا ترجمہ سمجھتا ہوں۔

(حضرت شیخ الہندؒ سے مسئلہ جہاد سیکھا)

اسلام کے اصل اصول مسئلہ توحید کے بارے میں تو میرا یہ مسلک ہے' جو ابھی بیان ہوا۔ اپنے استاد حضرت شیخ الہند سے ہم نے جو خاص باتیں سیکھی ہیں' ان میں سے ایک اہم چیز جہاد کا مسئلہ ہے۔ ہماری طالب علمی کے زمانہ میں اس ملک میں بڑی بحثیں ہو رہی تھیں۔ علی گڑھ پارٹی جہاد کے معنی نئے طریقے پر کرتی تھی۔ اور اس سلسلہ میں ایسے شبہات لاتی تھی جن کا جواب دینا آسان نہ تھا۔ خدا کے فضل سے ہمیں حضرت شیخ الہند کی صحبت کے فیض سے اس مسئلہ میں پورا اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ علی گڑھ کے طلبہ سے اس معاملہ میں اگر ہماری گفتگو ہوتی تو ہم انہیں جہاد کا مقصود اصلی صحیح طرح سمجھا سکتے تھے۔

(ہماری علمی سرگرمیوں کے تین مقاصد)

(۱) قرآن مجید کا ترجمہ (۲) فتوح الغیب کی توحید اور (۳) جہاد اپنے اصلی معنوں میں۔ یہ تھا ہمارا مقصد' جس پر ہم نے اپنی علمی سرگرمیوں کا مدار رکھا۔ امروٹ (ضلع

سکھر) میں ہم یہی چیز پڑھاتے رہے۔ مسئلہ جہاد کی توضیح اور اس کی عملی تعبیر کے لیے ہمیں امام ولی اللہ، امام عبدالعزیز اور شاہ اسماعیل شہید اور ان کے ساتھیوں کی تاریخ اور ان کے حالات پڑھانے کی ضرورت پڑی۔

بات یہ تھی کہ جہاد کو محض عقلی طور پر سمجھا دینا ہمارے نزدیک کافی نہ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ طلبہ کے سامنے اس کا عملی طریقہ بھی پیش کریں۔ اور سب جانتے ہیں کہ امام ولی اللہ سے لے کر مولانا اسماعیل کی شہادت تک اس خاندان کا جہاد کے واقعات سے خصوصی تعلق رہا ہے۔ ہم نے دیو بند میں زمانہ طالب علمی کے دوران میں اس خاندان والا تبار کے حالات بزرگوں سے سُنے تھے۔ چنانچہ اب جو ہم نے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا تو ہم یہ کرتے کہ پہلے تو قرآن مجید سے جہاد کا مسئلہ طلبہ کو سمجھاتے، بعدہٗ (اس کے بعد) صحیح احادیث سے اس پر روشنی ڈالتے، پھر صحابہ رضوان اللہ علیہم کے حالاتِ زندگی اس بارے میں پیش کرتے۔ اور اس کے بعد امام ولی اللہ کے طریقہ سے احکام جہاد کو منطبق کرتے۔ اور آخر میں طلبہ پر واضح کرتے کہ کس طرح آج کے زمانے میں موجودہ حالات کے مطابق جہاد کا حکم قابل عمل ہو سکتا ہے۔

(توحید اور جہاد)

توحید اور جہاد یہ دو چیزیں تھیں جن پر ہم طلبہ کو تعلیم دیتے وقت خاص زور دیتے تھے۔ توحید اور جہاد کی اس طرح تعلیم دینا ہر مسجد اور ہر مدرسہ میں ممکن نہ تھا۔ امروٹ ضلع سکھر میں حضرت مولانا تاج محمودؒ ہمارے لیے مثل باپ کے تھے۔ چنانچہ ہم وہاں آرام واطمینان سے حسب منشا تعلیم دیتے رہے۔ امروٹ میں کچھ عرصہ پڑھانے کے بعد حضرت شیخ الہند نے اپنے کام میں ہمارا درجہ بڑھا دیا۔ اور آپ نے ہمیں سندھ میں کام کرنے کا

ایک اور طریقہ بھی سمجھایا۔ ہم نے ان کے حسب ارشاد کام شروع کر دیا۔ اور کسی سے اس کا ذکر تک نہ کیا کہ ہم یہ کام حضرت شیخ الہند کا بتایا ہوا کر رہے ہیں۔ بظاہر ہم اس کام کو اپنے نام سے کر رہے تھے۔

میرے مشفق بزرگ حضرت صاحب امروٹی کو میرا اس طرح کام کرنا پسند نہ آیا۔ چنانچہ ہم مجبور ہو گئے کہ امروٹ کی بجائے گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدرآباد سندھ میں دارالرشاد کے نام سے ایک مدرسہ بنائیں۔ ہمیں اس مدرسہ کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے میں پورا اختیار تھا۔ اور پیر صاحب گوٹھ پیر جھنڈا کا ہمارے ساتھ فیصلہ ہو چکا تھا۔ کہ وہ ہمارے کام میں بالکل دخل نہ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس عہد کو سچے دل سے نبھایا۔

دارالرشاد میں جب ہم نے اپنے کام کو اچھی طرح سے کر کے دکھایا۔ تو حضرت شیخ الہند نے ہمارا درجہ اور بڑھا دیا۔ اور آپ نے مجھے دیو بند بلوا بھیجا اور یہاں مدرسہ دیو بند کی پالیسی میں ہمارے مشوروں کو سننے لگے۔ اسی زمانے میں حضرت شیخ الہند نے ہمیں جہاد کی حقیقت کا دوسرا بطن سمجھایا۔ عام طور پر جہاد کے لیے یہ شرط ہے کہ مسلمان بادشاہ ہو اور کفار کے مقابلہ کا مسلمانوں میں کوئی امکان نظر آئے تو پھر جہاد فرض ہوتا ہے مگر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں ان کا کوئی بادشاہ نہ رہے۔ اور نہ ان کے ہاں فوجی طاقت موجود ہو تو ان حالات میں جہاد کا حکم کیا موقوف ہو جائے گا؟

حضرت شیخ الہندؒ نے اس مشکل مسئلہ کو ہمیں سمجھایا۔ اور اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا کہ ایسے حالات میں ہر ایک مسلمان پر فرض ہے کہ وہ خود اپنی جماعت بنائے اور جہاد کرے۔ حضرتؒ نے سندھ میں ہمیں اس طرح کام کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ چنانچہ ہم قدرے اس کام سے واقف ہو چکے تھے۔ اور جب ہم سندھ سے دیو بند پہنچے اور جمعیت الانصار کا کام کرنا شروع کیا تو ہمارے پیش نظر حضرت شیخ الہند کا یہی فرمان تھا۔ جہاد کے

متعلق یہ نقطۂ نظر اور اس کے مطابق کام کرنا' یہ ہماری خصوصیت تھی' اور ہم نے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی صحبت میں رہ کر اسے حاصل کیا تھا۔

اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ حضرت کو ہمیں کابل بھیجنے کی ضرورت پڑی۔ وہاں پہلے پہل ہم نے جہاد کے پہلے بطن کو اپنا مقصود بنا کر کام کیا۔ یعنی مسلمان بادشاہ کی موجودگی اور مسلمانوں کی فوجی طاقت کے ہوتے ہوئے جہاد کے حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد حالات ایسے رونما ہوئے کہ ہمیں کابل چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ ہم وہاں سے روس چلے گئے۔ روس کی سیاست کا جو ہم نے مطالعہ کیا تو ہمیں یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ جہاد کا بطن ثانی جو ہم نے حضرت شیخ الہند سے سیکھا تھا۔ یعنی جب مسلمانوں کی حکمران طاقت اور ان کی فوجی قوت موجود نہ ہو تو اس وقت ہر ایک مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنی جماعت بنائے اور جہاد کرے۔ اسی کو یورپ میں انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں روس یورپ کے انقلاب کا مرکز تھا۔ ہم وہاں سات مہینے رہے۔ اور یورپ کے اس انقلاب کا بڑی اچھی طرح سے مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے دیکھا کہ جہاد کا دوسرا بطن جس کا مکمل بیان حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء میں ہم بار بار پڑھ چکے تھے' اسی کو آج کی اصطلاحی زبان میں انقلاب کہتے ہیں۔ چنانچہ اب میں ایک انقلابی ہوں۔

میں اپنے اس انقلاب کو اپنے وطن میں کامیاب کرنے کے لیے نیشنل کانگریس کے اندر اپنی ایک مستقل پارٹی کی بنیاد ڈال چکا ہوں۔ جب ہم وطن سے باہر تھے تو ہماری اور حیثیت تھی۔ لیکن جب سے ہم وطن واپس لوٹے ہیں ہم اپنے باہر کے رفقاء سے قطع تعلقات کر چکے ہیں۔ اب ہماری ساری کوشش یہ ہے کہ ہم اپنے اس فکر کا حضرت شیخ الہند کی جماعت میں سے جو آگے بڑھنے والے نوجوان ہیں ان سے تعارف کرا دیں۔ لیکن

کانگریس کے اندر رہ کر کام کرنے کی اس دعوت سے کوئی یہ دھوکا نہ کھائے کہ ہم نیشنل کانگریس میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح گاندھی جی کے تابع ہیں۔نہیں۔نیشنل کانگریس کے اندر ہمارے کاموں اور خدمات کی ایک مستقل حیثیت ہے۔ گاندھی جی کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ان کاموں پر روشنی ڈالنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ہمارا اور گاندھی جی کا اس سلسلہ میں صرف ایک معاملہ میں اشتراک ہے اور وہ عدم تشدد کا مسئلہ ہے۔لیکن اس میں بھی ہمارے اور گاندھی جی کے درمیان فرق ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی تشدد کرنے کے روادار نہیں۔مگر ہم جب ضرورت ہوتو اس امر کا اعلان کر کے تشدد کرنے کے حق میں ہیں۔

شروع شروع میں عدم تشدد کے اپنے اس فکر کو بے شک ہم گاندھی جی کا اثر مانتے تھے مگر بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ معظّمہ کے زمانہء قیام میں عدم تشدد کے پابند تھے۔دراصل امام ولی اللہ کی تحقیقات نے ہماری اس مسئلہ میں رہنمائی کی ہے۔ چنانچہ اب ہم عدم تشدد کی دعوت دیتے ہیں' تو ظاہراً و باطناً ہم فقط امام ولی اللہ کے اتباع کی دعوت دے رہے ہیں۔جس طریقہ پر یورپین اقوام نے اپنا انقلاب منظم کیا' اسی طریقہ پر میں امام ولی اللہ کی دعوتِ انقلاب کو منظم کروں گا۔

روس کے انقلاب کی دو مرکزی شخصیتیں تھیں۔ کارل مارکس اور لینن۔مَیں نے اپنی انقلابی دعوت کے لیے امام ولی اللہ اور امام محمد قاسم دو امام چنے ہیں۔ انقلابِ روس لادینی ہے اور میرا انقلاب امام ولی اللہ کی تعلیمات کا عین خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

انقلاب ایک دن میں تکمیل پذیر نہیں ہوا کرتا۔ انقلاب کا کام درجہ بدرجہ ہوتا ہے۔ اس وقت ہم فقط انقلابی فکر کا تعارف کراتے ہیں۔ دیو بند میں علماء کی ایک بڑی جماعت ہے' جو جہاد کے مسئلہ میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ ہم فکر نہیں۔ہم ان کے علم و

تقویٰ کی تو عزت کرتے ہیں۔لیکن ہم ان کے کاموں کو اپنے لیے قابل تقلید نہیں مانتے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ماننے والے اور ہم فکر علماء کے بھی دیو بند میں دو حصے ہو گئے ہیں۔ایک تو اس امر کا منتظر ہے کہ کوئی مسلمان بادشاہ جہاد کرے تو ہم اس جہاد میں شریک ہوں۔اس گروہ کو ہم قابل تقلید نہیں مانتے۔حضرت شیخ الہند کے ماننے والوں کا دوسرا حصہ انقلابی ہے ہمارے نزدیک یہ لوگ حضرت کے صحیح قائم مقام ہیں۔

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت مولانا شیخ الہند نے جہاد کے معنی انقلاب کے بتائے تھے' تو یہاں ہم اس بات کی قدرے توضیح کر دیتے ہیں۔ہم نے امروٹ میں چار طلبہ کی ایک جماعت بنائی تھی جس کا مقصد جہاد کرنا تھا۔ میں اس جماعت کا امیر تھا۔ یہ جماعت مولانا اسماعیل شہید کے اسوۂ جہاد پر بنائی گئی تھی۔ہم نے اس جماعت کے ساتھ جہاد کا کام شروع کر دیا۔ بعد میں جب ہم دیو بند گئے اور حضرت شیخ الہند سے بسبیل تذکرہ اس کا ذکر ہوا۔تو حضرت قدس سرہٗ نے اس پر بہت اظہارِ مسرت فرمایا اور آپ نے ہمیں خاص اپنی جماعت میں داخل کرلیا۔

اب اوپر کی بات کی ہم تھوڑی سی تفصیل یہاں اور کرتے ہیں۔حضرت شاہ اسماعیل شہید نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ جہاد قائم رکھنا فرض کفایہ ہے۔اگر طاقت کے زور سے جہاد کا قیام ممکن نہ ہو تو شہید ہو کر بھی جہاد کو قائم رکھا جائے۔ یہ ہر ایک مسلمان کے ہاں میسر ہے۔اس کے لیے ایک جماعت بنائی جائے' تو اس جماعت کا سردار منتخب کیا جائے۔ جیسے نماز کے لئے امام کا انتخاب کیا جاتا ہے۔حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کا یہ اشارہ میری سمجھ میں آ گیا۔اور میں نے اس کے مطابق امروٹ ضلع سکھر میں ایک جماعت بنائی اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم شہید ہو کر جہاد کو زندہ رکھیں گے۔ بعد میں جب اس کا تذکرہ حضرت شیخ الہند کے سامنے ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ تجھے اس جماعت کی بھی

ضرورت نہیں تو اکیلا جہاد کرسکتا ہے۔اور فاتح بھی ہوسکتا ہے۔اور آپ نے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ یہ میری اپنی رائے ہے۔میرے استاد کی سمجھائی ہوئی بات نہیں۔اور میں نے فلاں حدیث سے اس کا استنباط کیا ہے۔

اگر جہاد کا یہی مطلب ہے جو مجھے حضرت شیخ الہند نے بتایا تھا تو اسی کا نام انقلاب ہے۔ چنانچہ اب میں انقلابی ہوں۔اور جو طریقہ حضرت شیخ الہند نے مجھے بتایا۔ اسی طریقے کا انقلابی ہوں ۔ میرے استاد حضرت شاہ شہید' حضرت امام عبدالعزیز اور حضرت امام ولی اللہ قدس اللہ اسرارہم کے مسلک پر عامل تھے۔پس میری زندگی کا بھی یہی مسلک ہے۔اور اسی کا حاصل کرنا میری تمام جدو جہد کا خلاصہ ہے۔

(حضرت شیخ الہندؒ کا انقلاب کیسے عمل میں لایا جائے)

ہم دو مسئلے اور بھی یہاں ذکر کر دیتے ہیں۔سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند کا یہ انقلاب کیسے عمل میں لایا جائے؟ میرا کہنا یہ ہے کہ اس کے لیے ہمیں یورپ سے سیکھنا ضروری ہے ۔ ہمارے پرانے ہتھیار اس زمانے میں کسی کام کے نہیں رہے۔کمال پاشا اور امان اللہ خاں اس بات کو خوب سمجھ گئے تھے اور ہم بھی باہر رہ کر اس حقیقت کو اچھی طرح جان گئے ہیں۔ یورپ کی سائنس اور یورپ کے حربی فنون ہمیں یورپ سے سیکھنے ہوں گے۔لیکن ہماری انقلابی جماعت کا پروگرام امام ولی اللہ کے فکر پر مبنی ہوگا۔جب ہم اپنے اہل ملک کو کہتے ہیں کہ ''یورپین بنو'' تو ہمارے اس کہنے کا دراصل یہی مطلب ہوتا ہے۔

جب یہ تسلیم کرلیا کہ ہمارے لیے یورپ سے سائنس اور فنون کا حاصل کرنا ضروری ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں کو ہم انگریزوں سے بطریق احسن سیکھ سکتے

ہیں۔اس لیے میری رائے میں مناسب اور موزوں یہ ہے کہ ہم انگریزی بولنے والی اقوام کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کریں۔اس میں ہمارا فائدہ ہے۔اور مصلحت بھی اس امر کی مقتضی ہے۔اس کو میں ''برٹش کامن ویلتھ'' کے اندر رہنا کہتا ہوں۔ہم سندھ کو ڈومینین سٹیٹ بناتے ہیں۔اور برٹش کامن ویلتھ کے اندر رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں میری اپنی ہے۔میرے استاد کی بتائی ہوئی نہیں۔لیکن پچھلی جنگ میں ترکی کی شکست اور مسلمانوں کے بین الاقوامی مرکز کے ٹوٹنے کے بعد انہوں نے آئندہ کے بارے میں کچھ ارشادات فرمائے تھے'جن سے اس قسم کا مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے۔

ایک اور بات جو گو ایک زائد چیز ہے'ہم اس موقعہ پر کہے دیتے ہیں۔اس جلسہ میں بعض دوستوں نے کسان اور زمیندار کا ذکر چھیڑا ہے ہم بھی کسان کے طرف دار ہیں۔ہم کسانوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ان کی سیاسی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔انھیں اس قابل بنانا چاہتے ہیں۔کہ وہ اسمبلی میں نمائندہ بن کر بیٹھ سکیں۔ہم کسان کے لیے یہ سب کچھ چاہتے ہیں۔لیکن ہم اس کو زمیندار سے ٹکراتے اور لڑاتے نہیں۔ہمارے ملک میں زمیندار کا آج ایک درجہ ہے۔وہ زمین کا لگان کسانوں سے وصول کر کے حکومت کو پہنچاتا ہے۔جب ہم حکومت سے نہیں لڑتے تو کسان کو اپنے زمیندار سے کیوں لڑائیں۔ہم جانتے ہیں کہ کس طرح اسمبلی میں جا کر زمینداروں سے کسانوں کے حقوق لیے جاسکتے ہیں۔یہ ہماری خاص بات ہے۔اور اسی لیے ہم اپنی ایک مستقل سیاسی پارٹی بناتے ہیں۔ہم کسان کے حقوق سے دست بردار ہونے والے نہیں۔مگر بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں روس سے آئی ہوئی ایک تحریک چل رہی ہے۔اس تحریک میں کام کرنے والے کامریڈ کسان کو زمیندار سے لڑانا چاہتے ہیں۔ہم بھی چونکہ روس سے ہو کر آئے ہیں اس لیے ممکن ہے بعض لوگوں کا خیال ہو کہ ہم بھی کسان کو زمیندار سے لڑانے کے داعی ہوں گے۔ہمارے متعلق یہ سمجھنا ٹھیک نہیں۔

ہمارا پروگرام وقتی نہیں۔ ہم ایک طویل راہِ عمل کی طرف بلاتے ہیں۔ آج یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے طالبعلموں کو اپنا سارا پروگرام پڑھا دیں۔ اس وقت ہم آپ کو صرف یہ کہتے ہیں کہ آپ انگریزی پڑھیں تا کہ آج کل یورپ میں جو ہلچل ہے۔ اور وہاں جو انقلاب برپا ہے' اس کے حالات سے آپ براہ راست واقف ہو سکیں۔ ہم عربی طلبہ کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے انھیں دیوبند کا نصاب مکمل کرنا چاہیئے۔ وہ اس نصاب کے عقلیات کے حصہ کو بھی ویسا ہی پڑھیں جیسا دینی حصے کو پڑھتے ہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ وہ امام ولی اللہ کی حکمت کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ اس کے علاوہ ہم آپ کو ایک اور مشورہ بھی دیتے ہیں۔ عربی طلبہ کو چاہیئے کہ وہ سندھی فائنل کا نصاب بھی مکمل کریں۔ انھیں سندھی فائنل کا امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔ انھیں صرف اس نصاب کے ذریعہ اپنے اندر استعداد پیدا کرنی چاہیئے۔ اس سے یہ ہوگا کہ وہ مولانا محمد قاسمؒ کی بات بآسانی سمجھ سکیں گے۔

آخر میں ہم ایک بات پر زور دیتے ہیں۔ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سندھ کی شہری آبادی کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ مگر باہر اطراف اور دیہات میں مسلمانوں کے اشراف خاندان اب تک موجود ہیں۔ ان میں اچھے پیر ہیں۔ اچھے زمیندار ہیں اور نیک علماء بھی ہیں۔ ان لوگوں کے بڑے بڑے خاندان ہیں۔ جن کی گزر زمینداری پر ہے۔ ان میں دینی علوم کی اشاعت کا بڑا میدان ہے۔ ان کو انگریزی زبان سے واقف کرانا بھی اشد ضروری ہے۔ اگر ہمارے نوجوان طلبہ ہمت کر کے یہ کام اپنے کاندھوں پر اٹھالیں تو وہ سندھ میں اسلامیت کو نئی زندگی بخش سکتے ہیں۔ واللہ المستعان۔

آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ موجودہ سیاسی ہنگاموں سے الگ رہتے ہوئے عربی طلبہ کے لیے سیاست سیکھنے کا آسان راستہ کونسا ہے؟

سواس بارے میں میری رائے یہ ہے:

(الف) عربی دان طالب علم کو انگریزی زبان کی تحصیل کرنی چاہیئے۔ اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اردو اور سندھی کو رومن کیریکٹر میں لکھنے پڑھنے کی مشق کرے۔ وہ انگریزی کے حروف سیکھ کر تھوڑی سی محنت اور مطالعہ سے اتنی استعداد بہم کر سکتا ہے۔ کہ اردو اور سندھی کو انگریزی حروف میں لکھ پڑھ سکے۔ اس طالب علم کی حالت ایسی ہوگی جیسے ایک عامی قرآن مجید کو قرات کے ساتھ پڑھنا سیکھتا ہے۔ وہ گو معنی نہیں جانتا لیکن عربی لفظ کا تلفظ کر سکتا ہے۔ وہ اس حالت میں بآسانی ٹائپ رائٹر کا استعمال سیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مقرر خواہ اردو میں تقریر کرے اور خواہ سندھی میں، وہ ٹائپ رائٹر کے ذریعہ اس کو انگریزی حروف میں لکھ سکے گا۔ اس کام کے لیے نہ جماعت بندی کی ضرورت ہے اور نہ باقاعدہ کسی استاد سے پڑھنے کی، ہر شخص خود ذاتی محنت سے یہ ملکہ حاصل کر سکتا ہے۔

(ب) اس کے بعد انگریزی کی سات کتابیں جو میٹرک تک پڑھائی جاتی ہیں۔ انھیں ''کریما، نام حق'' کی طرح پڑھے اور ان کی عبارت کو اپنے ہاتھ سے لکھنے کی مشق کرے۔ اور انگریزی بولنے والوں کی مجلس میں بیٹھے۔ اور انگریزی الفاظ کا صحیح تلفظ ذہن نشین کرے۔ اور اگر موقع ملے تو خود بھی انگریزی بولنے کی مہارت بہم پہنچائے۔ انگریزی کی پانچ کتابیں پڑھنے کے بعد ڈکشنری کی مدد سے وہ انگریزی اخبار کا مطالعہ کرنا شروع کر دے، اور جو وقت اس نے انگریزی سیکھنے کے لئے مقرر کیا ہو اس میں اور کسی چیز کو سیکھنے کی کوشش نہ کرے۔ نہ حساب، نہ سائنس اور نہ جغرافیہ۔ اس دوران میں وہ صرف انگریزی صحیح لکھنے اور بولنے کا خیال رکھے۔ ایک ذہین اور محنتی عربی داں طالب علم چھ ماہ میں یہ کام کر سکتا

ہے۔اور زیادہ مدت درکار ہو تو ایک سال اس کے لیے کافی ہے۔

مثال کے طور پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو دیکھیے۔ وہ دینیات کے ایک بڑے فاضل ہیں اور انگریزی بھی جانتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی کسی سے نہیں پڑھی، جو کچھ سیکھا ہے انہوں نے اپنی محنت سے سیکھا ہے۔ اسی طرح سندھ میں سید علی محمد راشدی ایک اچھا نمونہ ہیں۔ وہ معمولی انگریزی جانتے تھے لیکن خود اپنی محنت سے انہوں نے اس میں بڑی ترقی کی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ طالب علم کو اس ضمن میں امتحان دینے کا خیال دماغ میں نہیں لانا چاہیئے۔ وہ امتحان کا خیال کرے گا تو ایک مہینے کا کام سال بھر کا عرصہ کھا جائے گا۔

عربی دان طالب علم محض سیاسی تربیت کے لیے انگریزی سیکھتا ہے۔ اس کو کوئی نوکری نہیں کرنا۔ جس کے لیے اسے انگریزی ڈگری کی ضرورت ہو۔ یہ طالبعلم انگریزی کے ذریعہ جب براہ راست یورپ کی نئی تحریک یعنی روس کے سوشلسٹ پروگرام کی تاریخ اور اس کی کامیابی کے حالات سے واقف ہوگا تو اس وقت جا کر کہیں اس پر یہ حقیقت واضح ہو سکے گی کہ امام ولی اللہ کی حکمت، جس پر کہ ان کی کتابوں ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور ''ازالۃ الخفاء'' کا مدار اور اساس ہے۔ اور جس حکمت کے ذریعے وہ قرآن مجید، صحاح ستہ اور ائمہ اربعہ کے مذاہب اور محققین علماء کی سیاست کو حل کرتے ہیں، وہ ولی اللٰہی حکمت آج بھی یورپ کی اس انقلابی تحریک سے مقدم اور بلند ہے۔ اور میں جو یہ کہتا ہوں کہ آج کے یورپ کو سمجھے بغیر حضرت امام ولی اللہ کی حکمت کا مرتبہ پہچاننا ناممکن ہے سو اس کا مطلب بھی یہی ہے۔

اسلامی تاریخ کے پہلے ہزار سال میں ترقی کے کئی راستے تھے۔ اور امام ولی اللہ کے بزرگ بھی ان طرق میں سے ایک طریقہ پر عامل تھے۔ دوسرے ہزار سال (الف ثانی) میں جس کی ابتداء ہندوستان میں اکبر کی حکومت سے ہوئی، اور امام ربانی مجدد

الف ثانی اس تجدید کا سنگِ اساس رکھنے والے تھے' اس تجدید کی تکمیل کرنے والے امام ولی اللہ دہلوی ہیں۔ اور اس کام کیلیے اللہ تعالیٰ جل وعلا نے صرف ان کو منتخب فرمایا۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی ترقی کے لیے امام ولی اللہ کے طریقہ کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان پر یورپ کی ایک بہت بڑی طاقت کا جبری قبضہ ہے۔ ہم جب تک یورپ کی عام سیاست کو نہ سمجھیں گے' برطانیہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ دوسرے الفاظ میں جب تک آپ برطانیہ کو نہیں سمجھ سکتے' آپ کیلیے ہندوستان کی سیاست کو سمجھنا ناممکن ہے' نتیجہ یہ نکلا کہ اگر آپ کو اپنے ملک کی سیاست کو جاننا ہے تو برطانیہ کو جانیئے۔ اور جب تک آپ یورپ کو نہ جانیں گے' آپ برطانیہ کو نہیں جان سکتے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آپ یورپ کی سیاست کو سمجھیں اور پھر اپنے ملک کی سیاست پر غور کریں۔

امام ولی اللہ کے سیاسی فکر اور ان کے بتائے ہوئے راہ عمل کی اصابت اور ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ سلطان محی الدین احمد اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بعد جب اسلامی سلطنت میں انتشار شروع ہوا۔ اور اس ملک پر یورپی طاقتوں کے غلبے کی ابتدا ہوئی تو عین اس وقت شاہ صاحب اپنی سیاسی تحریک کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وہ اس نئے سیاسی نظام کی ضرورت بھی بتاتے ہیں اور اس کے لئے سائنٹیفک یعنی حکیمانہ اساس بھی وضع کرتے ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب ہمارے ملک کی سیاسی زندگی کا رشتہ کہیں ٹوٹنے نہیں دیتے۔ اور وہ ایک آزاد ہندوستانی حکومت کی شکست کے ساتھ ہی دوسرے سیاسی نظام کا نعم البدل پیش کر دیتے ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ پہلے تو یورپ کی سیاست کو سمجھو۔ اور پھر امام ولی اللہ کی حکمت کا عمیق مطالعہ کرو۔ اس طرح تم ایک طرف یورپ کو جان لو گے۔ اور دوسری طرف ہندوستان کی سیاست کو سمجھ جاؤ گے۔

ہمارا بیت الحکمت اور محمد قاسم ولی اللہ تھیولجیکل کالج امام ولی اللہ کی حکمت کی

اشاعت اوراس کی تعلیم کا انتظام کریں گے۔ہم اپنے نوجوان طلبہ کو بڑی نرمی سے ادھر متوجہ کرتے ہیں۔ بے شک یہ کام مشکل ضرور ہے۔ مگر ہمارے نوجوان طلبہ خدا کے فضل سے بڑی ہمت کے مالک ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو اپنی ہمت اور قوت سے اس مہم کو آسانی سر کر سکتے ہیں۔

ہم صراحتہً کہتے ہیں کہ ہم برطانیہ سے جنگ و جدل کرنے کا خیال چھوڑ چکے ہیں۔ ہم فی الحال ڈومینین حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سندھ کے عام باشندوں کو ووٹ کی قیمت بتانا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح اسمبلی میں عوام کی طاقت کو مرتکز کرنے میں ساعی ہیں۔

اس کے علاوہ ہمیں یہاں اس بات کی بھی صراحت کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم سندھ میں سندھیوں کی مستقل طور پر حکومت چاہتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں کوئی مذہبی سوال پیدا نہیں ہونے دیں گے۔ ہم سندھ کی سرزمین کو ایک مستقل ملک مانتے ہیں اور ہم اس براعظم کے بقیہ ملکوں کے ساتھ فیڈریشن کے ذریعہ شریک ہوں گے۔ ہم سارے ہندوستان کو ایک ملک فرض کر کے اس پر وحدانی (یونیٹری) طرز حکومت کے قیام کا بڑی سختی سے انکار کرتے ہیں۔ اگر ہندوستان کو ایک ملک نہ سمجھا جائے۔ اور اس براعظم کا ہر ملک اپنی جگہ آزاد ہو تو اس طرح ہندو مسلم سوال بھی حل ہو جاتا ہے اور پھر ہم برطانیہ کے ساتھ بھی سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔

لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ فکر جو ہم پیش کر رہے ہیں بالکل نیا ہے۔ اس لیے اس کو عمل میں لانے کے لیے ایک مستقل سیاسی پارٹی کی ضرورت ہے۔ یہ پارٹی نیشنل کانگرس کے اندر رہ کر کام کرے گی۔ ہم سندھ میں اس پارٹی کی تشکیل بھی کر چکے ہیں۔

اس پارٹی کے نزدیک قوم سے مراد وہ سیاسی تصور ہے جسے آج یورپ کی سیاست

بھی مان رہی ہے۔ وحدتِ زبان اور تمدن و معاشرت کا ایک سا ہونا' یہ اساس ہے قوم کے اس سیاسی تصور کی۔ اسی بناء پر ہم سندھیوں کو ایک مستقل قوم مانتے ہیں' اور اسی طرح پنجابی' پشتو' کشمیری' گجراتی' مرہٹی اور ہندوستانی بولنے والوں کو مستقل اقوام کا درجہ دیتے ہیں۔

ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ ان تمام قوموں کی انٹرنیشنل زبان اردو اور انگریزی ہوگی۔ وہ علاقے جن میں یہ قومیں آباد ہیں' ان کی حدیں بہار سے شمال میں پشاور تک اور نربدا سے کشمیر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہم اس سارے رقبہ کو اپنا قومی وطن مانتے ہیں۔ اس رقبہ میں بسنے والی قوموں کے آپس کے تعلقات ایک انٹرنیشنل نظام کے ماتحت ہوں گے۔ ہم اس کے تو حامی ہیں' جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ ''سندھ سندھیوں کا ہے'' لیکن ہمارا یہ اصول اس وقت ہی قابل عمل ہوسکتا ہے' جب کہ ان سارے علاقوں کو ہمارے اصولوں پر ایک انٹرنیشنل نظام کے تابع کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر ہم نے اپنی پارٹی کا نام جمنا' نربدا' سندھ ساگر پارٹی رکھا ہے' ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس سارے علاقے پر ہماری سندھ ساگر پارٹی حکومت کرے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک صرف یہی پارٹی صحیح معنوں میں ان علاقوں میں ایک ایسا انٹرنیشنل نظام قائم کرسکتی ہے جس میں ہر قوم آزاد اور ہر ملک اپنی جگہ مستقل ہو گا۔ یہ ہے مختصر لفظوں میں ہمارا نصب العین اور اسی کے لیے ہم سیاسی جدو جہد کر رہے ہیں۔

آگے چل کر اگر بنگال اور دکن ہمارے ساتھ سمجھوتہ کر کے ہماری پارٹی میں شریک ہونا چاہیں گے۔ تو ہم نہایت خوشی سے انھیں قبول کریں گے۔ لیکن اس وقت ہم اپنی تمام طاقت نارتھ ویسٹرن انڈیا کے علاوہ دوسری جگہ صرف کرنا نہیں چاہتے۔

(ج) ہماری یہ پارٹی سندھ کی کسی بھی پارٹی سے جو اس اصول کو اپنی اساس مانتی ہے کہ ''سندھ سندھیوں کا ہے'' مخاصمت نہیں کرتی۔ بلکہ ایسی پارٹی سے ہم سمجھوتہ کرنے کی کوشش کریں گے تا کہ سب مل کر ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکیں۔

آخر میں ہم ہر طالب علم کو بڑی تاکید سے وصیت کرتے ہیں کہ جب تک وہ سندھ ساگر پارٹی کے نظریات کو پورے یقین سے نہ مان لے نہ وہ ان پر عمل کرے اور نہ دوسروں کو ان کی دعوت دے۔ لیکن اگر کسی درسگاہ کے اساتذہ اور منتظمین اس پارٹی کے نظریات کو مان لیتے ہیں تو ہم انھیں یہ مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی تعلیم گاہ کا نام محمد قاسم ولی اللہ تھیولجیکل کالج رکھیں۔ ہم برابر ان کو اپنے مفید مشوروں سے مدد کرتے رہیں گے۔

واللہ المستعان.

مقالہ نمبر ۲۳

سندھ ساگر انسٹی ٹیوٹ کا عملی کام

محمد قاسم ولی اللہ تھیولجیکل کالج اور ان کی شاخیں

جون ۱۹۴۴ء

سندھ ساگر انسٹیٹیوٹ کا عملی کام

محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج اور ان کی شاخیں

جامعہ ملیہ دہلی میں ''بیت الحکمۃ'' قائم کرنے کے بعد اس کی ایک شاخ لاہور میں قائم کرنے کے سلسلے میں ہم مارچ ۱۹۴۴ء میں وہاں چند ہفتے قیام پذیر ہوئے۔ ہماری سکیم سمجھنے کے بعد لاہور کے نوجوان طبقہ نے ''محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج'' قائم کرنے کیلئے آمادگی ظاہر کی۔ اور ہم نے نوجوانوں کی خاطر کالج کی مختصر اسکیم تحریری طور پر تیار کر کے مہیا کی، جسے انہوں نے طباعت کے بعد شائع کر دیا۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح کے کالج سندھ اور دہلی میں بھی قائم کریں۔

میں بحالتِ مرض جب جمعیت طلباء سندھ (کے اجلاس) کی صدارت کیلئے حیدر آباد پہنچا تو وہاں چند ضروری امور سرانجام دیکر گوٹھ پیر جھنڈا چلا آیا۔ سندھ میں جو ہمارے ساتھی سندھ ساگر انسٹیٹیوٹ میں کام کرنے والے تھے، انہوں نے پیر ضیاء الدین شاہ صاحب (صاحب العلم) کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ''دار الرشاد'' (پیر جھنڈا) کی نئی عمارت میں سندھ ساگر سوسائٹی سے ملحق محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج شروع کرنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ ۲۴۔ اپریل ۱۹۴۴ء کو پیر ضیاء الدین شاہ صاحب کی زیر صدارت دار الرشاد کی عمارت میں جلسہ ہوا اور کالج کا افتتاح کیا گیا۔ فی الحال تعلیم کیلئے لاہور سے مولوی بشیر احمد بی۔ اے لدھیانوی کو طلب کر کے کالج کا وائس پرنسپل اور کالج سے ملحق سکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کیا گیا ہے۔

طریقہء تعلیم

اس کالج میں بنیادی طور پر امام شاہ ولی اللہؒ کی فلاسفی سکھائی جائے گی۔جس کی نوعیت کے دو نمونہ ہوں گے:

(۱) سلطان عالمگیر کے دور سے لے کر سقوطِ دھلی تک جو کتب مدوّن کی گئی ہیں اور ان میں جو بھی دستیاب ہوں ان سب کے مطالعہ کا طالبعلم کو موقعہ دیا جائے گا۔

(۲) سقوطِ دہلی سے عربی اور فارسی زبانوں کے دور کا خاتمہ ہوتا ہے۔ مولانا محمد قاسمؒ دھلی کی نئی زبان یعنی اُردو میں ولی اللہی فلاسفی کا ترجمہ کر کے دیو بند کو مرکز بناتے ہیں اسی لئے تعلیم کے مذکورہ دونوں نمونوں کو سمجھنے کیلئے مولانا محمد قاسمؒ کی تصنیفات یا شیخ الھندؒ کی محبت میں سے جو طریقہ معلوم ہوا ہے طلباء کو اسکی تعلیم دی جائے گی نیز عربی اور انگریزی تعلیم کا بھی اعلیٰ پیمانہ پر انتظام ہوگا۔

اس کالج کی فلسفیانہ تعلیم کی بنیاد پر ہی ایک پولیٹیکل پارٹی بنائی جائے گی جو مسلمانوں کی زندگی کی ترجمان ہوگی اور گاندھی ازم کی مصیبت سے نجات دہندہ ثابت ہو گی۔

گاندھی ازم اور برطانیہ

ہماری سوچ کے مطابق گاندھی ازم اور کانگریس دو الگ چیزیں ہیں۔ہم اس وقت گاندھی ازم کے تنگ دائرے میں کام کرنے پر مجبور ہیں۔اس میں ہمارے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں، لیکن ہم برطانیہ امپیریلزم سے مل کر کام کرنے پر تیار ہیں، کیونکہ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کے ضمن میں ہمیں کام کرنے کی گنجائش ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب بھی گاندھی ازم اور برٹش امپیریلزم کا تقابل ہوگا۔ہم برٹش سے مل کر کام کریں گے،

گاندھی ازم کے تابع ہو کر نہیں رہیں گے۔ ہم نے کابل میں اور کابل سے باہر بھی انڈین نیشنل کانگریس کی بڑی بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ جن خدمات سے ہم کسی وقت بھی دستبردار نہیں ہو سکتے۔ اسلئے ہم کانگریس کے اندر ولی اللٰھی فلاسفی کی بنیاد پر ایک مستقل پروگرام جاری کریں گے اور اس طرح انڈین نیشنل کانگریس کی برطانیہ سے مصالحت کروائی جائے گی۔ اس پروگرام کا مرکز ہم نے سندھ کو قرار دیا ہے۔ جہاں محمد قاسم ولی اللہ کالج اور سکول قائم بنا کر ایک سوسائٹی قائم کی جائے گی۔ جو باقاعدہ کام جاری رکھے گی۔

ان درسگاہوں کے ذریعہ طلباء کو ہندوستان میں سات سو سالہ حکمرانی کے نتائج کا علم حاصل ہوگا' بایں وجہ ہم اس تحریک کو ہندوستانی مسلمانوں کی نیشنل (قومی) تحریک کا نام دیتے ہیں۔ جس میں کوئی بھی ہندو یا عیسائی بلاتردد شریک ہو سکتا ہے۔

ہماری اس قومی تحریک کی درسگاہوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی کام بھی تجویز کیا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) جدید طریقہ سے زرعی کام سکھانا۔

(۲) اسمبلی میں کام کرنا

(۳) اور بین الاقوامی تحریکات میں اپنا وجود ثابت کرنا۔

شمالی سندھ (زون بالائی سندھ) میں تحریک کی شاخیں

ہمارا خیال رہا ہے کہ "سندھ ساگر انسٹیٹیوٹ پیر جھنڈا" کی بعض شاخیں شمالی سندھ میں قائم کی جائیں۔ جنہیں "سندھ ساگر اکیڈمی" کا نام دیا جائے۔

کافی عرصہ سے تمنا تھی کہ امروٹ تعلقہ (تحصیل) گڑھی یاسین (ضلع شکارپور) میں جو ہمارے مرشدوں کا مرکز ہے' وہاں سندھ ساگر اکیڈمی قائم کی جائے' ۲۵ مئی ۱۹۴۴ء کو

اسی سلسلے میں زمیندار مستی خان کے پوتے وڈیرہ ہدایت اللہ خان دَل نے زمین کا قطعہ عطا کیا۔ امید ہے کہ وہاں ''سندھ ساگر سکول'' شروع کیا جائے گا اور اسی سکول کے ذریعہ سے امروٹی جماعت ایک مرکز پر جمع ہو جائے گی۔ اور یہ بھی امید ہے کہ دار السعادت گوٹھ پھوڑ (ضلع شکار پور) کے شاگرد اور قاسم العلوم تھریچانی (ضلع سکھر) میں بھی تحریکات شروع ہو جائیں گی۔ اس سکول کی مذکورہ زمین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

(۱) لطف اللہ دَل زرعی فارم۔

(۲) محمد قاسم ولی اللہ اکاڈمی۔

اس کام میں ہمارے ساتھ کافی دوست ہم خیال ہیں۔ جن میں مولانا دین محمد وفائی عملی طور پر کام پر شریک ہوتے رہتے ہیں، یقیناً یہ تحریک ملک وقوم کیلئے بے حد مفید ثابت ہوگی۔

جامعہ ملّیہ دہلی

میں بیمار ہوں اور بلحاظِ عمر بڑا بھی (یعنی ضعیف العمر) ہوں، مگر میری موت سے یہ تحریک مرنہیں جاتی۔ ہم نے جامعہ ملّیہ میں بیت الحکمۃ قائم کر کے تعلیم کا کام شروع کر دیا ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ سندھی طلبہ کیلئے جامعہ ملّیہ میں بورڈنگ ہاؤس بھی قائم کیا جائے جہاں سندھی نوجوان تعلیم حاصل کر کے سندھ میں اعلیٰ پیمانہ پر کام کرتے رہیں۔ جامعہ میں فقط ابتدائی تعلیم دلوائی جائے گی، اس لئے کہ جامعہ جیسی ابتدائی تعلیم کسی بھی جگہ میسّر نہیں۔ اگر سندھ کے امیر گھرانے کی اولاد جامعہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کیلئے گئی تو وہ بہترین شاگرد ثابت ہوں گے۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اس بیماری کی حالت میں سندھ کا سفر نوجوان عربی طلبہ

کے جلسہ کی صدارت کیلئے کیا گیا ہے۔ ہم ابھی حال ہی میں دار السعادت (گوٹھ پیر جھنڈو۔ شکارپور) میں قیام کے دوران طلبہ کو ہدایات دیکر آئے ہیں یہ جامعہ ہمارے مقاصد سے متفق ہے۔اس لئے بزرگوں پر فرض ہے کہ وہ طلبہ کی حوصلہ افزائی کریں اور ان کے کام میں مداخلت نہ کریں اور روڑے نہ اٹکائیں اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو انہیں فراخدلی سے معاف کریں سندھ کے نوجوان طلبہ میں بھرپور استعداد موجود ہے جس پر زنگ چڑھ گیا ہے۔اسے چمکانے کی کوشش کی جائے۔ واللہ المستعان۔

عبید اللہ سندھیؒ

(مطبوعہ زبان سندھی ماھنامہ توحید کراچی جون ۱۹۴۴ء

ترجمہ اُردو مولانا عبداللہ عابد سندھی شکارپور سندھ)

مقالہ نمبر ۲۴

خطبہء افتتاح

محمد قاسم ولی اللہ تھیولجیکل سکول

۲۔اگست ۱۹۴۴ء

شہداد کوٹ۔ضلع لاڑکانہ، سندھ

پس منظر

[حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اور مولانا عزیز اللہ جرواؒ حضرت سندھیؒ کے نوجوان شاگردوں میں سے ہیں۔ انہوں نے حضرت سندھیؒ کی ہدایت کے مطابق شہداد کوٹ (ضلع لاڑکانہ، سندھ) میں محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل سکول کے نام سے ولی اللھی علوم و معارف کی ایک درس گاہ قائم کی تھی۔ ۴۔ اگست ۱۹۴۴ء کو حضرت سندھیؒ کے دست مبارک سے اس کا افتتاح ہونا تھا۔

اپریل ۱۹۴۴ء میں جمعیۃ الطلبہ سندھ کے اجتماع میں تقریر فرماتے ہوئے مولانا پر ضعف کی وجہ سے غشی سی طاری ہوگئی تھی۔ لیکن آپ نے فوراً اپنے اوپر قابو پالیا۔ اور اطمینان سے اپنی تقریر ختم کی۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ مولانا کے جسمانی قویٰ اب جواب دے چکے تھے۔ یہ تو صرف ان کے عزم و یقین کی توانائی تھی، جو ان کی زندگی کے رشتہ کو ٹوٹنے نہ دیتی تھی۔ ان دنوں مولانا بے حد مضطرب و بے قرار تھے۔ اور نہیں چاہتے تھے کہ کسی وجہ سے ان کا کام رُکے۔ چنانچہ حیدرآباد کے اجتماع کے بعد اس بیماری و ضعف کی حالت ہی میں وہ ایک رفیق کو ساتھ لے کر سندھ کے عربی مدارس کے دورہ پر نکل کھڑے ہوئے۔ سفر کی صعوبتوں اور جانکاہیوں کو سہتا ہوا صبر و ثبات کا یہ پیکر، اطرافِ سندھ میں مدارس کا معائنہ کرتا اور نوجوان طلبہ سے برابر ملاقاتیں فرماتا رہا۔ آخر جب صحت کا معاملہ حد سے گزر گیا، تو رفیق نے بڑی منتوں سے کراچی چلنے پر راضی کیا۔

کراچی میں زیرِ علاج تھے، طبیعت برابر گرتی جارہی تھی۔ اور اکثر بے ہوشی کا عالم طاری رہتا تھا۔ لیکن جب ہوش میں آتے تو شہداد کوٹ میں ۴۔ اگست کو جس مدرسہ کی رسم افتتاح میں شرکت کا وعدہ کیا تھا، اس کا ذکر فرماتے اور وہاں جانے والی گاڑیوں کے اوقات

دریافت کرتے۔

حتیٰ کہ ۲۴ جولائی کو ایک خط شہداد کوٹ لکھ کر تقریب افتتاح کا پروگرام دریافت فرمایا' چنانچہ خط میں لکھتے ہیں :۔

''میں بیمار ہوں لیکن اس کے باوجود آپ کی مبارک تقریب میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ آپ ہمیں صاف طور پر مطلع فرمائیں کہ ہم اگست کی کس تاریخ تک لاڑکانہ پہنچ جائیں۔ ہم اپنے حالات کے مطابق تیاری کریں گے۔ عبیداللہ سندھیؒ''

لیکن ۲۸ جولائی کو طبعیت زیادہ خراب ہوگئی' تو ایک تار کے ذریعہ مولانا عزیزاللہ جروار کو لکھا ''صحت بدتر ہوگئی ہے' سفر سے منع کردیا گیا ہے۔' معذرت ہے' عبیداللہ سندھیؒ''

اس کے باوجود ۲۔ اگست ۱۹۴۴ء کو طبعیت میں کچھ سکون اور بیماری میں افاقہ ہوا۔ تو فوراً کاغذ قلم منگوایا' اور اپنے قلم سے مختصر افتتاحی خطبہ تحریر فرمایا۔ اور اسے فوراً چھپوانے کا انتظام کیا۔ لیکن سفر کی ہمت نہ ہوسکی' تو ایک شاگرد کے ہاتھ شہدادکوٹ بھجوادیا۔

یہ حضرت مولانا سندھیؒ کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی آخری تحریر ہے۔ اس میں بڑی جامعیت کے ساتھ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا عمدہ خلاصہ' موجودہ دور میں کام کرنے کا جامع نظریہ اور اداروں کی تشکیل کا بنیادی تعارف بڑی عمدگی سے بیان کردیا گیا ہے۔ آپ زندگی کے آخری مراحل میں بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اپنے ذہن وفکر کے مربوط اور واضح نظریات اور شعور و آگہی کو نوجوانوں کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ ۲۔ اگست کو حضرت نے یہ تقریر لکھی ہے۔ اور ۲۲ اگست ۱۹۴۴ء کو آپ کا انتقال ہوا ہے۔ گویا زندگی کے آخری ایام تک آپ کا قلب' نفس' دماغ اور عقل مربوط انداز میں اور بڑی عمدگی کے ساتھ کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں' جیسا کہ اولیاء اللہ کا حال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت مولانا سندھیؒ کی باتوں کی سمجھ نصیب فرمائے۔ آمین۔ آزاد]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفٰی۔ امابعد:

ہم ہند کی گیارہویں صدی ہجری کی تاریخ پڑھانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ کا یہ سنہری دور ہے۔ اس میں (چار ایسے) اولوالعزم بادشاہ گذرے جن کی نظیر دنیا میں کم ملتی ہے۔

ا۔ جلال الدین محمد اکبر

جس نے نیا شوالہ بنایا اور اس میں نورتن کو بٹھایا۔ اس کے مددگار علمائے دہلی تھے۔ ابوالفضل، فیضی ایک طرف اور خواجہ محمد باقی کی اولاد اور اتباع دوسری طرف۔ اس تحریک کی ابتداء شیخ شہاب الدین سہروردی[1] سے چلی آتی ہے۔ انہوں نے تیمور کو دہلی بھیجا۔ پھر خواجہ عبید اللہ احرار جن کا مولوی جامی اس طرح تعارف کراتے ہیں۔

چو فقر اندر قبائے شاہی آمد بتدبیر عبید اللّٰھی آمد

ان کے اتباع نے خواجہ محمد باقی کو بلا کر خاص ہدایتوں کے ساتھ دہلی میں متمکن کیا۔ یہ اکبر اعظم کا مرشد تھا۔

۲۔ نورالدین جہانگیر

وہ نئے شوالے کو مسجد بنانے کی تحریک شروع کرتا ہے۔ وہ ابوالفضل کو قتل کراتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے۔ وہ ہندو مرتاض جوگیوں سے ملتا ہے مگر بخاری ترکوں کا بڑا عالم شیخ

[1] یہ صحیح نہیں یہاں حضرت مولانا کی مراد خواجہ بہاء الدین نقشبند ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے تذکرہ شاہ ولی اللہ میں لکھا ہے کہ بابر کا باپ حضرت عبید اللہ احرار کا عقیدت مند تھا۔ (مرتب)

عبدالحق محدث دہلوی جہانگیر کا مددگار ہے۔ وہ اخبار الاخیار میں اکابر عارفین دہلی کی سوانح عمریاں جمع کرتا ہے اور جہانگیر اسے قبول کرتا ہے۔ اکبر اعظم نے دہلی پر بیرونی سیاسی اثرات ختم کر دیے تھے۔ جہانگیر نے ہندوستانی دیسی تحریک کو باہر کے اثرات سے مستغنی کرنا شروع کیا۔ باہر سے جو اہل علم آئیں، وہ ہندی سوسائٹی میں مندمج (مدغم) ہو جائیں۔ وہ انصاف کو ہندوستانی سلطنت کا معیار بناتا ہے۔ اور اپنے باپ کی جمہوری تحریک کے لیے عوام کی تربیت کراتا ہے۔ آصف جاہ جیسا مدبّر اس کا معاون ہے۔

۳۔ سلطان شہاب الدین شاہ جہان

وہ ہند کی مہذب سوسائٹی کے لیے شاہ جہاں آباد (دہلی) بناتا ہے۔ وہ ہند میں نئی زبان، نئی تہذیب، ہند کی دینی تعلیمات کا جو ہر فقہ حنفی اور طریقہ نقشبندیہ جو امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے منظم کیا، جاری کرتا ہے۔ اس نے اپنی اولاد اور اتباع سے اس کی تکمیل کرائی۔ وہ اس تجدید کے ارہاص ہیں۔ شاہ جہانی مسجد کو اس کا مرکز بنایا۔ ہمارے لیے شاہ جہانی مسجد، بیت اللہ اور قدس (بیت المقدس) کے بعد تیسرا دینی مرکز ہے۔ اس کی تفصیل امام عبدالعزیز دہلوی سے سنیئے گا۔

۴۔ سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر

انھوں نے ہند کی دینی تحریک کو مسلمان اقوام سے کمزوریاں دور کرنے کے لیے دہلی کے مرکز سے وابستہ کرنا چاہا۔ اس کے لیے انھوں نے فتاویٰ عالمگیری لکھایا۔ مسلم سوسائٹی کو غیر مسلم مداخلت سے منزّہ (الگ) کیا۔ پچاس سال ہند میں حکومت کی، جو عدل و انصاف کے لیے ایک نمونہ تھی۔ بارھویں صدی کے شروع میں سلطان محی الدین عالمگیر نے وفات پائی۔

دہلی میں اس روشنی کے گُل ہونے سے جو نتائج پیدا ہوئے۔ اب ہم ان کا تعارف کراتے ہیں۔

(الف)

عالمگیری تحریک بڑی زبردست تھی۔ دہلی کی سوسائٹی اس بوجھ کو نہیں سنبھال سکی۔ محمد شاہ کے زمانے میں نادر شاہ کے حملہ سے سلطنت کا وقار جاتا رہا۔ امام عبدالعزیز نے ۱۲۳۳ھ سے پہلے دہلی کے دارالحرب ہونے کا حکم دیا۔ جسے مولانا محمد اسماعیل شہید نے ''صراط مستقیم'' میں اشارۃً لکھا ہے۔ ''صراطِ مستقیم'' ہی میں مولانا عبدالحی لکھتے ہیں۔

''سلطنتِ شاہ جہان آباد اسم محض بلا حقیقت است کہ اصلاً معنیٰ از سلطنت نماندہ''۔ (ترجمہ: ''شاہ جہاں آباد کی حکومت حقیقت کے بغیر محض ایک نام ہے کہ حکومت نام کی کوئی چیز بالکل موجود نہیں ہے'')

اگر آپ چاہیں کہ بارھویں صدی میں امام عبدالعزیز نے کس طرح ملت کو بیدار کیا تو صراطِ مستقیم جو امام عبدالعزیز کے کارندوں نے مل کر لکھی ہے۔ اسے غور سے پڑھیے کہ کس طرح انہوں نے مہذب پبلک کو بظاہر ڈکٹیٹر شپ اور اندر سے جمہوریت سکھائی ہے۔ جیسے امام ولی اللہ نے پہلے دور کے سلاطین کو جمہوزیت مآب بنا دیا تھا۔ ہمارے امام ولی اللہ کی کتابوں کے بعد ''صراط مستقیم'' ہمارا البرل ازم ہی ہے جو اس میں لکھا گیا۔ **الحمد للہ الذی ھدانا لھذا۔** (ترجمہ: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں اس کی ہدایت دی ہے)

اس دوران میں نہ کوئی تیموری عالمگیری ہندی نیشنلزم کو انٹرنیشنل بنا سکا۔ اور نہ کوئی عثمانی اپنی خلافت کو یورپ سے تسلیم کرا سکا۔ اس کے بالمقابل نپولین کے زمانہ سے یورپ نے اپنی نیشنل تہذیب کو انٹرنیشنل بنایا۔ گویا دہلی یورپ سے شکست کھا گئی۔ انا للہ و انا

الیہ راجعون.

یورپ اپنے تغلب سے چار تحریکوں کا تعارف کراتا ہے۔

۱۔ لبرل ازم

۲۔ انڈسٹری ازم

۳۔ ملٹری ازم

۴۔ اور آخر میں سوشلزم، جس میں مذہب کو قطعاً خارج کر دیا گیا ہے۔

ہم نے اپنے مطالعہ میں جو فیصلہ کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لبرل ازم کو ہم امام عبدالعزیز دہلوی (کے شاگردوں) کی (کتاب) ''صراط مستقیم'' جانتے ہیں۔ ''انڈسٹری'' اور ''ملٹری ازم'' یورپ کا قبول کرتے ہیں۔ اور سوشلزم میں ہمارے امام ولی اللہ دہلوی ہیں جو فلسفہ اور اکنامکس میں بہت عالی رتبہ ہیں۔ اس لیے امام ولی اللہ کا سوشلزم (سماجی فلاح کا نظام) اسلام پر منطبق ہے۔ اسے مانتے ہوئے ہم اپنی تحریک کو شروع سے آل انڈیا نہیں بناتے۔ بلکہ دہلی کو اپنا مرکز بنا کر شمال مغربی ہند میں اپنی اقوام کو تربیت دیتے ہیں اور برٹش گورنمنٹ کے ماتحت برٹش کامن ویلتھ میں اچھی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے دس بیس سال امن کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اسکول اور کالج ہم اس لیے شروع کرتے ہیں کہ اپنے نوجوانوں میں سیاسی شعور پیدا کریں۔ **واللہ المستعان ولہ الحمد.**

(ب)

اب ہم پھر دہلی کی تاریخ کا ایک ورق یاد دلاتے ہیں۔ جب سلطنت جاری تھی تو عالمگیر کے دور میں ملّت کو سنبھالنے والے دو امام پیدا ہوتے ہیں۔ امام ابوالرضا محمد اور امام عبدالرحیم۔ دونوں بھائی شیخ وجیہ الدین عمری کی اولاد ہیں۔ اور امام محمد باقیؒ کے تربیت یافتہ بزرگوں

کے زیر اثر رہ کر (ان میں) اولوالعزمی آ چکی ہے۔ امام عبدالرحیم دہلوی کے صاحبزادے ہیں ہمارے امام الائمہ امام ولی اللہ دہلوی۔ پہلا دور انہوں نے خود چلایا۔ دوسرا امام عبدالعزیز بن امام ولی اللہ نے چلایا۔ یہ ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۴٦ھ (۱۸۳۱ء) میں بالاکوٹ میں ختم ہوگیا۔ امام عبدالعزیز کے بعد امام محمد اسحاق اور محمد یعقوب نے تحریک کو آگے بڑھایا' مگر کمزوری نہ گئی۔ تو اسے عثمانی سلطنت سے ملا دیا۔ بڑی جنگ میں ترکی کی شکست اور خلافت کے خاتمہ پر یہ پروگرام بھی شکست کھا گیا۔ حفیدین (شاہ محمد اسحاق' شاہ محمد یعقوب) نے یہ کام دہلی کی ایک دوسری صدیقی جماعت (مولانا مملوک علی نانوتوی' مولانا محمد قاسم نانوتوی وغیرہ) کے سپرد کیا۔ جو امام امداد اللہ کے ماتحت مولانا محمد قاسم کی رہنمائی میں کام کرتی رہی۔ آخری شکست سے پہلے ہی دہلی کے مفتوح ہونے پر یہ تحریک منتشر ہو کر دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔

ا۔ علی گڑھ پارٹی کوآپریٹر۔ سرسید اس کے لیڈر تھے۔

۲۔ دیو بند پارٹی نان کوآپریٹر۔ مولانا محمد قاسم اور پھر مولانا شیخ الہند محمود حسن دیوبندی اس کے حامل تھے۔ اب یہ سکیم بھی فیل ہوگئی تو مولانا شیخ الہند چند اشارات مستقبل کے لیے دے گئے تھے۔ میں اپنی ذمہ داری پر تحریک کا تیسرا دور چلانا چاہتا ہوں۔ واللہ المستعان و لا حول و لا قوۃ الا باللہ۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم نے دہلی کی تاریخ پڑھانے کے لیے محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج محمود نگر برائے یادگار شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قائم کیا ہے۔ اس سارے ادارہ کا نام سندھ ساگر انسٹی ٹیوٹ رکھا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ سندھ ساگر انسٹی ٹیوٹ اپنے تین مرکز بنائے گی۔

ا۔ بیت الحکمت جو محمد قاسم ولی اللہ کالج کا جزو بن جائے گا۔

۲۔ سندھ ساگر اکاڈمی جو کالج کے لیے

الف۔ نشرواشاعت۔

ب۔ طالب علموں کو جمع کرنا۔

ج۔ فارغ طالب علموں کی تنظیم۔ یہ دونوں مرکز خالص علمی ہیں۔

۳۔ جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی، یہ خالص سیاسی جماعت ہے۔ اس کی تعلیمات دی جائیں گی مگر پارٹی نہیں بنائی جائے گی۔ اگر اسمبلی کے اندر انسٹی ٹیوٹ کا اجمالی تعارف ہو گیا۔ اس کی مدد کے لیے محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل اسکول شہداد نگر میں مولانا غلام مصطفےٰ اور اس کے رفیق قاضی عزیز اللہ کی ہمت سے کھولا جاتا ہے۔ ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ کالج تحریک سندھی نوجوانوں میں پہنچ گئی۔ **والحمد للہ علی ذلک۔**

پارٹی کے نام میں ایک قسم کا اشکال محسوس ہوتا ہے اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ نربدا سندھ ساگر کا ذکر تو شمال مغربی ہند کی تجدید کے لیے ہے اور جمنا کے کنارے پر آگرہ میں اکبر اعظم اور دہلی میں شاہجہانی تحریک پھلی پھولی۔ وہ ہمارے قومی اساس کا سامان ہے اب ہم اللہ کا نام لے کر اس تحریک کو شروع کرتے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین وصلی اللہ علی سیدالمرسلین وعلی آلہ واصحابہ وجمیع الصالحین اجمعین۔

۲۰ شعبان ۱۳۶۳ھ ۲۔ اگست ۱۹۴۴ ہندی

ہماری مطبوعات